فصلنامه

راہ اسلام

شمارہ : ۱۸۴- اپریل تا جون ۲۰۰۲ء

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر

محمد حسن مظفری

خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران۔ ۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱

فون: ۳۴-۳۳۸۳۲۳۲

فیکس: ۳۳۸۷۵۴۷

http://www.iranhouseindia.com

E-mail:mozafarihasan@yahoo.com

•اعزازی ایڈیٹر:

ڈاکٹر اختر مہدی

•همکاران مجلّه:

•تزئین کلر: مجید احمدی و خانم عائشہ فوزیہ

•کتابت : قاری محمد یاسین

•ناشر :خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران

۱۸۔ تلک مارگ۔ نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱

راہِ اسلام میں شائع ہونے والے ہر مقالے کا اسلامی جمہوریہ ایران کے نظریات کا مظہر ہونا لازمی نہیں۔

فہرست

	موضوعات		صفحہ
۱	اداریہ	از: ادارہ	۴
۲	آیت اللہ خامنہ ای کا خطاب		۷
۳	امریکی دھمکیوں کا جواب	از: حجت الاسلام والمسلمین سید محمد خاتمی	۱۲
۴	شیخ ابو جعفر طوسی علیہ الرحمہ	از: پدم شری علی جواد زیدی	۲۰
۵	سانحۂ کربلا شعری استعارہ	از: پروفیسر گوپی چند نارنگ	۲۵
۶	مرثیہ خوانی کا فن	از: پروفیسر نیر مسعود	۴۴
۷	امانت و دیانت کا سبق	از: الحاج پروفیسر سید مجاور حسین رضوی	۵۹
۸	ابن مسکویہ کا فلسفہ اخلاق	از: ڈاکٹر سید محمد ثنیٰ رضوی	۶۴
۹	دکن میں شیعہ سلطنتوں کے قیام... پس منظر	از: ڈاکٹر صادق نقوی	۷۱
۱۰	نوحہ: رثائی ادب کا اہم ستون و قومی یکجہتی کا آئینہ	از: سید اطہر رضا بلگرامی	۷۷
۱۱	مظلوم و آوارہ وطن فلسطینی عوام کے حقوق	از: محمد اشرف شاہ	۹۰
۱۲	نظم	از: دبیر سیتاپوری	۱۰۸
۱۳	عزاداری حسین مظلوم، ایک اجمالی تجزیہ	از: ڈاکٹر اختر مہدی	۱۰۹
۱۴	تصوف: احیائے دین کی روحانی تحریک	از: پروفیسر سید جعفر رضا	۱۱۴
۱۵	امیر کبیر سید علی ہمدانی مودۃ القربیٰ		۱۶۱
۱۶	نور الانوار ترجمہ عبقات الانوار (حدیث نور)	از: ڈاکٹر سید حسن عباس	۱۷۹
۱۷	نہج البلاغہ میں نبوی تبلیغ...	از: سید نور الدین شریعتمدار جزائری	۱۸۲
۱۸	وحدت اسلامی	از: محترمہ ڈاکٹر صاعقہ مہدی	۱۹۳

اداریہ:

محمدؐ

علمبردار وحدت و آزادی

کائنات کے گوشہ گوشے میں چاروں طرف ہولناک وحشت انگیز تاریکی چھائی ہوئی تھی اور دنیائے بشریت اپنا حقیقی اور الٰہی راستہ بھول کر گمراہی، بے راہ روی اور دربدری کا شکار ہو چکی تھی۔ مجموعی اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقوام عالم پر فتنہ و فساد، ظلم و ستم، اور جہالت و پسماندگی طاری تھی اور انسانیت اس تاریک ماحول میں تباہی و نابودی کے گڑھے کی طرف پیش قدم تھی اور دنیا کے کسی بھی گوشے سے ہدایت در ہنمائی کا کوئی ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی نظر نہیں آتا تھا جس کی روشنی میں بھٹکے ہوئے لوگوں کی ہدایت کا وسیلہ فراہم ہو جاتا۔ سب کو ایک ایسے الٰہی رہبر کی تلاش تھی جو دنیائے بشریت کی اصلاح اور ترقی و خوشحالی کی زمین ہموار کردے۔

آخر کار وہ مبارک گھڑی آگئی اور سال عام الفیل در بیع الاول کے مہینے میں وہ مسعود و مبارک دن بھی آگیا جو دنیائے بشریت کے لئے عظمت و سعادت اور وحدت و آزادی حاصل کرنے کا باعث بن گیا۔ نور خداوندی تمام مراتب وجود اور غیب و شہود کی منزلیں طے کرتا ہوا حضرت آمنہ کی آغوش میں منور ہو گیا۔ جی ہاں! یہی وہ نور ہے جس کی تلاش میں فقط انسان ہی نہیں بلکہ صاحبان عرش اور دیگر انبیاء اولیاء بھی یادگار عالیہ الٰہی کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ امیر المومنین حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"خداوند عالم نے حضرت محمدؐ کو اس وقت مبعوث رسالت فرمایا جب نہ کوئی پرچم ہدایت موجود تھا نہ کوئی چراغ روشن تھا اور نہ راہ حق دکھائی دے رہی تھی۔"[1]

جی ہاں! یہ حضرت ختمی مرتبت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظیم شخصیت تھی جس کے نور سے معاشرہ میں موجود تفرقہ و بیگانگی، مصیبت و پریشانی، انحراف و گمراہی غلامی و بے سروسامانی اور غفلت و عداوت کو لوگوں کے درمیان وحدت و اتحاد، مسرت و خوشحالی، ھدایت و رہنمائی، آزادی و سربلندی اور اخوت و برادری میں تبدیل ہو گئی۔ وہ ساری زندگی پوری دنیائے بشریت کو

وحدت واتحاد اور صلح وسلامتی کا درس دیتے رہے اور فقط اپنے اقوال وارشادات ہی نہیں بلکہ اپنے اعمال وافعال سے بھی وحدت واتحاد کا ثبوت فراہم کرتے رہے۔ مہاجرین وانصار کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دے کر اخوت وبرادری کا پیغام دیا اور جگہ جگہ تفرقہ واختلاف سے دوری وعلیحدگی پر تاکید کرتے ہوئے یہ پیغام سناتے رہے کہ اختلاف کا آخری انجام نابودی ہے۔ اگر ملت اسلامیہ عالم نے ان کے اس پیغام وحدت کو عملی طور پر یاد رکھا ہوتا تو آج عالمی سطح پر بالخصوص فلسطینی مسلمانوں کے قتل وغارتگری کا بازار اس طرح گرم نہ ہوتا اور عالم اسلام پر ایسی کمزوری وبے سروسامانی نہ طاری ہوتی۔

دوسری طرف پیغمبر اسلام نے اپنی عظیم تعلیمات کے ذریعہ دنیائے بشریت کو فکر وشعور کی بیداری اور حقیقی استقلال وآزادی سے مالامال کر دیا۔ در حقیقت لفظ آزادی مختلف النوع مفہوم کا حامل ہے اور دنیا کی قوموں نے اس لفظ کو مختلف مفاہیم کو ادا کرنے کے لئے استعمال کیا ہے جبکہ اس کا مفہوم نہایت واضح اور بالکل سادہ وآسان ہے۔ پیغمبر اکرم کی ایک اہم ذمہ داری انسان کو غیر خدا کی غلامی وبندگی سے آزادی دلانا ہے۔[۲] اور اگر انسان غیر خدا کی بندگی سے نجات حاصل کرلے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کو کسی قسم کی بندگی کا شکار نہیں بنا سکتی۔

سورہ اعراف کی ۱۵۷ ویں آیہ کریمہ میں پیغمبر اکرم کی مسؤلیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال اور نجس وگندی وپلید چیزوں کو ان کے لئے حرام قرار دیتے ہیں۔ اور انھیں سخت ودشوار فرائض کے بھاری بوجھ اور آداب ورسوم اور نامناسب عادات واخلاق کی زنجیروں سے آزادی دلاتے ہیں۔[۳]

اسلامی مکتب فکر میں آزادی سے مراد فقط سیاسی اور سماجی آزادی ہی نہیں ہے البتہ اس مکتب میں سیاسی اور سماجی آزادی کو غیر معمولی اہمیت کی نگاہ میں دیکھا گیا ہے حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ

"کسی دوسرے کی غلامی وبردگی قبول نہ کرو کیونکہ خداوند عالم نے تمہیں آزاد خلق کیا ہے۔"[۴]

سیاسی اور سماجی آزادی دنیا کے مادی اور معنوی مکاتب فکر کا مشترکہ ارمان رہی ہے لیکن اسلام آزادی کی سرحدوں کو اس سے بہت آگے تسلیم کرتا ہے۔ دنیا کے سامراجی اور اشتراکی مکاتب فکر کی طرف سے جب آزادی کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد ہوتا ہے اس دنیا میں آزادی لیکن جب اسلام نجات وآزادی کی آواز بلند کرتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے دنیا سے آزادی۔ یعنی انسان اپنے مطالبات اور متعلقات دنیوی سے آزاد ہو جائے البتہ اس کا مطلب دنیا سے فرار اختیار کرنا ہرگز نہیں ہے۔ اسلام نے رہبانیت کی اتنی ہی

مذمت کی ہے جتنی دنیا طلبی کی۔ پیغمبر اسلام کا ارشاد گرامی ہے (لا رھبانیة فی الاسلام) ۵

دنیا کا ہر آدمی ابتدائی مرحلہ میں دنیوی مطالبات کے جھمیلے میں خود کو گرفتار کر لیتا ہے اور اس کے بعد دوسرے لوگ اسیری کی زنجیروں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ خود پسند اور زیادہ سے زیادہ کی تڑپ میں مبتلا انسان شروع میں خواہشات کے بندھن میں اسیر ہوتا ہے اور پھر ان مطالبات کی تکمیل کی خاطر دوسروں کو اپنے دباؤ میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا کے مطلق العنان اور تاناشاہ حکمراں دنیا کی ہر چیز کو اپنے لئے چاہتے ہیں۔ جبکہ دنیوی مطالبات سے کنارہ کش پیغمبر عوام الناس کی نجات و آزادی کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ مولانا روم پیغمبر اکرمؐ کے اس قول "من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ" کی تفسیر اس انداز میں پیش کرتے ہیں۔

زین سبب پیغمبر با اجتهاد ‏ نام خود و آن علی مولا نهاد
گفت هر کو را منم مولا و دوست ‏ ابن عم من علی مولای اوست
کیست مولا آنکه آزادت کند ‏ بند رقیّت زپایت برکند
چون به آزادی نبوت هادی است ‏ مؤمنان را زانبیاء آزادی است
ای گروه مؤمنان شادی کنید ‏ همچو سرووسوسن آزادی کنید ۶

حوالے:

۱۔ بعثه حین لا عَلَم قائم ولا منار ساطع ولا منهج واضح (خطبه ۱۹٦ نهج البلاغه)

۲۔ فبعث الله محمداً صلی الله علیه وآله وسلم بالحق لیخرج عباده من عبادة الاوثان الی عبادته ومن طاعه الشیطان الی طاعته بقرآن قد بیّنه ولحکمه (خطبه نهج البلاغه)

۳۔ ... یامرهم بالمعروف وینهیهم عن المنکر ویحل لهم الطیبات ویحرم علیهم الخبائث ویضع عنهم اصرهم والا غلال التی کانت علیهم..."

۴۔ لاتکن عبد غیرك وقد جعلك الله حراً (نامه ۳۱ نهج البلاغه)

۵۔ ملاحظہ کیجئے آیات: وما الحیاة الدنیا الامتاع الغرور۔۱۸۵/آل عمران، وماالحیاة الدنیا الا لعب ولهو۔۳۲/ انعام، وذرالذین اتّخذوا دینهم لعبا ولهواً وغرّتهم الحیاة الدنیا۔۷۰/ انعام نیز آیات ۵۱/ اعراف، ۳۸/ التوبه، ۷ و ۲۳ /یونس۔

٦۔ مثنوی معنوی، دفترششم۔

امریکی دھمکیوں کے جواب میں
آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کا
خطاب:

اپنی عزت و عظمت کا دفاع ہمارا فریضہ ہے۔

افغانستان پر حالیہ وحشیانہ بمباری اور بن لادن کے بہانے ہزاروں بیگناہ افغانی مسلمانوں کے قتل عام کے بعد امریکہ اور اس کے اتحادی ملکوں کے حوصلے کافی بلند ہو گئے۔ کابل کے چوراہوں پر نمائشی انداز میں مسلمانوں کی ریش تراشی اور برقع سوزی کے بعد امریکی حکمرانوں نے اپنے زعم ناقص میں یہ سمجھ لیا کہ اب سرزمین افغانستان سے اسلام کا خاتمہ ہو گیا اور اب اسلام دشمن پروپگنڈوں کے بجائے امریکی اسلام کے فروغ کی زمین پوری طرح ہموار ہو چکی ہے۔ زہر آلود اسلام دشمن پروپگنڈوں کے نتیجے میں ہر مسلمان کو دہشت گرد سمجھا جانے لگا ہے اور امریکی صہیونی ذرائع ابلاغ سے منصوبہ بند پروگرام کی حیثیت سے بارہا یہ اعلان کیا جارہا ہے کہ اسلام قتل وغارتگری کا مذہب ہے اور مسلمان جنگجو و دہشت گرد قوم ہیں۔

ان تمام پروپگنڈوں کا بنیادی مقصد وحشیانہ قتل عام اور لگاتار دھمکیوں کے ذریعہ مسلمانوں پر اپنا رعب ودبدبہ قائم رکھنا ہے تاکہ یہ مظالم کے بوجھ کے نیچے دبے رہیں اور اپنی زبان سے اف بھی نہ کہیں۔ اسی بنیادی مقصد کو نگاہ میں رکھتے ہوئے امریکہ نے حال ہی میں ایران پر بھی

بمباری کرنے کی اعلانیہ دھمکی جاری کردی۔ در حقیقت امریکی ماہرین سیاست کا یہ اندازہ تھا کہ سردست ایران میں اصلاح پسند اور بنیاد پرست جماعتوں کے درمیان اختلاف چل رہا ہے لہذا اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن امریکی دھمکیوں کے جواب میں آیت اللہ خامنہ ای نے جو بیان جاری کیا ہے وہ اسلام دشمن سامراجی سازشوں کو ناکام و بے نقاب کردینے کے لیے ہے۔ ذیل میں قائد عظیم الشان کے ارشادات کی ایک جھلک پیش کی جارہی ہے۔ (ادارہ)

دشمن کے ہر اقدام کا منہ توڑ جواب اور اپنی عزت و عظمت کا دفاع ہمارا فریضہ ہے۔

انقلاب اسلامی ایران کے قائد عظیم الشان آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای نے حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں سے اپنی حالیہ ملاقات و گفتگو کے دوران ملک کی انتہائی حساس اور تاریخی صورتحال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تاکید فرمایا کہ پروردگار کی قدرت لایزال پر مکمل اعتماد و انحصار، فداکار و معرکہ ساز ایرانی عوام پر اٹوٹ بھروسہ، مسولین اور اعلیٰ اٹل فیصلہ وہ اہم عناصر ہیں جو امریکہ کی موجودہ دھمکیوں کے مقابلے میں ایران کی کامیابی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

آیت اللہ خامنہ ای نے ماہ محرم اور جشن نوروز یعنی نئے سال کی شروعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ واقعہ کربلا تو ملت ایران کے لیے ذکر جاوید و حیات بخش رہا ہے۔ انھوں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ امام حسینؑ کے انقلاب کا مقصد ظلم، مرکز فساد اور زور گوئی کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور اسے سرکوب کردینا تھا اور اگر کربلا کے میدان میں حسین مظلوم نے یہ عظیم کارنامہ انجام نہ دیا ہوتا تو آج تاریخ کے صفحات سے اسلام کا نام بھی مٹ گیا ہوتا۔

انھوں نے انقلاب اسلامی ایران کو امام حسینؑ کے انقلاب کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے موجودہ دور میں مختلف معاشروں اور انسانوں کے درمیان روابط میں مزید پیچیدگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آج دنیا کی طاغوتی طاقتوں نے یزید ملعون کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور نئے علوم و فنون کی ترقی کا

استعمال کرتے ہوئے اس کوشش میں ہمہ تن سرگرم ہیں کہ ساری دنیا پر اپنا غلبہ قائم کرلیں۔ لہٰذا ایسے حالات میں امام حسینؑ کی پیروی کرنے والوں کی ذمہ داریوں میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔

حضرت آیت اللہ خامنہ ای نے امریکی صدر جمہوریہ کی حالیہ دھمکیوں میں موجود موثر اور توجہ و غور و فکر کے لائق عناصر کی طرف توجہ مبذول کرنا لازمی قرار دیا اور ایران کی حساس جغرافیائی حیثیت کو پہلا موثر عنصر قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اس علاقے کا آدھے سے زیادہ بندری علاقہ ہمارے وطن عزیز ایران کے اختیار میں ہے اور انسانی و مادی ذخائر کا بہت بڑا حصہ ایران سے وابستہ ہے اور مادی و انسانی وسائل کی اس کثرت و فراوانی نے ایران کے سلسلے میں امریکہ کو لالچی بنادیا ہے۔

مقام معظم رہبری نے اسلامی جمہوریہ ایران کی دیگر صفات مثلاً استقلال پسندی، غربت، شجاعت اور عوام پر مکمل اعتماد و بھروسہ وغیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ امریکی دھمکیوں کے پیچھے یہ عناصر بھی کار فرما ہیں۔ انھوں نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ایرانی عوام کو دفاع مقدس کے آٹھ برسوں کے دوران اسلامی انقلاب کی کامیابی کے دوران اس علاقے میں سامراجیت کے قلعے کی نابودی کے دوران اپنی عملی موجودگی اور بھرپور سرگرمی کا شیریں تجربہ آج بھی بخوبی یاد ہے۔ یہ قوم بیرونی غاصبوں اور حملہ آوروں سے شدید نفرت کرتی ہے اور ایران و اسلام کی طرف و سربلندی کی حفاظت کی راہ میں ہر طرح کی قربانی پیش کرنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ ہے۔ پس اسلامی جمہوریہ ایران کے مسولین کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر شعبۂ حیات میں عوام کی موجودگی کے لیے زمین ہموار کیے رہیں۔

حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے عالمی سطح پر موجودہ صورتحال کے لیے امریکہ کی سامراجی عادت اور انانیت کو پوری طرح ذمہ دار قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ امریکہ کی تسلط پسندانہ عادت ملت ایران کو کیسے برداشت کرسکتی ہے کیونکہ ایرانی عوام امریکہ سے ڈرنے والے نہیں ہیں اور یہ قوم امریکی مکر و فریب سے بھی بخوبی آشنا ہے۔

عالمی اسلامی انقلاب کے قائد عظیم الشان آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے حالیہ امریکی دھمکیوں کی توجیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی ایک وجہ امریکہ کے اندرونی حالات کی پردہ پوشی بھی

ہے۔انھوں نے ارشاد فرمایا کہ اقتصادی ترقی میں ٹھہراؤ،انتفاضہ کی لگاتار انقلابی و جہادی سرگرمیوں کی وجہ سے امریکی اور صہیونی حکومت پر مرتب ہونے والے منفی اثرات اور اخلاقی و نفسیاتی مفاسد میں اضافہ کی وجہ سے امریکی حکمرانوں نے اپنے عوام کی رائے عامہ کو ہموار رکھنے کے لئے اس کے سامنے ایک خارجی اور بیرونی دشمن لاکر کھڑا کردیا ہے۔

آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے امریکہ کی حالیہ ایران مخالف دھمکیوں کی پانچویں ممکن وجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ حالیہ امریکی اور غیر معمولی طور پر مسلح اسرائیلی فوج اور اس کے وحشیانہ حملوں کے مقابلے میں فلسطینی مظلوموں کی ثابت قدمی کی وجہ سے امریکی دھمکیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔انھوں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ امریکہ در حقیقت عالمی سطح پر موجود اسلامی بیداری کو پوری طرح نیست و نابود کردینا چاہتا ہے۔انھوں نے ایسے ماحول میں ایرانی حکمرانوں کی اہم ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ قطعی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ امریکہ، ایران پر حملہ نہ کرے گا بلکہ اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ امریکہ کی حالیہ دھمکیوں کو نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ اس کو حتمی اور سنجیدہ قرار دیتے ہوئے حکومت کے تمام ذمہ داروں اور عہدیداروں کو اپنی ذمہ داریوں کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونا چاہئے۔ موجودہ صورتحال میں ذمہ داریاں اتنی اہم ہیں کہ آج ہم لوگوں کو معمولی سی بھول کرنے کا حق نہیں ہے۔

آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے موجودہ دور کو ماہرین کی اہم آزمائش کا دور بتاتے ہوئے فرمایا کہ تاریخ کی نگاہیں ایرانی ماہروں، دانشوروں اور ذمہ دار لوگوں کی موجودہ راہ وروش پر لگی ہوئی ہیں اور آئندہ نسل ہماری موجودہ بات چیت یا سکوت و خاموشی اور اقدام و بے عملی کے سلسلے میں فیصلہ کرے گی۔

اسلامی انقلاب کے قائد عظیم الشان آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے حالیہ امریکی دھمکیوں میں موجود حقیقتوں کی شناخت اور ان سے مقابلہ کرنے کے لئے بہترین راہ وروش کے انتخاب کو ایرانی حکمرانوں کی نظر میں موجودہ نظام کے لئے کوئی خطرہ موجود نہ ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ بعض افراد ان دھمکیوں کو اسلامی نظام کے کسی ایک حصے کے لیے خطرہ خیال کرتے ہوں اور ممکن ہے کہ بعض لوگ ان دھمکیوں کو اہم خطرہ تو مانتے ہوں لیکن ان خطروں کا مقابلہ کرنے کے لئے عذر طلبی کی تجویز پیش

کرتے ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام باتیں غلط ہیں کیونکہ دشمن کی دھمکی کسی ایک جماعت کے لئے نہیں بلکہ سب کے لیے ہے اور اس کا واحد حل دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور اسلامی نظام کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنائے ہوئے رکھنا۔ انھوں نے اپنی فوجی آمادگی اور اس میں ہر ممکن اضافہ پر زور دیتے ہوئے فرمایا۔ ''ہم دشمن کی جانب سے اعلان جنگ کے مقابلے میں ہمہ جہتی دفاع کا اعلان کرتے ہیں اور دشمن کی جانب سے اقدام جنگ کے مقابلے میں ہمہ جہتی دفائی قدم اٹھائیں گے اور دشمن پر ہر ممکن ضرب لگائیں گے۔''

انھوں نے اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا۔ ''اسلامی جمہوریہ ایران کے عوام اور ان کے ذمہ دار حکمراں افراد جنگ کا استقبال نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ جنگ سے اجتناب کو اپنا فریضہ مانتے ہیں لیکن دشمن کے ہر اقدام کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے مثالی اتحاد کے ساتھ اپنی عزت و عظمت کا ڈٹ کر دفاع کریں گے۔

قائد انقلاب اسلامی آیت اللہ خامنہ ای نے امریکہ کی مبالغہ آمیز طاقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس ملک کے ارباب حکومت ملت اسلامیہ ایران کی طاقت، ایرانی حکمرانوں کی ہوشیاری و دانشمندی اور اس علاقے کی غیر معمولی حساسیت کے سلسلے میں غفلت کا شکار ہیں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ انتہائی حساس علاقہ ہے۔ اگر اس علاقے میں کسی قسم کی بے ثباتی پیدا ہوئی تو پوری دنیا سے بے ثباتی کا شکار ہو جائے گی۔ انھوں نے مزید فرمایا۔ ''جمہوری اسلامی ایران طالبان نہیں ہے جن کا ایک سرا بیگانوں سے جڑا ہوا ہو بلکہ یہ معرکہ خیز بہادر عوام پر مشتمل ایک طاقتور ملک ہے یہ ہر ممکن وسائل و امکانات سے مالا مال اور اسلامی دنیا کے ہر گوشے میں اچھے روابط کا حامل ہے اور یہ وہ اسباب و عوامل ہیں جو اسلامی جمہوریۂ ایران کو روک تھام کی ایسی عظیم اور مثالی طاقت عطا کر دیتے ہیں جس کا دنیا کے کسی دوسرے ملک سے مقابلہ و موازنہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

رہبر انقلاب نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ایران کے خلاف امریکی دھمکی کا اصلی اور بنیادی مقصد اس ملک کو کمزور اور وابستہ ملک میں تبدیل کرنا ہے لیکن امریکی دھمکیوں کے مقابلے میں ہمارا موقف حق پر ثابت قدمی و دوراندیشی کے ساتھ مسلسل کوشش و مکمل پائداری ہے اور ہماری تاریخ و ثقافت دشمن کے سامنے سر جھکانے کی تردید کرتی ہے۔

انھوں نے موجودہ حساس لمحات کو ایک "چاہئے" اور ایک "نہ چاہئے" کا حامل قرار دیتے ہوئے فرمایا۔ "تاریخ کے ان انتہائی حساس لمحات میں ملک کے تمام ذمہ داروں کو "چاہئے" کہ وہ اپنے قانونی فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دیں۔

انھوں نے دشمن کے مقابلے میں مرعوب اور خوفزدہ نہ ہونے لازمی قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ ملک کے موجودہ حالات میں دشمن کے مقابلے میں مرعوب و خوفزدہ ہونا سب سے بڑا خطرہ ہے لہٰذا ہر آدمی کا فریضہ ہے کہ وہ اس بڑی کمزوری سے پرہیز اختیار کئے رہے۔

انھوں نے بعض ایسی باتوں کی طرف بھی اشارہ کیا جو موجودہ حالات میں ملک کے نظم و ضبط میں خرابی کا باعث ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں ارشاد فرمایا کہ کج سلیقگی اور مرعوب و خوفزدہ ہونے کی وجہ سے ان مسائل کا رونما فطری ہے۔

قائد انقلاب اسلامی نے امریکہ کے ساتھ مذاکرہ و گفتگو کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: مذاکرہ راہ حل نہیں ہے اور اس سے کوئی بھی مشکل حل ہونے والی نہیں ہے۔ جو لوگ دھمکیوں کے مقابلے میں مذاکرہ و گفتگو کے چکر میں پڑتے ہیں وہ در حقیقت اپنی کمزوری و ناتوانی کا مظاہرہ کیا کرتے ہیں اور یہ نہایت منفی عمل ہے۔

انھوں نے ٹھوس ارادہ و توکل کو فیصلہ کن مثبت عنصر اور خوف و حوصلہ شکنی کو فیصلہ کن منفی عنصر قرار دیتے ہوئے فرمایا۔ "امریکہ بنیادی طور پر اسلام اور اسلامی جمہوریت کا مخالف ہے اور مذہبی بنیادوں پر قائم نظام حکومت کی اعلانیہ مخالفت کرتا ہے۔ اگر کوئی چیز اسکے برعکس دکھائی دے تو وہ محض ایک ہتھکنڈہ ہے جس کا مقصد مکر و فریب میں مبتلا کرنا ہے۔ کیا ان حقائق کو نگاہ میں رکھتے ہوئے امریکہ سے مذاکرہ کا کوئی معنی و مفہوم سمجھ میں آتا ہے؟

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے حضرت آیت اللہ نے اضافہ کیا کہ امام خمینیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر امریکہ سامراجی عادتوں سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے آدمیت کے دائرہ میں آجائے تو ایران دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح امریکہ کے ساتھ بھی تعلقات قائم کرلے گا لیکن امریکی حکمراں تو آج بھی پہلوی دور حکومت والے غلبہ کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے مزید فرمایا۔"

امریکی حکومت ایران میں اصلاح پسندی کو اسلامی نظام کی مخالفت سے تعبیر کرتی ہے اور ان بہنوں وبھائیوں کو جو اصلاح پسندی کے سایہ میں سرگرم عمل ہیں، بنیادی طور پر اصلاح پسند نہیں مانتی ہے۔

انھوں نے عوام کو اقتدار ایران کا اور مذہبی ایمان کو مختلف شعبوں میں ملت کی بھرپور موجودگی اور حصہ داری کا اہم ترین عنصر قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ذمہ دار لوگوں کا اندازہ گفتگو ایسا نہ ہونا چاہئے کہ لوگوں کے دل میں اختلاف کی شبیہ پیدا ہو جائے۔

حضرت آیت اللہ خامنہ ای نے ذمہ دار لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والا اختلاف درحقیقت دشمن کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ ایران پر دھاوا بول دے۔ انھوں نے اپنی بات کو قدرے واضح انداز میں اس طرح بیان فرمایا کہ مختلف سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل ومعاملات میں لوگوں کے درمیان اختلاف نظر کا پایا جانا ایک فطری امر ہے کیونکہ ہر آدمی کے کام کرنے کا طریقہ الگ ہوتا ہے لیکن دشمن کا تجاوز کارانہ حرکتوں کے خلاف تمام لوگوں کو باہم متحد اور ہم آواز ہونا چاہئے اور یہی ہمارے عوام کا مطالبہ ہے۔

جو لوگ ٹیلیویژن کے بعض چینلوں پر اور خبر رساں ایجنسیوں کے ساتھ اپنے انٹرویو کے دوران ایران پر طرح طرح کی تہمت لگاتے رہتے ہیں ان کی طرف واضح اشارہ کرتے ہوئے آیت اللہ خامنہ ای نے ارشاد فرمایا۔ اس قسم کی حرکت درحقیقت دشمن کو ایران پر حملہ کرنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے لیکن عالمی سامراج کی ہر ممکن کوشش اور تشویق وحوصلہ افزائی کے باوجود ملت ایران پروردگار عالم کی ذات پر ان کے مستحکم وگہرے ایمان اور الٰہی طاقت کے انسانی روپ "یعنی امام خمینی کی یاد کے سہارے روز بروز اور زیادہ مستحکم اور طاقتور ہوتی جارہی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حق کی پیرو وپابند ہونے کی وجہ سے ملت اسلامیۂ ایران یقیناً کامیاب ہوگی۔

سوویت یونین کا شیرازہ منتشر ہو جانے کے بعد امریکہ کی جانب سے نئے عالمی نظام پر مشتمل امریکی اعلان کے اغراض ومقاصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رہبر انقلاب اسلامی نے فرمایا کہ اس کا بنیادی مقصد امریکہ کے سیاسی، فوجی اور اقتصادی تسلط میں اضافہ کی کوشش اور امریکی وصہیونی سرمایہ داری کی بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں کی ترقی ووسعت کی راہ ہموار کرنا ہے۔ انھوں نے امریکی جارحیت کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ گذشتہ نصف صدی کے دوران دنیا میں ۴۰ آزاد حکومتوں کی سر نگونی، دیگر ۲۰ ملکوں میں جارحانہ و خونین مداخلت، دوسری جنگ عظیم کے آخری مرحلہ میں جوھری بم کا استعمال اور ۲۸ مرداد کو ایران میں فوجی بغاوت کی ترتیب امریکہ کے نہایت شرمناک و سنگین اعمال نامہ کے کچھ اہم اوراق ہیں اور ان شرمناک اعمال کا بنیادی مقصد غیر امریکی ملکوں کے مادی و انسانی وسائل کی نابودی اور حق عدالت وکی نابودی و پامالی رہا ہے۔

حضرت آیت اللہ خامنہ ای نے امریکی کانگریس سے صدر جمہوریہ امریکہ کے حالیہ خطاب اور امریکی دانشوروں کے تازہ ترین بیانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس خطاب اور اس بیانیہ کا مقصد ایک ہے بلکہ دانشوروں نے اپنے بیان میں امریکی حکومت کی وسعت پسندی اور اقتدار طلبی کو پوری طرح واضح کردیا ہے کہ وہ پوری دنیا کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔

انھوں نے ان زر خرید دانشوروں کی خیانت آمیز روش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مذکورہ بیانیہ پر دستخط کرنے والے زر خرید دانشوروں نے تاریخی اہمیت رکھنے والے عظیم انسانی اصولوں اور معیاروں کو امریکی اصول بنا کر پیش کیا ہے جبکہ امریکہ کے موجودہ سماجی حقیقتوں کو دیکھنے سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ قتل و غارتگری، بے حیائی و بے شرمی، نسلی امتیاز و بھید و بھاؤ کی پیروی، طاقت کا اعلانیہ غیر قانونی استعمال اور چشم زدن میں بدامنی پھیلا دینا امریکی تنظیموں اور اداروں کی کارکردگی کا نمایاں حصہ رہا ہے۔

انھوں نے دنیا کے بعض ملکوں پر جوھری بم سے حملہ کرنے کی امریکی دھمکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کچھ دنوں پہلے ان امریکی دانشوروں کی طرح روسی کیمونسٹ اور مختلف اشتراکی جماعتوں سے وابستہ دانشور لوگ اپنے اشتراکی اصولوں کو عالمی اور آفاقی انسانی اصول کا نام دیا کرتے تھے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آزادی طلب ملکوں اور قوموں کو دھمکی دیتے رہنے کا نام آزادی طلبی اور عدالت پسندی ہے۔

آیت اللہ خامنہ ای نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ امریکہ کو قطعی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے مفاد و مصالح کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انسانی معاشرہ میں دہشت گردی کو

خاطر خواہ معنی و مفہوم سے آراستہ کرتا ہے اور خود کو دہشت گردی کے خلاف جدو جہد کرنے والے ملکوں کا سردار بنالے۔ انھوں نے ارشاد فرمایا کہ "امریکی صدر بش ملت اسلامیہ ایران سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے بین الاقوامی خانوادہ میں دوبارہ شامل ہو جائے۔ لیکن ساری دنیا اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ دنیا کے تمام ملکوں کے ساتھ ایران کے تعلقات اچھے ہیں جبکہ امریکہ اپنی سخت روی اور غنڈہ گردی کی وجہ سے ہر روز عالمی برادری سے پہلے سے زیادہ دور ہوتا چلا جارہا ہے۔

واضح رہے کہ آیت اللہ سید علی خامنہ ای کی تقریر سے قبل صدر جمہوریہ اسلامی ایران حجت الاسلام سید محمد خاتمی نے انقلاب اسلامی ایران کو حسینی انقلاب کا عطیہ قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ سچ تو یہ ہے کہ حسینی انقلاب کی طرح انقلاب اسلامی ایران بھی مظلوم اور آبرومند ہے۔

صدر جمہوری اسلامی ایران حجت الاسلام سید محمد خاتمی نے ایران کے موجودہ اسلامی جمہوری نظام کے خلاف حالیہ امریکی دھمکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں بڑی وضاحت کے ساتھ اس بات پر تاکید کرنا چاہتا ہوں کہ ایرانی عوام اور ارباب حکومت کے درمیان دشمن کے خلاف ثابت رفتار قدم ہے اور اس کے ہر تجاوز کاری کا دندان شکن جواب فراہم کرنے کے سلسلے میں ذرہ برابر بھی کوئی اختلاف و ہچکچاہٹ موجود نہیں ہے۔

پس دنیا کے تمام ماہرین سیاست بالخصوص امریکی سیاستمداروں تک ایرانی عوام اور حکمرانوں کا یہ پیغام پہونچنا لازمی ہے۔

❀❀❀

خاتمی صاحب کا فوٹو

امریکی دھمکیوں کے مقابلے میں

صدر جمہوریہ اسلامی ایران کا جواب:

اسلام آزادی اور آزادی خواہی کا منادی ہے۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد تقریباً چوتھائی صدی گزر چکی ہے لیکن آج بھی عالمی سامراج کی حتی الامکان کوشش یہ ہے کہ اس عظیم الشان انقلاب کو اختلافات کا مجموعہ قرار دیتے ہوئے عالمی برادری کو اس سے پوری طرح بد گمان کر دیا جائے۔ چنانچہ ایران کی حکمراں جماعت کو دو گروہوں میں تقسیم کرنا، ایک جماعت کو اصلاح طلب اور دوسری جماعت کو بنیاد پرست بتاتے ہوئے دونوں کے درمیان بے بنیاد اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا امریکی سیاست کا وطیرہ رہا ہے۔ جماعت میں شامل افراد کے طریقہ کار میں اختلاف کے وجود سے انکار ناممکن ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ دونوں کا مقصد ایک ہے اور ایرانی حکمرانوں کے سامنے ایسی نمونہ روزگار شخصیتوں کا کارنامہ حیات موجود ہے جو ذات اور مقصد کے درمیان ٹکراؤ کی صورت میں اپنی ذات کو اپنے پیروں سے کچل کر مقصد کو گلے لگا لیا کرتے تھے۔ ذیل میں امریکی دھمکیوں کے مقابلے میں حجت الاسلام سید محمد خاتمی کے مختصر مگر جامع بیان سے اس

بات کی بھرپور وضاحت ہو جاتی ہے۔ (ادارہ)

نوروز اور عاشورای حسینی کے موقع پر قائد عظیم الشان کے تاریخ ساز خطاب سے قبل ایرانی حکمراں جماعت سے وابستہ ذمہ داروں کو مخاطب کرتے ہوئے صدر جمہوریہ سید محمد خاتمی نے واقعہ کربلا کو منطق حق و عدالت و اصلاح اور منطق فساد، ظلم اور شدت پسندی کے درمیان ٹکراؤ کا نمونہ قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ تاریخ اسلام ہی نہیں بلکہ تاریخ عالم میں بھی حسینی انقلاب نے ہمیشہ آزادی طلب اور خدا پسندانہ تحریکوں کو جنم دیا ہے۔ اسلام در حقیقت آزادی اور آزادی طلبی کا منادی رہا ہے اور گذشتہ صدی کے دوران ایران میں رونما ہونے والی تمام آزادی طلب تحریکیں مذہبی عنصر اور مذہبی شخصیتوں کی نمایاں کارکردگی کی حامل رہی ہیں۔

صدر خاتمی نے مغربی دنیا میں رونما ہونے والی علمی کامیابیوں کے ظاہری چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے باطنی چہرے کو سامراجیت سے وابستہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: انقلاب مشروطیت، تیل کی تجارت کو قومی ملکیت قرار دینے والی ایرانی تحریک، دیگر ایرانی تحریکات اور آخری مرحلہ میں انقلاب اسلامی ایران کے دوران مغربی دنیا کا سامراجی چہرہ بالکل بے نقاب ہو چکا ہے۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی کی وجہ سے دنیا کی بڑی طاقتوں کے مفاد و مصالح خطرے میں پڑ گئے چنانچہ ان طاقتوں نے ایران اور اسلامی نظام حکومت کے خلاف مختلف النوع الزامات کی بھرمار کر دی اور یہ کوئی خلاف امید بات نہیں ہے۔ ان حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صدر محمد خاتمی نے فرمایا کہ اسلامی جمہوریہ ایران کے ذمہ دار عوام اور حکمرانوں کو ایرانی استقامت، امن و سلامتی اور اسلامی انقلاب کی نعمتوں اور برکتوں کا دفاع کرنے کے لئے ہمیشہ آمادہ رہنا چاہئے کیونکہ ہمارے علاقے کی سلامتی در حقیقت ایران کی ثابت قدمی اور سلامتی وابستہ ہے۔

انفرادی شناخت پر مبنی اسلامی جمہوریہ ایران کی سیاست پر تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا کی وہ بڑی طاقتیں اُن ملکوں کے لئے بہت بڑا خطرہ بن گئی ہیں جو اپنی انفرادی پہچان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ در حقیقت دنیا کے چھوٹے اور ترقی کی راہ پر گامزن ملکوں سے بڑی طاقتوں کا بنیادی مطالبہ یہ ہوا کرتا ہے کہ ان کی غیر مشروط پیروی کرتے رہیں اور دنیا کے ہر گوشے میں ان طاقتوں کے ناجائز مفاد

ومصالح کا دفاع بھی کرتے رہیں۔ انھوں نے مزید فرمایا۔ "درحقیقت شرارت آمیز الزامات واتہامات ان لوگوں کی حرکت ہے جو دنیا کو ایٹمی ہتھیاروں کی دھمکی دے رہے ہیں۔

قومی سلامتی تنظیم کے سربراہ حجت الاسلام سید محمد خاتمی نے دنیا پر ایک قطبی نظام کے نظریہ کو مسلط کرنے کی کوشش میں سرگرم امریکی حکمرانوں کی کوشش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہوں کہ ملت ایران اپنی دینی بنیاد اور اسلامی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے ظلم وزور گوئی کے سامنے ہرگز سر تسلیم خم نہ کرے گی کیونکہ اس کا عقیدہ وایمان ہے کہ دھمکی اور رعب ودبدبہ پر مشتمل موجودہ صورتحال کا خاتمہ دنیائے بشریت کے حق میں انتہائی مفید اور کار آمد ثابت ہوگا۔

صلح وعدل اور باہمی عزت واحترام نیز انسانی اقدار کی قدر وقیمت پر مبنی اسلامی جمہوریہ ایران کی دعوت کا ساری دنیا استقبال کرتی ہے جبکہ اپنی ظالمانہ دھمکیوں کی وجہ سے امریکہ غیر معمولی تنہائی سے دوچار ہے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صدر خاتمی نے فرمایا کہ سر دست امریکی حکمراں ۱۱ر ستمبر کو نیویارک میں رونما ہونے والے دردناک حوادث کی وجہ سے امریکی شہریوں کے مجروح جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے دنیا کو ایک وحشت ناک جنگ کی آگ میں ڈھکیل دینا چاہتے ہیں اور اس میں دو رائے نہیں کہ امریکی عوام آنے والے وقت میں اپنے حکمرانوں سے ان کی بداعمالیوں کا ڈٹ کر حساب لیں گے۔

صدر خاتمی نے ایک ترقی پذیر ملک میں سلیقہ اور روش کار میں اختلاف کو جائز اور فطری قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ ایک قانونی چوکھٹے کے اندر رہتے ہوئے لوگوں کے مختلف جائز مطالبات کو پورا کرنا ایک فطری امر ہے اور امریکی ماہرین سیاست کو کسی قسم کے توھم ومغالطے میں نہ پڑنا چاہئے کہ ایران میں ایسی صورتحال پیدا ہو جائے گی کہ ان کی دھمکیوں کے مقابلے میں لوگ اپنے ہاتھ اوپر اٹھالیں گے یعنی ان کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دیں گے۔

انھوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اگر خدانخواستہ امریکہ نے اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنادیا تو ہم اپنی اور اپنے انقلاب کی بقاو موجودیت کے لئے بھرپور طریقے سے دفاعی اقدام

کریں گے اور اس سلسلے میں ہر ممکن مادی معنوی وسائل وامکانات سے کام لیں گے۔

اس تقریر کے دوران صدر جمہوریہ ایران سید محمد خاتمی نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ القاعدہ اور طالبان امریکہ کی مرضی اور سر پرستی کے سایہ میں پیدا ہوئے اور اس کے بعد فرمایا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بہانے مذہبی جمہوریت اور عوام سالاری پر مبنی تحریک پر حملہ کرنا شروع کردیا ہے جس کے نتیجے میں صرف اسلامی دنیا میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے بشریت میں شدت پسندی کو تقویت حاصل ہوگی اور اس افراطی راہ وروش سے کسی کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

اپنی تقریر کے آخری حصہ میں حجت الاسلام خاتمی نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہا کہ موجودہ حالات میں ملک کو اتحاد، قومی اتفاق و وحدت کی ضرورت ہے لہٰذا ملک کے آئین کو نگاہ میں رکھتے ہوئے لوگوں کے جائز مطالبات کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

❀❀❀

مبلغ اشتراک

فی کاپی: ۳۰ ر روپیہ: سالانہ ۱۰۰ ر روپیہ

نوٹ: فصلنامہ راہ اسلام مبلغ اشتراک طلبہ واساتذہ اور تحقیقی مراکز سے وابستہ افراد کے لیے صرف پچاس روپیہ سالانہ ہے۔

ڈرافٹ صرف

DIRECTOR, IRAN CULTURE HOUSE

کے نام اور

NEW DELHI

کے کسی بنک میں قابل ادائیگی ہو۔

پدم شری علی جواد زیدی

شیخ ابو جعفر طوسی علیہ الرحمہ

شیخ ابو جعفر محمد بن الحسین الطوسی چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے خاتمے پر سرزمین ایران کے اس خطہ مبارکہ میں پیدا ہوئے جسے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی برکتوں نے حیات جاوید عطا کی اور جواب مشہد مقدس کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اس زمانے میں طوس کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے شیخ ابو جعفر کو طوسی کہا جاتا ہے۔ فقہ جعفری کے مقتدر ترین اور متبحر علماء میں شیخ کا نام شیخ علیہ الرحمہ، سید مرتضٰی شریف علیہ الرحمہ (جامع نہج البلاغہ) اور ان کے برادر مکرم سید رضی شریف علیہ الرحمہ کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اگرچہ علامہ طوسی ان تین بزرگواروں کے بعد ابھر کر سامنے آتے ہیں لیکن انھوں نے ان سب سے کسب فیض کیا ہے اور اپنے اکتسابات کی بدولت شیخ الطائفہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

شیخ طوسی کی ولادت ۳۸۵ھ/۹۶-۹۹۵ء میں ہوئی اور اپنی ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے وطن مالوف طوس ہی میں حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آپ نے عراق کا سفر اختیار کیا اور ۴۰۸ھ/۱۸-۱۰۱۷ء میں بغداد پہنچے۔ اس وقت حضرت شیخ مفید علیہ الرحمہ وہاں مسند نشین علم وارشاد تھے۔ ائمہ علیہ السلام کے بعد علماء اسلام میں اگر کوئی آواز شیعی دنیا میں سب سے معتبر اور مستند سمجھی گئی تو انھیں کی آواز تھی اور ہمیشہ قدرواحترام کی نظر سے دیکھی گئی۔ شیخ طوسی حضرت شیخ مفید کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے اور ان کی تمام تر توجہات کے مستحق قرار پائے۔

شیخ مفید علیہ الرحمہ نے ۴۱۴ھ/۲۴-۱۰۲۳ء میں وفات پائی۔ لیکن شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے بغداد اور نجف سے وابستگی ترک نہیں کی بلکہ شیخ مفید کے بعد ان کے عزیز ترین اور اہم ترین شاگرد

حضرت الشریف المرتضیٰ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ان سے مسلسل استفاضہ کرتے ہیں۔ ان دونوں کے قریبی تعلقات ۲۳ برس تک قائم رہے۔ اس دوران میں شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے اور کئی علماء اور اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے درس اور مباحثوں میں شرکت کی اور بغداد کے بے شمار کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ انھیں میں مشہور کتب خانہ دار العلم بھی شامل تھا جس میں مختلف علوم وفنون پر کوئی دس ہزار کتابیں موجود تھیں۔ خود ان کے استاد حضرت الشریف المرتضیٰ کا عظیم الشان کتب خانہ ۸۰ ہزار کتابوں پر مشتمل تھا اس کے دروازے ان پر ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔

۴۳۶ھ/۲۵/۴-۱۰۴۴ء میں شریف مرتضیٰ کا انتقال ہوا۔ اور فرقۂ جعفریہ کی مرجعت الشیخ الطوسی علیہ الرحمہ کو منتقل ہوئی۔ ان کے علم وفضل کا شہرہ سن کر دور و نزدیک سے ہزاروں طالبان علم آپ کی خدمت میں آنے لگے۔ یقین کیا جاتا ہے آپ سے تین سو اہم علماء نے درس لیا ہے اور سب کے سب آپ کے علم وفضل کے معترف رہے ہیں۔ اس دور کے عباسی خلیفہ قائم بامر اللہ کو بھی آپ کے علمی کمالات کا اعتراف تھا اور اس نے درس علم کلام کی مسند آپ کو عطا کی تھی۔

علم کی دنیا میں بھی حسد کرنے والوں کی کمی نہیں ہوتی۔ اکثر پاسبان علم نے اس خوف سے کہ شیخ طوسی کے فضل کے سامنے ان کے چراغ ماند پڑ جائیں گے، ان کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جو مذہب کو اپنے ذاتی اغراض کا آلہ کار بنانا چاہتی تھیں۔ انھوں نے خلیفہ کے سامنے یہ تہمت لگائی کہ شیخ مفید صحابہ کرام کی شان کے خلاف باتیں کہتے ہیں۔ یہ مسئلہ خلیفہ کے امام کو تفتیش حال کے لیے سپرد ہوا۔ انھوں نے شکایت کرنے والوں سے جرح کی۔ تفتیش حال پر ان کی شکایت بے اصل ثابت ہوئی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اس کے بعد بھی شیخ الطائفہ کے خلاف شکایات کا سلسلہ جاری رہا۔ ان علماء نے اب عوام الناس کے ذہنوں میں شیخ کے خلاف زہر گھولنا شروع کیا۔ اور جذبات اس حد تک بھڑکا دیے کہ تقریباً فرقہ وارانہ فسادات کی شکل پیدا ہو گئی۔ صورت حال نے اس وقت نازک موڑ لیا جب پہلے سلجوقی بادشاہ رکن الدین طغرل بیگ دوسرے کے مقابلے میں ایک فرقے کی حمایت کرنے لگا اور بغداد کے مشہور کتب خانہ دار العلم کو جلائے جانے کا حکم دے دیا۔ مظالم کی آگ کی لپٹوں سے محقق طوسی نہ بچ سکے۔

۴۵۴ھ ر ۱۰۶۲ھ میں ان کے مکان پر حملہ کیا گیا۔ ان کی کتابیں اور تصانیف اور ان کی کرسی تدریس اور تین سفید تقریبی جھنڈے بھی بحق سرکار ضبط کر کے بعد میں جلا دیے گئے۔

حضرت علی علیہ السلام کے اسوہ مبارک پر عمل کرتے ہوئے اور اسلامی اتحاد کی خاطر مزید قتل و غارت سے مسلمانوں کو بچانے کے خیال سے علامہ طوسی نے بغداد کی رہائش ترک کر دی اور مشہد امیر المومنین نجف اشرف میں اقامت اختیار کی۔ نجف اس وقت ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں تھوڑے سے مکانات تھے۔ یہاں پہنچ کر شیخ نے تعلیم و تدریس کا سلسلہ پھر شروع کیا اور آہستہ آہستہ طالب علموں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اس طرح یہاں اس حوزہ علمیہ فقہ کی بنیاد پڑی جو ابھی چند دنوں پہلے تک سرگرم کار تھا۔ نجف اسلام کا ایک مرکزی نقطہ بن گیا۔ اس کی یہ عظمت تو تھی ہی کہ اس کو حضرت علی کی ذات مبارک سے خاص نسبت ہے۔ اب یہ ایک تدریسی اور فقہی مرکز بن گیا۔ یہ شیخ طوسی کا فیض تھا۔ انھوں نے یہاں حوزہ کی بنیاد ڈالی اور یہاں سے ہر سال کثیر تعداد میں طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلنے لگے۔ نجف میں قیام کر کے شیخ اہل اسلام کو بارہ برس تک اپنے فیوض علمی سے سیراب کرتے رہے۔ ۴۶۰ھ ر ۶۸۔۱۰۶۷ء میں انھوں نے انتقال فرمایا۔ ان کے طلبہ ان کا جنازہ اپنے کاندھوں پر اٹھا کر مدفن تک لے گئے۔ اور ان کی وصیت کے مطابق انھیں کے مکان میں دفن کیا گیا۔ بعد میں اسے ایک مسجد کی شکل دے دی گئی اور یہ یادگار آج بھی باقی ہے۔

شیخ کا علم علی العموم اور امامیہ مسائل سے متعلق بالخصوص قاموسی اور ان کی شخصیت عبقری تھی انھوں نے علوم اسلامیہ کے مختلف شعبوں سے متعلق پچاس کے قریب کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کی تفسیر اور فقہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی بہت سے تصانیف یا تو جلا دی گئیں۔ یا ضائع ہو گئیں لیکن جو محفوظ رہ گئی تھیں وہ بار بار شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کچھ کتابیں ابھی مخطوطوں کی شکل میں غیر مطبوعہ ہیں اور بحیثیت مجموعی بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں نجف اشرف اور قم کے حوزہ ہائے فقہی میں یہ حوالے کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ شیخ کی تصانیف میں "الاستبصار" اہم ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ اس کے چار مجلدات میں ایک کا تعلق شیعہ مسلمانوں سے ہے اور مصنف کے الفاظ میں اس کا تعلق مختلف اخبار اور ان کے مابین تطبیق" سے ہے۔ دوسری کتاب

"الابواب فی طبقات الاصحاب" ہے۔اسے رجال الطوسی 'کانام بھی دیا جاتا ہے۔اور اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ سلم اور آل اطہار علیہم السلام کے اصحاب کے بارے میں معلومات درج ہیں۔"التبیان فی تفسیر القرآن" کے بھی مصنف ہیں۔ یہ علوم قرآنی کے مختلف شعبوں مثلاً لغت، قرأت اور غیر مسلمین کے معتقدات کے جوابات پر مشتمل ہے اور اس نوعیت کی پہلی تفسیر مانی جاتی ہے۔ یہ تفسیر بیس جلدوں میں ہے۔

اسی طرح، تہذیب الاحکام"میں رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تیرہ ہزار پانچ سو نوے احادیث مبارکہ جمع کی ہیں اور روایت و درایت کی رو سے انھیں پرکھا اور جانچا ہے۔اس کے علاوہ فقہ میں "المبسوط" اور اخلاقیات میں "المصباح الکبیر" اور کچھ تاریخی تصانیف بھی ہیں۔ مثال کے طور پر "الغلبیہ "غیبت امام عصر حضرت مہدی علیہ السلام سے متعلق ہے۔ایک کتاب شہادت امام حسین علیہ اسلام کے بارے میں ہے۔ایک الگ کتاب میں جناب مختار ثقفی کے حالات وواقعات درج ہیں۔

عالم تبحر، الشیخ الطوسی کالقب "شیخ طائفہ بھی ہے (یعنی سرگروہ) بھی ہے۔ کیونکہ اسلامی خدمات میں ان کااہم کردار رہا ہے۔ان میں سے بعض کی طرف اشارہ بے محل نہ ہوگا۔

(۱) سب سے اہم وصف یہ ہے کہ فقہ اسلامی میں ان کا علمی مرتبہ بہت بلند ہے۔وہ کھلے ذہن کے مالک تھے اور طلب علم میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے اور پھر اس علم کو اپنے تلامذہ میں نہایت خوبی اور مستعدی سے پہنچاتے رہتے تھے۔وہ متقی اور پرہیز گار تھے۔

(۲) انھوں نے سب سے پہلے نجف اشرف میں تعلیم اسلامی کی بنیاد رکھی اور اس زمانے سے آج تک دنیا کے مختلف گوشوں سے تشنگان علم آتے اور پیاس بجھاتے رہے ہیں۔اس طرح اسلامی علوم کے فروغ میں ان کی ذات گرامی نے ایک خیر جاری کی بنیاد ڈالی۔

(۳) اس کے علاوہ وہ عالم تبحر تھے۔ علوم اسلامی کے مختلف شعبوں مثلاً فقہ وکلام و تفسیر و حدیث پر بیک وقت عبور حاصل تھا۔

(۴) ائمہ علیہم اسلام کے بعد اور امام عصر کی غیبت میں انھوں نے مرجعیت کے سوال کو قطعیت کی شکل دی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عدم موجودگی میں لوگ مذہبی عالموں سے صلاح و مشورہ

کر سکیں اور روزمرہ پیش آنے والے مسائل میں ہدایت طلب کریں۔

(۵)ان کے تصنیفی کارناموں کے تاریخی پہلو بہت ہی اہم ہیں وہ تاریخی مواد اور واقعات کو بڑی ژرف نگاہی اور عزم واحتیاط سے جانچتے پرکھتے تھے اور جب پوری طرح مطمئن ہو جاتے تھے تبھی اپنی تصنیفوں میں ان کا ذکر کرتے تھے۔

۱۳۹۰ھ / ۱۷-۱۹۹۰ء میں عالم اسلامی نے شیخ طوسی علیہ الرحمہ کی ہزار سالہ یادگار منائی اور مشہد یونیورسٹی میں دنیا بھر کے عالموں کا بہت بڑا اجتماع ہوا۔ اسلامی علماء نے حضرت شیخ کے تاریخ اقتباسات علمی کے بارے میں سیمیناروں اور تقریروں میں زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ اور ان کی شاندار علمی وراثت کا اقرار واعتراف کیا۔

مصر کی "الازہر" یونیورسٹی کے نمائندے شیخ ابو زہرا نے فرمایا کہ "الطوسی نے اپنے تقابلی مطالعات کے ذریعے اسلام کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے اور ہم لوگوں کا کسی بھی اسلامی مکتبہ فکر سے تعلق کیوں نہ ہو ہم سب نے ان کی تصنیفات سے اخذ فیض کیا ہے۔

شیخ المحمود المہیری نے قاہرہ کے جریدہ دی اسلام میں لکھا کہ "وہ عالم اسلامی کے ممتاز عالم تھے، اور ان کی تصانیف نے ان کو ہم عصر علما میں ایک بے مثال اور بلند مقام عطا کیا تھا۔

❀❀❀

پروفیسر گوپی چند نارنگ

سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ

کلاسیکی روایت کے تناظر میں

راہِ حق پر چلنے والے جانتے ہیں کہ صلوٰۃ عشق کا وضو، خون سے ہوتا ہے، اور سب سے سچی گواہی خون کی گواہی ہے۔ تاریخ کے حافظے سے بڑے سے بڑے شہنشاہوں کا جاہ و جلال، شکوہ و جبروت، شوکت و حشمت سب کچھ مٹ جاتا ہے، لیکن شہید کے خون کی تابندگی کبھی ماند نہیں پڑتی۔ تا۔ کبھی کبھی تو جب صدیاں کروٹیں لیتی ہیں اور تاریخ کسی نازک موڑ پر پہنچتی ہے تو خون کی سچائی پھر آواز دیتی ہے اور اس کی چمک میں نئی معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ خون کی سچائی قائم و دائم ہے اور یہ ثقافتی روایت میں موجود بھی رہتی ہے۔ لیکن اس کی آواز کانوں میں اسی وقت آتی ہے جب قوموں کا ضمیر بیدار ہوتا ہے۔ تاریخ آرائشِ جمال میں مصروف رہتی ہو یا نہیں، لیکن نقاب میں ماضی کا آئینہ دائم پیشِ نظر رہتا ہے۔ جب جب خیر و شر اور حق و باطل کی آمیزش و پیکار میں معاشروں کو نئے مطالبات اور نئی ہولناکیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا جبر و استبداد، ظلم اور بے مہریوں کا کوئی نیا باب وا ہوتا ہے تو معاشرے یادوں کے قدیم دفینوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور تاریخی روایتوں نیز ثقافتی لاشعور کے خزینوں سے حرکت و حرارت کا نیا ساز و سامان لے کر فکر و عمل کی نئی راہوں کا تعین کرتے ہیں۔ حق کوشی کی راہوں کی حنابندی شہیدوں کے خون سے ہوتی ہے۔ مختلف تہذیبوں میں اس کی مختلف مثالیں اور سلسلے ہیں۔ ہر مثال اپنی جگہ اہم اور لائقِ احترام ہے۔ لیکن اسلام کی تاریخ میں بالخصوص اور انسانیت کی تاریخ میں بالعموم کوئی قربانی اتنی عظیم، اتنی رافع، اور اتنی مکمل نہیں ہے جتنی حسینؑ ابن علیؑ کی شہادت، جو کارزار کرب و بلا میں واقع ہوئی۔ پیغمبر اسلام محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نواسے اور سیّدۃ النسا فاطمۃ الزہرا اور حضرت علی مرتضےٰؑ کے جگر گوشے حسینؑ کے گلے پر جس وقت چھری پھیری گئی اور کربلا کی سرزمین ان کے خون سے لہو لہان ہوئی تو در حقیقت وہ خون ریت پر نہیں گرا بلکہ سنتِ رسولؐ اور دین

ابراہیمیؑ کی بنیادوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیراب کر گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ خون ایک ایسے نور میں تبدیل ہو گیا جسے نہ کوئی تلوار کاٹ سکتی ہے، نہ نیزہ چھید سکتا ہے اور نہ زمانہ مٹا سکتا ہے۔ اس نے مذہبِ اسلام کو جس کی حیثیت اس وقت ایک نوخیز پودے کی سی تھی، استحکام بخشا اور وقت کی آندھیوں سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

اس فقیدالمثال شہادت کے کئی ابعاد اور کئی جہات ہیں۔ لیکن خالص انسانی نقطہ نظر سے غور کریں تو بھی بعض بے حد اہم امتیازات سامنے آتے ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ گویا مشیّت ایزدی نے حسینؑ ابن علیؑ کو خلق ہی اس لیے کیا تھا کہ نبی آخرالزماں رسولِ اکرمؐ کا نواسہ اور ان کی اکلوتی بیٹی فاطمہ زہرا اور چچازاد بھائی علی مرتضیٰؑ کا لختِ جگر راہِ حق میں سر کٹائے اور ایسی قربانی دے جس کی کوئی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہ ہو۔ غور فرمایئے پیغمبر اسلامؐ کے وصال کے تیس برس کے اندر اندر ۴۰ھ میں حضرت علیؑ مسجد کوفہ میں نمازِ صبح کے وقت جب وہ سربسجود تھے، قتل کر دیے جاتے ہیں۔ دس برس کے اندر اندر ۵۰ھ (۶۷۰ء) میں ان کے بڑے بیٹے امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کر دیا جاتا ہے۔ امیر معاویہ اور ان کے بعد یزید کے خلافت سنبھالنے کے بعد اسلام کی کشتی بھنور میں پھنس چکی ہے۔ یوں آخری امتحان کی گھڑی لحہ بہ لحہ قریب آ رہی ہے اور حسینؑ خود کو درجہ بدرجہ اس کے لیے تیار کرتے ہیں۔ وہ ایک فاسق و فاجر حکمراں کے ہاتھ پر بیعت کر کے اصولوں پر مصالحت کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ لیکن گفت و شنید سے معاملے کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور خوں ریزی سے بچنے کی ہر ممکن تدبیر کرتے ہیں۔ یہی کوشش انھیں مدینے سے مکے لے جاتی ہے۔ لیکن جب مکہ میں بھی بچاؤ کی صورت نظر نہیں آتی تو اگرچہ عین حج کا موقع ہے، وہ مکہ سے بھی کوچ کرتے ہیں۔ راستے میں ان کو اپنے چچازاد بھائی مسلمؑ بن عقیلؑ کی، جن کو اپنا نمائندہ بنا کر کوفہ بھیجا تھا، شہادت کی خبر کوفیوں کے انحراف سے ملتی ہے، اور سپاہ شام کی آمد کی اطلاع بھی ملتی ہے، بالآخر جب کوئی راہِ پناہ نہیں رہتی تو کربلا میں پڑاؤ ڈال دیتے ہیں۔ دَربدری، بے گھری اور بے زمینی کے سارے حوالے دراصل انھیں کیفیتوں سے آتے ہیں۔ یہ سارا سفر، منزلیں اور واقعات دراصل درجے ہیں، عزم واستقلال کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے، حتیٰ کہ سچائی کا وہ آخری لحہ آ جاتا ہے جب سروں کے چراغ ہتھیلیوں پر روشن ہو جاتے ہیں۔

ان انتہائی دردناک واقعات کے تاریخِ انسانی میں بے مثال ہونے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حسینؑ ابن علیؑ کے ساتھ اس قربانی میں پورا خاندان، ایک پوری جماعت اور ایک پورا قافلہ شریک تھا، جن میں سے ہر فرد راہِ حق میں اپنا سب کچھ لٹانے کو عین شہادت سمجھتا تھا۔ ۹ محرم کو جب شمر اس حکم کے ساتھ کربلا میں وارد ہوتا ہے کہ اب مزید مہلت نہ دی جائے گی تو حسینؑ صرف رات بھر کا وقت مانگتے ہیں۔ نمازِ مغرب کے بعد وہ ساتھیوں کو خوشی سے اجازت دیتے ہیں کہ رات کے پردے میں جس کا جی چاہے چلا جائے۔ وہ شمع گل کر دیتے ہیں اور چہرے پر رومال ڈال لیتے ہیں تاکہ جانے والوں کو شرمندگی نہ ہو۔ چند لوگ چلے بھی جاتے ہیں۔ تاہم ستر بہتر جاں نثار بچ رہتے ہیں۔ ان سرفروشوں میں ضعیف بوڑھے بھی ہیں، نوعمر لڑکے بھی، نوجوان بھی، معصوم بچے بھی اور خاندان کی محترم خواتین بھی۔ ان میں سے ہر شخص عظیم الشان قربانی میں شریک ہونے کو اپنا شرف سمجھتا ہے اور آخری دم تک سچ کی گواہی دیتا ہے۔

تیسرے یہ کہ یہ عظیم الشان قربانی کسی عام قبیلے کی نہیں، آلِ رسولؐ کی تھی۔ حسینؑ ابن علیؑ کو بعض عزیزوں نے جن میں اُن کے سوتیلے بھائی ابنِ حنفیہ، اور حضرت زینب کے شوہر بھی تھے، روکنے کی ہر ممکن کوشش کی، اُن کا اصرار تھا کہ کم از کم عورتوں اور بچوں کو ساتھ نہ لے جائیں، لیکن حسینؑ کی بہنوں نے احتجاج کیا کہ نانا کی امت اور اس کے دین کو بچانے اور اس کی راہ میں قربانی دینے کا حق انھیں بھی ہے۔ یوں اس مقدس کنبے کے افراد اپنے خون کے ہر قطرے سے دعوتِ حق کی توثیق کرتے ہیں۔ وہ نو، دس برس کے دو بھانجے عونؑ و محمدؑ ہوں، تیرہ چودہ برس کا بھتیجا قاسمؑ ہو، اٹھارہ برس کا بیٹا علی اکبرؑ ہو، بتیس برس کا بھائی عباسؑ یا دودھ پیتا بچہ علی اصغرؑ ہو، سب ایک کے بعد ایک برچھیاں اور تیر کھاتے ہیں اور شہید ہو جاتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ وہی حسینؑ ابنِ علیؑ جو اسلام کی مقدس ترین ہستی رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی چہیتی اولاد فاطمہ زہرا سیدۂ بتولؑ کے بطن اطہر سے تھے، اور اُن کے گودوں کھیلے اور لاڈوں پلے تھے اور خود نبی اکرم، نانا ہونے کے ناتے جن کے ناز اٹھاتے ہوں گے، ان کے سامنے نہایت بے دردی سے، ان کے بیٹوں، بھائیوں، بھانجوں اور بھتیجوں کو قتل کیا گیا، بھوکا پیاسا رکھا گیا، کیا کیا اذیتیں نہ دی گئیں اور پھر جب اسی گردن جس پر رسول اللہ کے بوسوں کے

مقدس نشان ہوں گے، انتہائی سفاکی اور بے رحمی سے تپتی ریت پر کاٹا گیا، لاش کی بے حرمتی کی گئی اور اس کو گھوڑوں سے پامال کیا گیا تو آسمان بھی خون کے آنسو کیوں نہ رویا ہو گا، اور زمین کا سینہ بھی کیوں نہ شق ہو گیا ہو گا۔

چوتھے یہ کہ یہ خالصتاً حق و باطل کا معرکہ تھا۔ اس میں دور دور تک کسی طرح کی کوئی مادی آلائش نہ تھی۔ کہاں یزید کی طاقت و حشمت اور ہزاروں کا لشکر اور کہاں نحیف و نزار حسینؓ اور اہلِ بیت کا مختصر سا قافلہ، جو ۲ر محرم کو کربلا کے میدان میں یزیدی فوجوں سے گھر گیا۔ تمام راستے بند کر دیے گئے۔ اور یزید کی بیعت پر اصرار کیا جانے لگا۔ ۷ر محرم کو دریائے فرات پر پہرہ بٹھادیا گیا اور امام حسینؓ اور ان کے رفقا پر پانی بند کر دیا گیا ۸ر محرم کو عمرو بن سعد نے پھر بیعت کے لیے کہلوایا۔ امام حسینؓ کے استقلال میں اب بھی فرق نہ آیا۔ آپ نے بیعت سے صاف انکار کر دیا، اور کہا کہ میں بلکہ یا مدینے واپس جا کر گوشہ نشین ہو جاؤں گا، یہ بھی ممکن نہ ہو تو یزید کی سلطنت سے نکل کر ہندوستان یا کسی اور ملک میں جا رہوں گا۔ لیکن ان میں سے کوئی بات منظور نہ کی گئی، اور ۹ر محرم کو شمر گورنر کوفہ ابن زیاد کا حکم لے کر پہنچا کہ یا تو امام حسینؓ سے یزید کی بیعت لی جائے یا ان کا سر لایا جائے۔ ۹ر کی شب آپ نے اپنے رفقا کے ساتھ عبادت میں گزاری۔ حتیٰ کہ صبح کا آفتاب اپنے خونیں چہرے کے ساتھ نمودار ہوا۔ موت کا بھیانک منظر سب کی آنکھوں کے سامنے تھا، لیکن کیا مجال کہ کسی کے بھی پائے استقلال میں لغزش آئی ہو۔

پانچویں یہ کہ یہ المناک سانحہ شہادت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی دلدوزی اور اذیت واندوہناکی کا سلسلہ، اصل سانحے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ شہیدوں کی لاشوں کو گھوڑوں سے پامال کیا جاتا ہے، عورتوں کے سروں سے چادریں کھینچی جاتی ہیں اور خیموں میں آگ لگادی جاتی ہے۔ شہیدوں کے سروں کو نیزوں پر چڑھا کر آگے آگے رکھا جاتا ہے۔ عرب کے شریف ترین خاندان کی غیرت مند بیبیوں کو بے مقنع و چادر اونٹوں کی ننگی پیٹھ پر بٹھایا جاتا ہے اور حسینؓ کے بیمار بیٹے سیّد سجاد زین العابدینؒ کو پُر خار راستوں سے پیدل چلنے پر مجبور کیا جاتا ہے، غرض انتہائی شقاوت اور ذلت و خواری سے یہ قافلہ کوفہ اور پھر دمشق لے جایا جاتا ہے۔ اس دوران اہلِ حرم اور بالخصوص امام کی بہن حضرت زینبؓ ایسی پُر اثر تقریریں کرتی ہیں کہ اہلِ عرب کے دل ہل جاتے ہیں اور باطل کا پردہ فاش ہو جاتا ہے۔

حسینؑ ابن علیؑ کی اس بے مثال شہادت نے اسلام کے فلسفۂ جہاد و قربانی کی جس روایت کو روشن کیا اس کا گہرا اثر ادبیات پر بھی پڑا۔ زیر نظر مضمون میں اس کی معنویت اور مضمرات کے بارے میں جو کچھ بھی عرض کیا جائے گا، وہ ادب ہی کے حوالے سے ہوگا۔ بر صغیر میں اردو زبان جس وقت ابھی اپنی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی، بعض علاقائی بولیوں اور لوک روایتوں میں ان دردناک واقعات کا عوامی اظہار ہو رہا تھا۔ سرائیکی، سندھی، پنجابی، برج، اودھی، دکھنی اور بہت سی دوسری لوک روایتوں میں ایسا ذخیرہ ملتا ہے جس میں خون کے آنسوؤں کی آمیزش ہے۔ اردو میں صنفِ مرثیہ کے باقاعدہ وجود میں آنے سے پہلے، دوہے، نوحے وغیرہ پڑھے جاتے تھے۔ دکھنی اردو میں چو مصرع مرثیوں کا رواج تھا۔ پھر شمالی ہندوستان میں دو مصرعے، چو مصرعے مرثیے اور نوحے یا سوز و سلام کہے جاتے رہے۔ ان کا مقصد مصائبِ اہلِ بیت کا بیان اور عقیدت و احترام کے ساتھ درد و غم کے جذبات کا اظہار تھا۔ پھر میر ضمیر اور میر خلیق نے اس کو شعری اظہار کی سطح دی اور اس کے لیے مسدس کو اپنایا۔ مرثیے کے لیے مثنوی اور غزل کی ہیئت کو بھی برتا گیا۔ سلام و نوحے، غزل کی ہیئت میں لکھے جاتے ہیں۔ قصیدے اور رباعی کا دامن بھی ان مضامین سے خالی نہیں۔ لیکن مسدس مرثیے سے مخصوص ہو گیا۔ اور انیسؔ و دبیرؔ نے اس صنف کو ایسی ترقی دی اور اپنے شعری کمالات کی ایسی دھاک بٹھائی کہ ان کے بعد پھر کسی کو ایسی بلندی نصیب نہ ہوئی۔ مرثیہ انیسؔ و دبیرؔ کے بعد بھی لکھا جاتا رہا اور آج بھی لکھا جا رہا ہے۔ مرثیہ اردو شاعری کی ایسی جہت کو پیش کرتا ہے جس کی نظیر غالباً اتنے بڑے پیمانے پر دوسری زبانوں میں نہیں ملے گی۔ اُردو ادب کی اصناف کا کوئی مطالعہ، صنفِ مرثیہ کے فروغ اور ارتقا کے مطالعے کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ اردو شاعری کی شاید ہی کوئی تاریخ ہو جس میں مرثیے کا ذکر نہ ہو۔ خاص صنفِ مرثیہ کے بارے میں اور انیس و دبیر اور دوسرے مرثیہ گو شعرا کے کمالات پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مرثیہ بیسویں صدی میں بھی لکھا جا رہا ہے، اور موجودہ عہد کے مرثیہ گویوں میں شادؔ عظیم آبادی، جوش ملیح آبادی اور جمیل مظہری کے بعد سیّد آلِ رضا، امیر رضا مظہری، نسیم امروہوی، ڈاکٹر صفدر حسین، صبا اکبر آبادی، نجم آفندی، زائر سیتاپوری، امید فاضلی اور ڈاکٹر وحید اختر کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ مرثیہ اگرچہ مذہبی صنفِ سخن ہے، اس کو فروغ دینے والوں میں بہت سے غیر مسلم

شعرا کے نام بھی ملتے ہیں مثلاً مہاراجہ بلوان سنگھ راجہؔ چھنو لال دلگیر، دلو رام کوثریؔ، رائے سدھ ناتھ فراقیؔ، نھوتی لال دھون وحشیؔ، کنور سین مضطرؔ، بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی، نانک چند کھتری نانکؔ، روپ کماری کنورؔ، لبھو رام جوشؔ ملسیانی، گوپی ناتھ امنؔ، باوا کرشن گوپال مغمومؔ، نرائین داس طالبؔ دہلوی، دگمبر پرشاد جین گوہرؔ دہلوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، وشو ناتھ پرشاد ماتھر لکھنوی، چند بہاری لال ماتھر صباؔ جے پوری، گورو سرن لال ادیبؔ، پنڈت رگھو ناتھ سہائے اُمیدؔ، امر چند قیسؔ، راجندر ناتھ شیداؔ، رام پرکاش ساحرؔ، مہر لال سونی ضیاؔ فتح آبادی، جاویدؔ وششٹ اور درشن سنگھ دُگل کا کلام اکثر کتابوں میں ملتا ہے۔ اس وضاحت سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مرثیے کی روایت کے کئی ادوار ہیں اور یہ سلسلہ کئی صدیوں پر محیط ہے۔ یہ سارے کا سارا سرمایہ "رثائی ادب" کہلاتا ہے۔ اور اس کی اہمیت اور معنویت مسلم ہے۔ لیکن زیر نظر مضمون میں "رثائی ادب" یعنی جو از روئے روایت رثائی ادب قرار پاتا ہے، اس سے سروکار نہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ موجودہ عہد میں نئے معنیاتی تقاضوں کے تحت شہادتِ حسینؑ کا تاریخی حوالہ رسمی رثائی ادب سے ہٹ کر عام اردو شاعری میں بھی پرورش پا رہا ہے اور پچھلی تین چار دہائیوں سے ایک نئے اظہاری اور شعری رجحان کی صورت اختیار کر رہا ہے، جو اپنی جگہ بے حد اہمیت و معنویت کا حامل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ عہد کی شاعری میں یہ تاریخی حوالہ، جن نئے معنیاتی مضمرات کے ساتھ ساتھ ابھر رہا ہے، اس نوع کا تقاضا "رثائی شاعری" سے کیا بھی نہیں جا سکتا۔ بے شک رثائی ادب میں دوسری جہات بھی کار فرما ہو سکتی ہیں، لیکن وہاں بنیادی محرک اہل بیت اطہار کے مصائب کا بیان ہے، جب کہ عام شاعری میں بنیادی محرک کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ عام شاعری میں بنیادی حوالہ آتا تو ہے مذہبی تاریخی روایت ہی سے، لیکن اس میں تہہ در تہہ استعاراتی اور علامتی توسیع ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس میں عالم گیر آفاقی معنویت پیدا ہو جاتی ہے، جس کا اطلاق تمام انسانی برادری کی عمومی صورت حال پر اور موجودہ عہد میں جبر و تعدی اور استبداد و استحصال کے خلاف نبرد آزما ہونے یا حق و صداقت کے لیے ستیزہ کار ہونے کی خصوصی صورتِ حال پر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات ایک مثال کے ذریعے واضح ہو جائے گی۔ حضرت مسیحؑ کا مصلوب ہونا عیسائیت کی تاریخ کا مرکزی نقطہ ہے اور عیسائیت میں اس کی مذہبی اہمیت ہے، لیکن صلیب کا تصور آج صرف عیسائیت تک محدود نہیں، بلکہ

دوسری عالمی روایتوں میں بھی صلیب کا تصور علامتی نوعیت سے دکھ سہنے اور دکھ جھیلنے کی انسانی صورت حال کے وسیع معنی میں ہر جگہ ملتا ہے۔ فن کار اپنے تخیل میں آزاد ہے، اس کے ذہن وشعور کا بنیادی سرچشمہ اکثروبیشتر اس کی اپنی مذہبی ثقافتی روایتیں ہی ہوا کرتی ہیں، لیکن چونکہ فن خود حقیقت کی نئی تخلیق ہے، فنکار یا شاعر تاریخ کی عظیم روایتوں کی بازیافت بھی کرتا ہے اور ان سے نیا رشتہ بھی جوڑتا ہے، نیز پرانی سچائیوں کو نئی روشنی میں بھی پیش کرتا ہے جس کی اُس کے عہد کو ضرورت ہوتی ہے۔ ادھر کئی برسوں سے میں برابر محسوس کرتا رہا ہوں کہ سانحۂ کربلا اور اس کے محترم کرداروں کے حوالے سے جدید شاعری میں ایک نیا تخلیقی رجحان فروغ پا رہا ہے جو معنیاتی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، لیکن ہنوز اردو تنقید نے اس پر توجہ نہیں کی۔ زیر نظر مضمون کا مقصد یہی ہے کہ اس نئے شعری رجحان کے آغاز و ارتقا کی نشاندہی کی جائے اور امکانی حد تک اس کے اسلوبیاتی پیرایوں اور ساختیاتی نیز معنیاتی مضمرات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ خاصا دقت طلب اور پھیلا ہوا کام ہے اور اس کو ایک مضمون میں سمیٹنا خاصا مشکل ہے۔ تاہم میری امکانی کوشش ہوگی کہ کوئی ضروری پہلو نظر انداز نہ ہو۔

خواجہ حالی نے یادگار غالب میں مرزا غالب کے اس اعتراف کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے مجتہد العصر سید محمد صاحب کے اصرار پر مرثیہ لکھنا شروع کیا، لیکن مشکل سے مسدس کے تین بند لکھے تھے، اس سے آگے ان سے نہ چلا۔ غالب کا بیان ہے: "یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں۔"[1]

امتیاز علی عرشی نے سرور ریاض کے حوالے سے لکھا ہے۔ کہ غالب نے ریاض الدین امجد سندیلوی متخلص بہ ریاض سے سے کہا "یہ حصہ دبیر کا ہے۔ وہ مرثیہ گوئی میں فوق لے گیا ہے۔ ہم سے آگے نہ چلا۔ ناتمام رہ گیا۔"[2]

جب بھی کوئی تاریخی حوالہ مذہبی اصناف سے نکل کر دوسری اصناف سخن میں پہنچتا ہے اور علامتی اظہاری شکلیں اختیار کرتا ہے، تو علاوہ معنیاتی وجوہ کے اس کی فنی وجوہ بھی ہو سکتی ہیں۔ کوئی بھی صاحب کمال کسی بھی حوالے کے خاص نوع کے اظہار امکانات کو ختم بھی کر دیتے ہیں۔ غالب کا اعتراف اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے وہی غالب جو فارسی غزل میں مد کے انداز میں کہہ چکے تھے۔

بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب
ساز ترا زیر و بم واقعہ کربلا

واقعہ کربلا کے تاریخی حوالے کا استعاراتی اظہار غزل کی کلاسیکی روایت میں یقیناً ڈھونڈا جاسکتا ہے اور اس کی تلاش سعی حاصل نہ ہوگی۔ میر تقی میرؔ کا یہ شعر اس کا بین ثبوت ہے۔

شیخ پڑے محراب حرم میں پہروں دوگانہ پڑھتے رہو
سجدہ ایک اس تیغ تلے کا ان سے ہو تو سلام کریں

یہاں تیغ سے مراد حسن محبوب بھی ہو سکتا ہے جو کشتی ہے یا چشم وابروئے محبوب جس کے کردار سے ہی شخصیت مکمل ہوتی ہے، لیکن پہلے مصرعے میں شیخ، محراب حرم، دوگانہ کچھ اور ہی فضا پیدا کرتے ہیں نیز "پہروں دوگانہ پڑھتے رہو، میں اس ظاہر داری پر جو باطنی اقدار سے خالی ہو، ہلکا سا طنز بھی ہے۔ اب دونوں مصرعوں کو ملا کر پڑھیے، تو تیغ تلے کا سجدہ اور سلام کسی اور ہی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اگرچہ پورے شعر مین واقعہ کربلا یا اس کے کسی محترم کردار کا کوئی ذکر نہیں، لیکن ظاہر داری اور تیغ تلے کا سجدہ سلام کرنے سے جس تضاد کی فضابندی ہوئی ہے، اس میں ذہن معاً اسی تاریخی واقعے کی طرف راجع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کرشمہ فن کے رمزیہ اور ایمائی رشتوں کی بدولت قائم ہوتا ہے۔

انھیں ایمائی رشتوں کی روشنی میں ذرا ذیل کے اشعار بھی ملاحظہ فرمایئے۔

دست کش نالہ ، پیش رو گریہ آہ چلتی ہے یاں علم لے کر
زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا سر بھی تسلیم محبت میں ہلا یا نہ گیا
اپنے جی ہی میں نہ آئی کہ پئیں آب حیات ورنہ ہم میر اسی چشمے پہ بے جان ہوئے
وا اس سے سر حرف تو ہو گو کہ یہ سر جائے ہم حلق بریدہ ہی سے تقریر کریں گے
اس دشت میں اے سیل سنبھل ہی کے قدم رکھ ہر سمت کویاں دفن مری تشنہ لبی ہے

بظاہر یہ عشقیہ شاعری کے اشعار ہیں، لیکن کیا ان اشعار کی امیجری پر تاریخ پر چھائیں پڑتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ پہلے شعر میں گریہ نالہ، غزلیہ شاعری کے عام الفاظ ہیں، لیکن ان کا ایک ساتھ آنا، اور علم کے ساتھ آنا کیا تصویر پیش کرتا ہے۔ دوسرا شعر حد درجہ عمومیت لیے ہوئے ہے اور تغزل

کے رنگ میں رچا ہوا ہے۔اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے کسی طرح کی تخصیص قائم ہو۔لیکن جتنا ہی یہ شعر اپنے حوالۂ فیضان کے اعتبار سے مبہم ہے،اتنا ہی اپنی تاثیر اور درمندی میں بے پناہ ہے۔ اس نوع کے اشعار کے بارے میں قطب سے کچھ کہنا جمالیاتی حسن کاری کے تفاعل کے بھی خلاف ہے۔تیسرے شعر میں فرات اور پیاس کے ان کہے حوالے سے معنی در معنی کا جو پہلودار نظام قائم ہو گیا ہے،ذوق سلیم اس کو بخوبی محسوس کر سکتا ہے۔چوتھے شعر کا انتخاب رسر جائے رکی وجہ سے نہیں،بلکہ رہم حلق بریدہ ہی سے تقریر کریں گے رکی وجہ سے کیا گیا ہے۔غور فرمایئے کیا امیجری ہے اور کیا اثر اس سے مرتب ہوتا ہے۔یہ اشارہ شہادت کے بعد کی روایت سے ماخوذ ہے۔روایت لوک ورثہ کا حصہ ہوتی ہے اور اس کا تعلق شعور سے زیادہ لاشعور ہوتا ہے۔ شاعری میں اس کو اسی نظر سے دیکھنا چاہئے۔ پانچویں شعر بھی لطف واثر میں کم نہیں۔سیل یا سیل گریہ یا سیلاب کا مضمون میر کے یہاں عام ہے لیکن دوسرے مصرعے میں رہر سمت کویاں دفن مری تشنہ لبی ہے رکہہ کر میر نے کچھ اور ہی معنویت اور کیفیت پیدا کی ہے۔بہر حال یہ سب عشقیہ شاعری کے دردمند اشعار ہیں۔لیکن اس سے شاید ہی کسی کا انکار ہو کہ ان میں بعض اظہاری اور معنیاتی عناصر اپنی تخلیقی غذا اس تاریخی روایت سے حاصل کرتے ہیں۔جو صدیوں سے ثقافتی سائیکی میں جذب ہو گئی ہے۔

غرض غزل کے اس نوع کے اشعار میں اس تاریخی واقعے کے استعاراتی ابعاد کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔کلاسیکی عہد میں اس معنیاتی نظام کا بنیادی ساختیہ ظاہر داری اور باطنیت کی ٹکر تھی۔وہ طبقہ جو اقتدار پر قابض تھا۔طاقت وہوس کے نشے میں ریاکاری ومنافقت کا شکار تھا۔اس کے مقابلے میں عوامی طبقہ تھا،جو باطنی اقدار یعنی پاکیزگی نفس اور عشق وخیر وخدمت خلق کو اصل مذہب گردانتا تھا۔ظاہر پرستی اور باطنیت کی آویزش پورے عہد وسطیٰ میں ملتی ہے انیسویں صدی میں برصغیر کے نشاۃ الثانیہ اور عہد جدید میں داخل ہونے کے بعد بالخصوص سیاسی المیہ ۱۸۵۷ء کے بعد عہد وسطیٰ کا ظاہر داری اور باطنیت کی آویزش کا روحانی ساختیہ ایک نئے سیاسی سماجی ساختیے کو راہ دیتا ہے۔اب اس میں حق وباطل یا خیر وشر کے معنی بدل جاتے ہیں۔چنانچہ غیر ملکی استحصالی قوتیں یا برطانوی سامراج اب باطل یا شر ہے اور اس کے خلاف ستیزہ کاری یا جدوجہد کرنا عین حق اور خیر ہے۔یوں تو اردو شاعری میں یہ

احساس انیسویں صدی ہی سے ملنے لگتا ہے، لیکن صحیح معنوں میں سر سید حالی اور آزاد کے بعد راہ ہموار ہو جای ہے۔ البتہ اس نوع کے اظہارات میں پوراشعوری حوصلہ کہیں بیسویں صدی کے اوائل میں جا کر پیدا ہوتا ہے، اور اس احساس کو جو چیز مہمیز کرتی ہیں وہ تحریک خلافت ہے۔ ۱۹۱۱ء میں جب جنگ بلقان چھڑی تو ہندوستانیوں کے زخم تازہ ہوگئے اور وہ بہت بے چین ہوگئے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس میں ترکی، جرمنی کے ساتھ تھا، چنانچہ جنگ ختم ہونے کے بعد برطانیہ نے ایشیائے کوچک میں ترکی کے مقبوضات فرانس اور انگلستان میں تقسیم کرلیے۔ اس سے پورے ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں شدید برہمی پھیل گئی اور تحریک خلافت اور حرکت موالات شروع ہوئی۔ مولانا محمد علی جوہر اس تحریک کے قائدین میں تھے۔ ان کا شعری ذوق بہت رچا ہوا اور بالیدہ تھا۔ اگرچہ وہ شاگرد داغ کے تھے لیکن سیاسی شاعری میں حسرت موہانی سے متاثر تھے۔ انھوں نے کئی بار قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ جیل سے ان کا کلام جیلر کی مہریں لگ کر باہر آتا تھا، اور شائع ہوتے ہی بے حد مقبول ہو جاتا تھا۔ ان کی اسی زمانے کی ایک غزل ہے:

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

اسی غزل کا شعر ہے:

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

یہ شعر شائع ہوتے ہی زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ یہ خارج از امکان نہیں کہ بعد کی غزل پر اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور مرتب ہوا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مولانا محمد علی جوہر نے دیکھتے ہی دیکھتے تحریر و تقریر اور عبارت واشارت سے قوت و توانائی کی ایسی آگ بھڑکادی کہ پوری تحریک آزادی میں خود اعتمادی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ قومی رہنما دوسرے بھی تھے لیکن آتش فشانی اور شعلہ سامانی کا منصب گویا انھیں کو ودیعت ہوا تھا۔ انگریز سامراج کے جبر واستبداد سے ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی، بلکہ جس قدر ظلم وجور میں شدت ہوئی، مولانا کا جوش قربانی اور جذبۂ ایثار

وشہادت اتنا ہی کھل کر سامنے آیا۔مندرجہ بالا یادگار غزل کے علاوہ اور بھی کئی مقامات پر مولانا نے سانحۂ کربلا کے تاریخی و معنوی انسلاکات کو اپنی غزل میں برتا ہے اور ان سے تخلیقی سطح پر مجاہدین آزادی کے جذبۂ حریت اور حوصلۂ شہادت کو للکارا ہے:

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے
فرصت کسے خوشامد شمر و یزید سے
اب ادعائے پیروی پنجتن کہاں
کہتے ہیں لوگ ہے رہ ظلمات پر خطر
کچھ دشت کربلا سے سوا ہو تو جانیے

☆☆☆☆

جب تک کہ دل سے محو نہ ہو کربلا کی یاد
ہم سے نہ ہو سکے گی اطاعت یزید کی
بنیاد جبر و قہر اشارے میں ہل گئی
ہو جائے کاش پھر وہی ایمائے کربلا
روز ازل سے ہے یہی اک مقصد حیات
جائے گا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا

جہاں تک نظم کا تعلق ہے، واقعہ کربلا اور شہادت حسین کی نئی معنویت کی طرف سب سے پہلے اقبال کی نظر گئی، اور اس کا پہلا بھرپور تخلیقی اظہار اقبال کے فارسی کلام میں ملتا ہے۔اقبال کی اردو شاعری کی مثالیں بہت بعد کی ہیں۔بال جبریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔رموز بے خودی البتہ ۱۹۱۸ء میں منظر عام پر آچکی تھی۔اس میں "در معنی حریت اسلامیہ و سر حادثہ کربلا" کے عنوان سے جو اشعار ہیں، یقیناً ان کو اس نئے معنیاتی رجحان کا پیش خیمہ کہا جاسکتا ہے۔یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ خود مولانا محمد علی جوہر اس معاملے میں اقبال سے متاثر رہے ہوں، کیونکہ اقبال کے فارسی کلام کی مثالیں تو یقیناً

مولانا کی زندگی کی ہیں (مولانا کا انتقال ۱۹۳۱ء میں ہوا) اور اس میں شک نہیں کہ اقبال کا اثر نہایت ہمہ گیر اور وسیع تھا۔ رموز بے خودی میں "در معنی حریت اسلامیہ و سر حادثۂ کربلا" سے متعلق اشعار رکن دوم میں آئے ہیں، جہاں شروع کا حصہ رسالت محمدیہ اور تشکیل و تاسیس حریت و مساوات واخوت بنی نوع آدم کے بارے میں ہے۔ اس کے بعد اخوت اسلامیہ کا حصہ ہے، پھر مساوات کا، اور ان کے بعد حریت اسلامیہ کے معنی میں سر حادثہ کربلا بیان کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حادثۂ کربلا کا ذکر اسلام کی بنیادی خصوصیات گنواتے ہوئے آیا ہے۔ اس حصے میں شروع کے کچھ اشعار عقل و عشق کے ضمن میں ہیں، اس کے بعد جب اقبال اصل موضوع پر آتے ہیں تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کردار حسین کو کس نئی روشنی میں دیکھ رہے ہیں اور کن پہلوؤں پر زور دینا چاہتے ہیں۔ حسین کے کردار میں انھیں عشق کا وہ تصور نظر آتا ہے جو ان کی شاعری کا مرکزی نقطۂ تھا۔ اور اس میں انھیں حریت کا وہ شعلہ بھی ملتا ہے جس کی تب و تاب سے وہ ملت کی شیرازہ بندی کرنا چاہتے تھے اور نئے نو آبادیاتی تناظر میں ہم وطنوں کو جس کی یاد دلانا چاہتے ہیں:

در معنی حریت اسلامیہ و سرّ حادثۂ کربلا

ہر کہ پیماں باہوالموجود بست	گردنش از بند ہر معبود است
عشق را آرام جاں حرّیت است	ناقہ اش را ساربان حریت است
آں شنیدستی کہ ہنگام نبرد	عشق با عقل ہوس پرور چہ کرد
آں امام عاشقاں پور بتول	سرو آزادے زبستان رسولؐ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر	معنی ذبح عظیم آمد پسر
بہر آں شہزادۂ خیر الملل	دوش ختم المرسلین نعم الجمل
سرخ رو عشق غیور از خون او	شوخی ایں مصرع از مضمون او
درمیان امت آں کیواں جناب	ہمچو حرف قل ھو اللہ در کتاب
موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید	ایں دو قوت از حیات آید پدید
زندہ حق از قوت شبیری است	باطل آخر داغ حسرت میری است

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت / حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آں سرجلوۂ خیر الامم / چوں سحاب قبلہ باراں در قدم
برزمین کربلا بارید ورفت / لالہ در ویرانہ ہا کارید ورفت
تاقیامت قطع استبداد کرد / موج خون اوچمن ایجاد کرد
بہرحق در خاک وکون غلطیدہ است / پس بنائے لاالہ گردیدہ است
مدعا یش سلطنت بودے اگر / خود نکردے باچنین ساماں سفر
دشمنان چوں ریگ صحرا لاتعد / دوستان او بہ یزداں ہم عدد
سر ابراہیم و اسمعیلؑ بود / یعنی آں اجمال را تفصیل بود
عزم او چون کوہسار استوار / پائدار وتند سیرو کامگار
تیغ بہر عزت دین است وبس / مقصد او حفظ آئین است وبس
ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست / پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
خون او تفسیر ایں اسرار کرد / ملت خوابیدہ رابیدار کرد
تیغ لاچوں از میاں بیروں کشید / از رگ ارباب باطل خوں کشید
نقش الا اللہ برصحرا نوشت / سطر عنوان نجات ما نوشت
رمز قرآں از حسینؑ آموختیم / زآتش او شعلہ ہا اندوختیم
شوکت شام وفر بغداد رفت / سطوت غرناطہ ہم از یادرفت
تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز / تازہ از تکبیر اوایماں ہنوز

اے صبا اے پیک دور افتادگان
اشک ما بر خاک پاک اور ساں

رموز بیخودی ہی میں "در معنی این کہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا اسوہ کاملہ ایست برائے نساء اسلام" کے ذیل میں بھی حسین کا ذکر آیا ہے:

در نوائے زندگی سوز از حسینؑ

اہل حق حریت آموز از حسینؓ

سیرت فرزند ہا از امہات
جوہر صدق وصفا از امہات
مزرع تسلیم را حاصل بتول
مادران را اسوۂ کامل بتول

اس کے فوراً بعد "خطاب بہ مخدرات اسلام" میں یہ حوالہ پھر آیا ہے:

فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوۂ زہرا مبند
تا حسینی شاخ تو بار آورد
موسم پیشیں بہ گلزار آورد

پھر یہ حوالہ زبور عجم (۱۹۲۷ء) کی ایک غزل کے اس زبردست شعر میں ملتا ہے:

ریگ عراق منتظر کشت حجاز تشنہ کام
خون حسین باز دہ کوفہ و شام خویش را

ریگ عراق منتظر ہے، کشت حجاز تشنہ کام ہے، اپنے کوفہ وشام کو خون حسین پھر دے، اس میں حال کا صیغہ اور کوفہ وشام خویش نئی فکر کے غماز ہیں، یعنی پھر وہی تشنگی کا منظر ہے اور موجودہ حالات میں تمہارے کوفہ وشام کو خون حسین کی پھر ضرورت ہے۔ یہ تھی وہ تڑپ اور آگ جو اقبال کو بار بار اس حوالے کی طرف لے آتی تھی۔

جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) مین سلطان شہید (ٹیپو سلطان) کا ذکر کرتے ہوئے اسے "وارث جذب حسین" کہا ہے پس چہ باید کرد (۱۹۳۶ء میں) بھی فکر اور "حرفی چند باامت اسلامیہ" کے ذیل میں حسین کا حوالہ آیا ہے:

فقر عریاں گرمی بدرد حنین
فقر عریاں بانگ تکبیر حسین

ارمغان حجاز (۱۹۳۸ء) میں فرماتے ہیں:

اگر پندے ز درویشے پزیری
ہزار امت بمیرد تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

آخری مجموعہ ازمغان حجاز جو اقبال کے انتقال کے کچھ ماہ بعد ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا، اس شعر پر ختم ہوتا ہے:

ازاں کشت خرابے حاصلے نیست
کہ آب از خون شبیرے ندارد

اقبال فارسی میں بھی جو کہتے تھے، پوری اردو دنیا میں اس سے ارتعاش پیدا ہتا تھا۔ رثائی ادب سے ہٹ کر نئے تناظر مین اس تاریخی حوالے کی اہمیت کا ذکر اردو دنیا کے لئے بالکل نیا موضوع تھا۔ اقبال کی اردو شاعری میں اس موضوع کی گونج پہلی بار بال جبریل (۱۹۳۵ء) کی غزلوں اور نظموں میں سنائی دیتی ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے کلام کے پیش نظر اقبال کے یہاں حسین، شبیر، مقام شبیری، اسوۂ شبیری، باقاعدہ تفہیم کا درجہ رکھتے ہیں۔ ذیل کے اردو اشعار اس سلسلے میں بے حد اہم ہیں۔ اس کو اس رجحان کا اولین سنگ میل سمجھنا چاہئے۔ نئے نوآبادیاتی تناظر میں ان کی معنویت غور طلب ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان اشعار نے بعد کے شعرا کے لئے اس تاریخی حوالے کے نئے علامتی ابعاد کو روشن نہ کیا ہوگا۔

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی وشامی
غریب وسادہ ورنگین ہے داستان حرم
نہایت اسکی حسین ، ابتداہے اسماعیل

اقبال کے اس تخلیقی رویے کا اثر بعد میں آنے والے شاعروں پر رفتہ رفتہ مرتب ہوا، اور یوں آہستہ آہستہ شعری اظہار کی ایک نئی راہ کھل گئی۔ بال جبریل کی مختصر نظم ''فقر'' کا نقطۂ عروج بھی کئی

فارسی نظموں کی طرح "سرمایہ شبیری" ہی ہے:

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی ودلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی ، سرمایۂ شبیری

لیکن انتہا درجہ کی حسن کاری اور حد درجہ شدت احساس کے ساتھ یہ حوالہ بال جبریل کی شاہکار نظم "ذوق وشوق" کے دوسرے بند میں ابھرتا ہے۔ اختتامی بیت میں تطبیق تصور عشق سے کی گئی ہے جو اقبال کا مرکزی موضوع ہے۔

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں ، بدر وحنین بھی ہے عشق

لیکن اسی بند کا یہ شعر:

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ وفرات

بالخصوص اس کا پہلا مصرع تو ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔ شاعر تڑپ کر کہتا ہے کہ ذکر عرب عربی مشاہدات سے اور فکر عجم عجمی تخیلات سے تہی ہو چکے ہیں کاش کوئی حسین ہو جو زوال وغفلت کے اس پر آشوب دور میں حریت وحق کوشی کی شمع روشن کرے۔

رموز بے خودی ۱۹۱۸ء میں بال جبرئیل ۱۹۳۵ء میں اور ارمغان حجاز ۱۹۳۸ء میں منظر عام پر آئیں۔ لگ بھگ اسی زمانے میں جوش ملیح آبادی کے یہاں بھی شہادت حسین کا حوالہ نئے انقلابی ابعاد کے ساتھ ملتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یوں تو جوش ملیح آبادی نے "ذاکر سے خطاب" اور "سوگواران حسین سے خطاب" جیسی نظمیں بھی لکھیں جن کا مقصد اصلاح تھا، لیکن شہادت حسین کی انقلابی معنویت کی

طرف اشارے انھوں نے "رثائی ادب" کے دائرے ہی میں رہ کر کیے۔ شعلہ و شبنم میں اس نوعیت کا جتنا کلام ہے، اس کے بارے میں خود جوش نے وضاحت کر دی ہے کہ یہ تمام نظمیں ۱۹۲۷ء سے پہلے کی ہیں۔ جوش ان منظومات کو بھلے ہی زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوں، کردار حسین کی انقلابی معنویت کو روشن کرنے میں جوش کی شاعری نے نہایت اہم خدمت انجام دی۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان کا پہلا مرثیہ جو "آوازۂ حق" کے نام سے شائع ہوا، اور جس کے آخری بند میں واضح طور پر جوش نے صدیوں کی تاریخ کا سلسلہ اپنے عہد کی سامراج دشمنی سے ملادیا ۱۹۱۸ء کی تصنیف ہے۔ اقبال کی شہرۂ آفاق تصنیف رموز بے خودی بھی (جس سے ہم "در معنی حریت اسلامیہ و سر حادثہ کربلا" اور متعدد دوسرے حوالے پیش کر چکے ہیں) ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ پہلی جنگ عظیم کے اختتام کا اور تحریک خلافت کے تقریباً آغاز کا زمانہ تھا۔ جوش کا یہ بند ملاحظہ ہو جس میں وہ دعوت دیتے ہیں کہ اسلام کا نام جلی کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہر فرد حسین ابن علی ہو:

اے قوم! وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ سلام ہے پھر تیر حوادث کا نشانہ
کیوں چپ ہے اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ
مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر فرد حسین ابن علی ہو

واضح رہے کہ "آوازۂ حق" کو شعلہ و شبنم میں شامل کرتے وقت جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی، جوش نے اعتذار کا لہجہ اختیار کیا اور یہ نوٹ درج کیا "اس نظم کو صرف اس نظر سے پڑھا جاسکتا ہے کہ یہ آج سے اٹھارہ برس پیشتر کی چیز ہے۔" (ص ۲۴۸)

یوں تو جوش ملیح آبادی نے نو مرثیے لکھے جنھیں ضمیر اختر نقوی نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے (جوش ملیح آبادی کے مرثیے، لکھنؤ ۱۹۸۱ء) لیکن آزادی سے پہلے "آوازۂ حق کے علاوہ جوش کا صرف ایک اور مرثیہ "حسین اور انقلاب ملتا ہے جو ۱۹۴۱ء کی تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے انقلابی خیالات کا اظہار اور بھی کھل کر کیا ہے اور کئی بندوں میں حسین کو حریت و آزادی کے مظہر کے طور پر پیش کیا ہے۔ چالیس بند کی بیت ہے:

عباس نامور کے لہو سے دھلا ہوا
اب بھی حسینیت کا علم ہے کھلا ہوا

اس کے بعد کے کچھ بند ملاحظہ ہوں:

یہ صبح انقلاب کی جو آج کل ہے ضو یہ جو مچل رہی ہے صبا پھٹ رہی ہے پو
یہ جو چراغ ظلم کی تھرا رہی ہے لو درپردہ یہ حسین کے انفاس کی ہے رو
حق کے چھڑے ہوئے ہیں جو یہ ساز دوستو
یہ بھی اسی جری کی ہے آواز دوستو

پھر حق ہے آفتاب لب بام اے حسین پھر بزم آب گل میں ہے کہرام اے حسین
پھر زندگی ہے سست وسبک گام اے حسین پھر حریت ہے مورد الزام اے حسین
ذوق فساد و ولولۂ شر لیے ہوئے
پھر عصر نو کے شمر ہیں خنجر لئے ہوئے

مجروح پھر ہے عدل ومساوات کا شعار اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائب یزید ہیں دنیا کے شہر یار پھر کربلائے نو سے ہے نوع بشر دوچار
اے زندگی ! جلال شہ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزم حسین دے

آئین کشمکش سے ہے دنیا کی زیب وزین ہر گام ایک "بدر" ہو ہر سانس اک "حسین"
بڑھتے رہو یونہیں پے تسخیر مشرقین سینوں میں بجلیاں ہوں زبانوں پہ "یا حسین"
تم حیدری ہو سینۂ اژدر کو پھاڑ دو
اس خیبر جدید کا در بھی اکھاڑ دو

اس مرثیہ کا خاتمہ اس بیت پر ہوا ہے:

دنیا تری نظیر شہادت لیے ہوئے
اب تک کھڑی ہے شمع ہدایت لئے ہوئے

جوش ملیح آبادی نے اسی زمانہ میں کہا:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

اس سلسلے میں جوش کے ایک سلام کے یہ دو شعر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، جس میں عہد نو کی صاف گونج موجود ہے:

محراب کی ہوس ہے نہ منبر کی آرزو
ہم کو ہے طبل و پرچم ولشکر کی آرزو
اس آرزو سے میرے لہو میں ہے جزرومد
دشت بلا میں تھی جو بہتر کی آرزو

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ جوش رثائی ادب کی کلاسیکی روایت سے جو مذہبی مقصد کے لئے مخصوص تھی، سیاسی نوعیت کا کام لے رہے تھے۔ اس پر کچھ اعتراض بھی ہوئے۔ بااین ہمہ اس کا اعتراف بھی کیا گیا کہ "جوش نے مرثیے میں انقلاب اور قومی آزادی کے تصور کو رواج دیا۔" تاہم رثائی ادب کی اپنی حدود تھیں، جن کا احترام مرثیہ گو شعرا کے لئے واجب تھا۔ جوش کی البیلی شخصیت کی بات ہی اور تھی۔ وہ اپنی رومانیت اور بغاوت کی وجہ سے ہر چیز کو نبھا لے جا سکتے تھے۔ دوسروں کے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ جمیل مظہری نے کچھ کوشش کی لیکن ان سے چلا نہیں اور اسکا چلنا ممکن بھی نہیں تھا۔ ان کوششوں کے برعکس اقبال اور محمد علی جوہر نے نظم اور غزل میں کردار حسین کی عظمت کے بلاواسطہ اور بالواسطہ تخلیقی اظہار کی جو راہ دکھائی تھی، اس نے آنے والوں کے لئے ایک شاہراہ کھول دی، اور بعد کی اردو شاعری میں اس رجحان کو فروغ دراصل انھیں اثرات کے تحت ہوا۔

حوالے :

۱۔ الطاف حسین حالی: یادگار غالب ص۹۱
۲۔ امتیاز علی عرشی: دیوان غالب نسخہ عرشی ص۳۸۸

❁❁❁

پروفیسر نیر مسعود

مرثیہ خوانی کا فن

تحت اللفظ مرثیہ خوانی کا رواج ابھی باقی ہے لیکن مرثیہ خوانی کا وہ فن ختم ہو چکا ہے جس کے واقعات بیان کرنے والے اگر چشم دید گواہ نہ ہوتے تو ہم اس قسم کے بیانات کو شاید افسانہ سمجھتے کہ میر انیس نے ایک مصرع اس طرح پڑھا کہ سننے والے کو اپنے سامنے شعلے بھڑکتے دکھائی دینے لگے[1] اور میر نفیس کا بوڑھا اور لٹکتی ہوئی کھال والا چہرہ ایک حسین عورت کے چہرے میں بدل گیا[2] اور دولہا صاحب عروج نے اپنا ہاتھ بلند کیا تو اہل مجلس کو ان کی انگلیوں میں پھنسا ہوا ایک ستارہ جھلملاتا نظر آیا[3] اور موسلا دھار بارش کے شور میں میر مہر علی انس نے مرثیہ پڑھنا شروع کیا تو ٹین کے سائبان پر پڑتی ہوئی بوندوں کی سامعہ خراش آواز غائب ہو گئی[4] اور مرزا دبیر منبر پر بیٹھے تو اُن کا ضعف دیکھ کر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ دو چار بند بھی نہ پڑھ سکیں گے، لیکن جب وہ پڑھنے لگے تو معلوم ہوتا تھا منبر پر کوئی اور آکر بیٹھ گیا ہے۔[5]

سطور ذیل میں مرثیہ خوانی کی اسی عجیب و غریب فن کا ایک جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

مرثیہ خوانی کے ابتدائی خدو خال ہمیں داستان گوئی اور شعر خوانی کی روایتوں میں ملتے ہیں۔ داستان گو مجمع کے سامنے جو واقعات بیان کرتا اُن کے اثر کو اپنے طرز ادا سے بہت بڑھا دیتا تھا اور کبھی کبھی خود مضمون کی تصویر بن جاتا تھا۔[6] میر انیس کے ایک چچا میر احسان مخلوق داستان گو تھے[7] اور مشہور داستان گو میر اصغر علی کہتے تھے کہ رزم پڑھنے میں میر انیس نے ہم لوگوں کا طرز اُڑا لیا ہے۔[8]

آواز کے اُتار چڑھاؤ، چہرے کے تاثرات اور بدن کی جنبشوں سے مضمون کی تصویر کھینچنا مرثیہ خوانی کے اہم عنصر ہیں۔ یہ روایت اس فن سے پہلے شعر خوانی کی صورت میں موجود تھی۔ میر سوز کی ڈرامائی شعر خوانی کے واقعات مشہور ہیں[9] ان کے شاگرد میرزا خانی نوازش بھی اس طرز کے ماہر

تھے ۱۰ میر مظفر حسین ضمیرؔ جن سے مرثیہ خوانی کے فن کا آغاز ہوا وہ بھی شعر بہت اچھی طرح پڑھتے تھے اور اُن کی یہی مہارت فنِ مرثیہ خوانی کے اُس قصر کی خشت اوّل ثابت ہوئی جس کو آگے بڑھ کر میر انیسؔ نے بلندی کی انتہا تک پہنچادیا۔

میر ضمیر کا بیان ہے کہ وہ مرثیہ خوانی کے مروّجہ طرز سے واقف نہیں تھے ۱۱ ایک موقع پر ایک عزادار کو اپنے یہاں مجلس پڑھنے کے لیے کوئی مرثیہ خواں نہیں ملا تو اس نے ضمیر کو مرثیوں کی ایک بیاض دے کر اصرار کیا کہ آپ شعر خوانی میں بے مثل ہیں، میرے یہاں مرثیہ پڑھ دیجیے۔ ضمیر نے مجبور ہو کر گدّا کا ایک مرثیہ نکالا اور ڈرتے ڈرتے اپنے انداز سے پڑھنا شروع کیا۔ یہ خواندگی اتنی موثر ثابت ہوئی کہ کئی لوگوں کو غش آگیا اور خود ضمیر بھی منبر سے گر پڑے۔ اس واقعے کے بعد انھوں نے باقاعدہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی شروع کر دی ۱۲۔ میر ضمیر کو مرثیہ خوانی میں اشاروں اور ہاتھ سے بتانے کا موجد کہا گیا ہے ۱۳۔ یہ بھی بیان ملتا ہے کہ وہ مرثیہ خوانی میں مضمون کی صورت بن جاتے تھے ۱۴ یہ ایجاد ظاہراً اُن کے کمال شعر خوانی کی دین تھی اور اسی کی وجہ سے مرثیہ خوانی کو ایک باضابطہ مظاہراتی فن کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

میر ضمیر کے معاصر اور میر انیس کے والد میر مستحسن خلیقؔ بھی باکمال مرثیہ خواں تھے، ایک میر ضمیر کے برخلاف وہ ہاتھوں اور بدن کو حرکت دینے کے بجائے صرف "آنکھ کی گردش" ۱۵ یعنی چہرے کے تاثرات، اور آواز سے کام لیتے تھے۔ ۱۶ دونوں باکمالوں کا انداز خواندگی اپنے اپنے مرثیوں کے لیے مناسب بھی تھا اس لیے کہ ضمیرؔ کے یہاں رزمیہ اور بیانیہ عناصر خلیق سے زیادہ اور خلیقؔ کے یہاں رثائی عناصر ضمیرؔ سے زیادہ ہوتے تھے۔

ضمیر کے شاگرد مرزا سلامت علی دبیرؔ نے مرثیہ خوانی میں اپنے استاد کی روش اختیار نہیں کی۔ وہ ہاتھوں اور دوسرے اشاروں سے بتانے کے بجائے صرف آواز کے مدوجزر ۱۷ اور لہجے کی تبدیلی ۱۸ سے کام لیتے تھے، یعنی انھوں نے خود کو میر خلیق کی قائم کی ہوئی حد کے اندر رکھا۔

میر خلیقؔ کے بیٹے اور شاگرد میر ببر علی انیس مرثیہ گوئی میں مرزا دبیرؔ کے مدِمقابل تھے۔ دونوں باکمال مداح اپنے اپنے ممدوح کو دوسرے پر فوقیت دیتے تھے،، لیکن جہاں تک مرثیہ خوانی کا

تعلق تھا میر انیس کا مدِ مقابل کسی کو نہیں سمجھا جاتا تھا۔

مرثیے کے میدان میں آنے سے پہلے میر انیس غزلیں کہتے اور پڑھتے تھے اور ضمیر کی طرح اُن کا بھی طرز شعر خوانی بہت پُر اثر تھا۔ وہ خود اپنے ابتدائی زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے تھے کہ جب میں مشاعرے میں غزل پڑھتا تو دو چار دس آدمی رو کر لوٹنے لگتے تھے [۱۹]۔ قربان علی بیگ سالک [۲۰] اور میر انیس کے نواسے باقر صاحب حمید [۲۱] نے اُن کی موثر شعر خوانی کے واقعات بیان کیے ہیں۔ انیس کبھی مرثیہ خوانی میں زیادہ تر آنکھوں [۲۲] اور آواز سے کام لیتے تھے [۲۳] لیکن اعتدال کی حد میں رہتے ہوئے ہاتھوں اور اشارے سے بھی بتاتے تھے [۲۴] در حالے کے مرزا دبیر بتانے کے خلاف تھے۔ وہ اسے "ارتھ" کہتے اور موسیقی کی چیز سمجھتے تھے [۲۵] یعنی مرثیہ خوانی میں مرزا دبیر اپنے استاد ضمیر سے زیادہ میر انیس کے استاد خلیق سے زیادہ قریب تھے اور ضمیر کا انداز ان کے شاگرد دبیر سے زیادہ خلیق کے شاگرد انیس نے اختیار کیا۔

مرثیہ خوانی کا فن جس کو انیس نے معراجِ کمال پر پہنچا دیا اصلاً تمثیل کا فن تھا، لیکن اس تمثیل اور اداکاری کے مروّجہ فن میں بہت فرق تھا جس کی وضاحت سید مسعو حسن رضوی ادیب نے یوں کی ہے :

"ایکٹر گویا صورت و شکل، لباس، وضع قطع میں بالکل ویسا ہی بن جاتا ہے جیسا وہ شخص جس کا کردار اسے ادا کرنا ہے ...... لیکن مرثیہ خوانی کا کمال دیکھئے کہ ایک شخص اپنے معمولی لباس اور اصلی صورت میں آتا ہے اور صرف لہجے کی تبدیلی، چہرے کے تغیر، جسم اور اعضا کی معمولی سی جنبش، آنکھ کی خفیف سی گردش سے ہر صنف، ہر عمر، ہر حیثیت، ہر استعداد، ہر ذہنی کیفیت والے انسان کی تصویر پیش کر دیتا ہے ...... اہل مجلس کی آنکھیں مرثیہ خوانی کی صورت دیکھتی ہیں اور کان اس کے الفاظ سنتے ہیں لیکن ...... ذہن کسی دوسری ہستی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے [۲۶]۔

مرثیہ خوانی کا یہی کمال یعنی ذہن کو دوسری طرف منتقل کر دینا اسے اداکاری سے ممیز کرتا ہے۔ لیکن مرثیہ خواں صرف اسی پر قادر نہیں تھا کہ اہلِ مجلس کو دوسرے چہرے دکھادے اور دوسری آوازیں سُنادے، وہ ایسی صورتِ حال اور ایسے مناظر دکھانے پر بھی قادر تھا جن کی کوئی مشابہت نفاست

کے ساتھ آراستہ عودواگر سے مہکتے ہوئے امام باڑوں میں موجود نہ ہوتی تھی۔ میر انیس نے ''وہ دشت اور وہ خیمۂ زنگار گوں کی شان'' پڑھتے ہوئے ''وہ دشت ''کو اس طرح کھینچا کہ شادؔ عظیم آبادی کی نگاہوں کے سامنے ایک دشت کی پہنائی آگئی ۲۷،اور میر نفیس نیس جب یہ بیت پڑھی :

پریدہ طائر جاں یوں تھے خوف کھائے ہوئے

کہ جیسے شب کو ڈریں جانور ستائے ہوئے

تو ہاتھوں کو کچھ اس طرح حرکت دی کہ (آرزو لکھنوی) کو خوف سے اُڑتی ہوئی چڑیاں دکھائی دینے لگیں''۲۸۔یہ محض فن تمثیل ہے ایک قدم آگے کی چیز نہیں ہے بلکہ فن خواندگی کی ''چیزے دگر'' ہے جس میں مرثیہ خوان وہ کمال نہیں دکھاتا جو اداکار اپنی تمثیل سے دکھاتا ہے بلکہ وہ کام کرتا ہے جو عکاس اپنے کیمرے سے لیتا ہے۔اور خاص اسی کمال کی وجہ سے عہدہ خواندگی پر سحر اور نظر بندی کا گمان ہوتا تھا۔اسی کمال کے ذریعے ماہر مرثیہ خواں خصوصاً میر انیس اپنے کلام،اپنی آواز اور لہجے،اپنے چہرے کے تاثرات اور اشارات کو ترکیب دے کر اپنے مخاطبین کے ذہن کو کسی صورت حال کی طرف اس طرح منتقل کر سکتے تھے کہ اُن کا تصور برانگیختہ ہوجاتا تھا اور یہ تصور اتنا صادق ہوتا تھا کہ اُن کی نظروں سے مرثیہ خواں اور منبر اور سننے والوں کا مجمع غائب ہوجاتا اور انھیں وہ کچھ دکھائی دینے لگتا جو درحقیقت اُن کے سامنے موجود نہیں ہوتا تھا۔اسی لیے میر انیس کی ایک خواندگی کے بیان میں شمس العلما مولوی ذکاءاللہ نے کہا تھا کہ ''وہ شخص منبر پر بیٹھا پڑھ رہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جادو کر رہا ہے''۲۹۔

میر انیسؔ ہی کی خواندگی ہمیں مرثیہ خوانی میں تمثیل کی دو قسموں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ایک ظاہری تمثیل،اور ایک معنوی تمثیل، ظاہری تمثیل کی مثال میر ذاکر حسین یاسؔ کا یہ بیان ہے کہ ''میر انیسؔ نے یہ مصرع پڑھتے وقت:

صحرا ز مرّدی تھا پھریرے کے عکس سے

مرثیے کو اس طرح ذرا سا پلٹ دیا کہ پھر یرے کا لہرانا آنکھوں کے سامنے آگیا۳۰''میر انیس کے پوتے سید خورشید حسن عرف دولہا صاحب عروج کا بند ہے:

رن میں پہنچا جو بہ صد غیظ حسنؑ کا دلبر — دیکھ کر رعبِ جری ہوگئے حیراں خودسر

بڑھ کے دو چار قدم اور سوئے لشکرِ شر | دیکھی میدان کی حد گھوڑے کو کاوادے کر
روک کر پھر فرسِ برق سیّر غازی نے
کی نموداروں پہ چُن چُن کے نظر غازی نے

مرثیہ خوانی کی اصطلاح میں یہ "پڑھت" کا بند ہے یعنی مرثیہ خواں کے لیے اس میں اشاروں سے بتانے کی بہت گنجائش ہے۔ ایسے بندوں اور مصرعوں کی تعریف بھی بہت ہوتی تھی۔ مسعود حسن ادیب بتاتے ہیں کہ جب دولہا صاحب اس قسم کے مقامات پڑھ دیتے تھے تو "اثر کا وہ عالم ہوتا تھا جو قلم کی زبان سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔۲۸ پڑھت یا ظاہری تمثیل کے مقام ایسے ہوتے ہیں کہ مرثیہ خواں بہت باکمال نہ ہو تو بھی اُن پر کچھ نہ کچھ داد وصول کر ہی لیتا ہے۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ مرثیہ خوانی میں ظاہری تمثیل نسبۃً آسان ہوتی ہے۔

معنوی تمثیل کی مثال انیس کا وہ بند ہے جس کے پہلے ہی مصرعے کے دو لفظ سُن کر شاد کو "وسعتِ دشت" نظر آنے لگی تھی۔ پورا بند یہ ہے:

وہ دشت اور وہ خیمۂ زنگار گوں کی شان | گویا زمین پہ نصب تھا اک تازہ آسمان
بے چوبہ سپہر بریں جس کا سائبان | بیت العتیق، دیں کا مدینہ، جہاں کی جان
اللہ کے حبیب کے پیارے اسی میں تھے
سب عرش کبریا کے ستارے اسی میں تھے

یہ دولہا صاحب کے مندرجہ بالا بند کی حد تک تو پڑھت کا بند نہیں ہے، پھر بھی اس کے چھ میں سے پانچ مصرعوں میں ظاہری تمثیل سے کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ پہلے مصرعے میں "دشت" اور "خیمہ" دوسرے میں "زمین" اور "آسمان" تیسرے میں "سپہر بریں" اور "سائبان" پانچویں مصرع میں "اللہ" اور چھٹے میں "عرش کبریا" کے الفاظ ایسے ہیں کہ ان پانچ مصرعوں کو اشاروں سے بتا کے پڑھا جا سکتا ہے۔ پورے بند میں صرف چوتھا مصرع "بیت العتیق، دیں کا مدینہ، جہاں کی جان" ایسا ہے جسے پڑھت کے لحاظ سے کمزور کہا جا سکتا ہے۔ لیکن میر انیس نے اسی چوتھے مصرع کو کچھ اس طرح ادا کر دیا کہ "تعریف کرتے کرتے لوگ کھڑے ہو گئے۲۹ گویا میر انیس کی خواندگی میں پڑھت کا بہترین مصرع

یہی تھا۔ یہ بظاہر ایک معما ہے لیکن اس کا حل اسی مصرع میں پنہاں ہے۔ یہ مصرع اگرچہ خواندگی کے عام معیار کے لحاظ سے کمزور ہے لیکن اس کی معنوی قوت بند کے باقی پانچ مصرعوں سے کہیں زیادہ ہے، اس لیے کہ وہ پانچ مصرعے خیمہ حسینی کے ظاہر کا بیان کرتے ہیں لیکن اس کی باطنی عظمت اور شان، جو ظاہر کی محتاج نہیں۔ اسی مصرعے "بیت العتیق، دیں کا مدینہ، جہاں کی جان" میں بیان ہوئی ہے۔ انیس نے اپنی خواندگی سے اسی عظمت اور شان کی ایسی تصویر کھینچ دی کہ اس کے سامنے کے دوسرے مصرعے دھندلا گئے۔ علاوہ بریں اس مصرعے میں "دین کا مدینہ" اور "جہاں کی جان" میں "دیں" کا لفظ "مدینہ" کے اندر اور "جان" کا لفظ "جہاں" میں موجود ہے۔ ظاہراً انیس نے یہ مصرع اس طرح پڑھا کہ سننے والوں کے ذہن اس طرف منتقل ہو گئے اور خواہ ہر ایک کی سمجھ میں فوری طور پر یہ صنعت گری نہ آئی ہو لیکن انیس کی زبان سے سُن کر اتنا ضرور محسوس ہو گیا کہ ان لفظوں میں بھی کچھ نہ کچھ بھید ہے۔ انیس کے مرثیوں کو تحریری شکل میں سرسری پڑھنے سے بھی قدم قدم پر اس طرح کا احساس ہوتا ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انیس کی زبان سے سننے پر اس قسم کے لفظوں کا اثر کیا ہو جاتا ہو گا، اور یہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ کلام انیس میں لفظی اور معنوی صنائع و بدائع کی کثرت کیوں ہے۔

اب تک فن مرثیہ گوئی کے بارے میں جو گفتگو ہوئی اس کی کچھ اور مثالوں کی روشنی میں اس فن کے حسبِ ذیل عناصر قابل توجہ قرار پاتے ہیں۔

ا۔ آواز: مرثیہ خوانی کے لیے سب سے اہم چیز اس کی آواز تھی۔ ایسی آواز جو دور دور تک یکساں سنائی دے "پلّہ کشن" آواز کہلاتی ہے۔ قریب قریب سبھی مرثیہ خوانوں کی آواز پلّہ کشن ہوتی تھی۔ حیدر آباد میں نواب بہرام الدولہ کے یہاں پیارے صاحب رشید کی خواندگی کے دوران ایک صاحب نے تجربہ کر کے بتایا کہ رشید کی آواز جس طرح منبر کے بائیں سنائی دے رہی تھی اُسی طرح مجمعے کے آخری حصّے میں پہنچ رہی تھی۔ ۳۰ میر مہدی علی اُنس نے ایک خط میں اپنی مجلسوں کا بیان کرتے ہوئے لکھا:

"اور طرفہ یہ کہ اب کے مجھ کو یقین تھا کہ پہلی ہی تاریخ آواز گرفتہ ہو جائے گی، سونویں تک آواز کا یہ عالم تھا کہ آسمان پر جاتی تھی اور پانچ ہزار آدمیوں کی رقّت پر بالا تھی ۳۱"

میر انیسؔ نے دولہا صاحب کے بچپن میں انھیں مرثیہ خوانی کے سلسلے میں ہدایت کی تھی کہ وہ عورتوں اور جانوروں کی بولیاں سیکھیں ۴۲۔ دولہا صاحب کو "آواز پر اتنا قابو تھا کہ جہاں چاہتے گداز پیدا کر لیتے اور جس مقام پر ضرورت ہوتی گرج آجاتی" ۴۳ کتاب "قاعدۂ تحت لفظ خوانی" کے مصنف کی ہدایت ہے کہ "ہفتے میں دو مرتبہ بہ آواز بلند سو پچاس بند مرثیے کے پڑھا کرے کہ وقت پڑھنے کے ناطاقتی آواز میں نہ ہو...... اور گھر کے سو بند مجلس کے دس بند سمجھنا چاہئے ۴۴۔ میرے ایک بزرگ سید مجاور حسین رضوی نیوتنوی مرحوم بہت اچھے مرثیہ خواں اور اس فن میں میر علی محمد عارفؔ کے شاگرد تھے، مشق کے طور پر بند کمرے میں پوری آواز سے اور اُتار چڑھاؤ کے بغیر مرثیے کے دو سو بند ایک سانس میں "یعنی رُکے اور سستائے بغیر پڑھا کرتے تھے۔

مرثیہ خونی میں آواز کا استعمال تین طرح سے ہوتا ہے۔ ایک سینے کے زور سے پڑھنا، دوسرے سینے اور گلے سے ملا کر آواز نکالنا، تیسرے صرف گلے سے پڑھنا۔ ادیبؔ مرحوم بتاتے تھے کہ ایک مجلس میں دولہا صاحب نے یہ مصرع پڑھا:

ٹاپ ماری تو دھمک پشتِ سمک تک پہنچی

"دھمک" کا لفظ انھوں نے سینے کے زور سے اس طرح ادا کیا کہ سننے والوں کو محسوس ہوا جیسے عزاخانے کی زمین ہل گئی ہے۔ "سمک" کا لفظ انھوں نے اور بھی بلند آواز میں لیکن صرف گلے سے ادا کیا۔ علاوہ بریں انھوں نے "دھمک" کی ہائے مخلوط کو دال سے ذرا الگ کر کے اور میم کو تھوڑا کھینچ کر "دھماک" کہا جس سے اس لفظ کی آواز میں اور بھی گہرائی آگئی۔

۲۔ لہجہ: مرزا دبیرؔ نے ایک مصرع "کیوں تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی" کئی لہجوں میں پڑھ کر کئی کیفیتیں پیدا کر دی تھیں ۴۵۔ دولہا صاحب نے تلوار کی تعریف میں یہ مصرعے لگاتار پانچ چھ مرتبہ پڑھے:

غیظ میں آ کے سرِ مرحب عنتر کاٹے

اور جھلائی تو جبریل کے شہپر کاٹے

ہر مرتبہ وہ مختلف لفظوں پر الگ الگ زور دے کر مصرعوں میں نئی معنویت پیدا کرتے اور ہر بار اہل مجلس تعریفیں کرتے کرتے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ۴۶

مرثیہ خوانی میں لہجے کے تغیرات کی اہمیت ظاہر ہے۔ انھیں تغیرات کی مدد سے میر انیسؔ نے ایک ہی مرثیہ دو دن دو مختلف طریقوں سے پڑھا۔ ۳۷ لیکن مرثیہ خوانی کا ایک اساسی لہجہ ضرور ہوتا تھا جو چہرے سے لے کر جنگ، شہادت اور بین تک اور مختلف کرداروں کے مکالموں میں بھی سرایت کیے رہتا تھا۔ اس لہجے میں بہت خفیف سے لحن کی آمیزش ہوتی تھی۔ دوسرے تمام لہجے فروعی اور اسی اساس لہجے پر قائم ہوتے تھے۔ اسی اساسی لہجے کی بدولت مرثیہ خوانی میں یہ وصف تھا کہ دور ہی سے سُن کر، خواہ الفاظ سمجھ میں نہ آرہے ہوں، بہ آسانی معلوم ہو جاتا تھا کہ مرثیہ پڑھا جارہا ہے، اور فروعی لہجوں کی بدولت یہ بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ جنگ پڑھی جارہی ہے، یا بین، یا مرثیے کا کوئی اور جز۔ سید سرفراز حسین خبیرؔ لکھنوی مرحوم کو میں نے سُنا ہے۔ وہ حضرت سکینہ کے مکالمے مرثیے کے اساسی لہجے میں ایک اور لہجے کی آمیزش کے ساتھ اپنی بھاری آواز میں اس طرح ادا کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ روتی ہوئی بچی کسی بات کے لیے ضد کر رہی ہے۔ فروعی لہجوں کے ساتھ اساسی لہجے کو برقرار رکھنا مرثیہ خوانی کا اُتنا ہی بڑا کمال تھا جتنا وہ کمال جس کی طرف مسعود حسن رضوی ادیب نے اشارہ کیا ہے کہ "مرثیہ خواں کسی دوسرے شخص کی تصویر بھی پیش کرتا ہے اور اپنی ہستی کو بھی قائم رکھتا ہے ۳۸"۔

۳۔ ادائے لفظ: لہجے کے علاوہ مرثیہ خوانی میں لفظوں کے وصل و فصل کا نظام بھی نہایت نازک اور پیچیدہ ہوتا تھا۔ کہاں پر لفظوں کو ملا کر پڑھا جائے، کہاں پر الگ کر کے، کہاں پر دُہرا کر اور کہاں پر حذف کر کے، یہ فیصلہ کرنا مرثیہ خواں کا کام تھا۔ اس میں اس کی خواندگی کے جوہر بھی کھلتے تھے اور مرثیے میں مختلف کیفیتیں اور مصنوعتیں بھی پیدا ہو جاتی تھیں۔

تلوار کی تعریف میں ایک بند ہے۔ اس میں تین مصرعے جس لفظ پر ختم ہوتے ہیں ان کا اگلا مصرع اسی لفظ سے شروع ہوتا ہے:

سر پر جو پڑی دو کیے خود و سر گردن ۔ گردن سے چلی تا بہ کمر کاٹ کے جوشن
جوشن سے جو اُتری تو لیا زین کا دامن ۔ دامن سے چلی تیز تو دو ہو گیا توسن
قبضہ تو رہا دستِ جنابِ شہِ دیں میں
اور تا سرِ دنبالہ در آئی وہ زمیں میں

مرثیہ خوانی کی اصطلاح میں یہ "دست و گریبان" کا بند ہے ۹۳؎ "قاعدہ تحت لفظ خوانی" میں اس بند کو اس طرح پڑھنے کی ہدایت کی گئی ہے:

سر پر جو پڑی
دو کیے خود و سر و گردن گردن سے چلی
تابہ کمر کاٹ کے جوشن جوشن سے جو اتری
تو لیا زین کا دامن دامن سے چلی تیز
تو دو ہو گیا توسن قبضہ تو رہا
دستِ جنابِ شہِ دیں میں اور تا سر دنبالہ
در آئی وہ زمیں میں ۹۴؎

۴۔ **آنکھوں اور چہرے سے اظہار** : آواز، لہجے اور ادائے الفاظ کے علاوہ مفہوم کی وضاحت، صورت حال کی تصویر کشی اور مضمون کی اثر آفرینی کے لیے مرثیہ خوانی میں جو طریقے اختیار کیے جاتے تھے ان میں چشم و ابرو کے اشارے اور چہرے کے تاثرات بھی شامل ہیں:
میر انیسؔ کے شاگرد سید محمد افضل فارغؔ سیتاپوری کا شعر ہے:

سخن کو ہوتی ہے توضیح چشم و ابرو سے
فقط زبان ہو تو چتون کا کام ہو نہ سکے ۹۵؎

چشم و ابرو ہی کے اشاروں سے تیوروں اور جذبات و تاثرات کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ باکمال مرثیہ خواں کے یہاں یہ اظہار اتنا سچا ہوتا تھا کہ مخاطبین کو کبھی تو اس کی شخصیت بدلی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور کبھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ مرثیہ خواں جو کچھ بیان کر رہا ہے اسے دیکھ بھی رہا ہے۔ دولہا صاحب نے "کی نموداروں پہ چن چن کے نظر غازی نے" پڑھنے کے بعد آہستہ آہستہ گردن گھما کر اہلِ مجلس کی طرف ایسے تیوروں سے دیکھا کہ جس پر اُن کی نظر ٹھہری وہ اپنی جگہ پر سہم کر رہ گیا۔ اس لیے کہ دولہا صاحب کے تیوروں سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی جری سپاہی دشمنوں پر حملہ کرنے سے پہلے ان میں سے اپنے خاص خاص شکار چھانٹ رہا ہے ۹۶؎ اسی طرح مرثیہ خوان نے چشم و ابرو کی مدد سے اپنی

شخصیت تبدیل کرلی۔ آرزو لکھنوی کاایک اور بیان ہے کہ میر اُنس نے جب یہ مصرع پڑھا:

پردہ حرم سرا کا اُٹھا، روشنی ہوئی

تو بائیں ہاتھ سے اشارہ کر کے اُس طرف اِس نظر سے دیکھا کہ تمام حاضرین اُسی طرف دیکھنے لگے ۴۲؎ اس طرح کی مثالیں مرثیہ خوانی کے چہرے کے تاثرات خصوصاً آنکھوں کی اُس کیفیت کی ہیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے واقعی کچھ دیکھ لیا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر کمال کی وہ منزل ہے جہاں حاضرین کو بھی وہی دکھائی دینے لگتا تھا جو اُن کے خیال میں مرثیہ خواں کو دکھائی دے رہا تھا۔ انیس کی زبان سے "شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں" سُن کر بھڑکتے ہوئے شعلے دکھائی دینا اس کی مثال ہے۔

۵۔ بتانا: مرثیہ خواں کا ہاتھوں اور بدن کی جنبشوں کے ذریعے کوئی مضمون ادا کرنا مرثیہ خوانی کی اصطلاح میں "بتانا" کہلاتا ہے۔ ابھی تک مرثیہ خوانی کے جتنے عناصر زیرِ گفتگو آئے ہیں، مہارت کے ساتھ بتانا اُن سب کی اثر آفرینی میں بہت اضافہ کر سکتا تھا۔ میر اُنس نے "پردہ حرم سرا کا اُٹھا، روشنی ہوئی" پڑھتے وقت بائیں ہاتھ سے ایک طرف اشارہ بھی کیا تھا۔ میر نفیس نے "نقاب چہرے سے الٹے ہوئے وہ حورِ سحر" ادا کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے نقاب الٹنے کا اشارہ کیا تھا اور "کہ جیسے شب کو اڑیں جانور ستائے ہوئے" کی خواندگی میں ہاتھوں کو گردش دی تھی۔ ان مثالوں سے ہاتھوں کے ذریعے بتانے کی مختلف صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں اور یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ بتانے سے کلام کی کیفیت کتنی بڑھ سکتی ہے۔ لیک بتانے میں حدّ اعتدال سے بڑھنا معیوب اور اس حدّ اعتدال کا مقرر کرنا مشکل تھا۔ مرانیس کو بتانے میں شائستگی اور اعتدال کا مثالی نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ بدن یا ہاتھوں کو حرکت دینا بہت ناپسند کرتے تھے۔ ایک بار اُن کی موجودگی میں میر اُنس مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ جنگ کے محل پر گھوڑے کے اُلٹ جانے کا ذکر آیا تو جوشِ بیان میں انس کے پیر ذرا سے اُٹھ گئے۔ اس پر میر انیس نے وہیں اُن کو بہت ڈانٹا ۴۳؎ اسی طرح ایک بار اُن کے اخلاف میں سے کسی نے "وہ اٹھا پردۂ در اور وہ حسینؑ آئے" پڑھتے وقت ہاتھ پھیلا کر "وہ" کا اشارہ کیا، لیکن اس بتانے میں اُن کی گردن زیادہ خم کھا گئی۔ میر انیس جو منبر کے پاس بیٹھے تھے بگڑ کر بولے "یہ کاندھی دینا کہاں سے سیکھا ہے" ۴۴؎

شیخ حسن رضا انیس کے "اشارات مہذبانہ" کی تعریف کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اور جنھوں نے افراط تفریط کر کے ہاتھ پاؤں نکالے بھی ہیں وہ عوام الناس میں ممدوح ہوں تو ہوں، لیکن اہلِ تہذیب میں رقصِ منبری کے لقب سے البتہ یاد کئے جاتے ہیں ۴۵۔"

"رقص منبری" کی طنزیہ بہت زیادہ بتانے کے لیے وضع کی گئی تھی۔ اس کی مثال ثابت لکھنوی کا بیان کیا ہوا یہ واقعہ ہے کہ ایک مرثیہ خواں نے مصرع "آیا تھا جھبکتا، یہ دبکتا ہوا بھاگا" اس طرح جھبکنے کے بعد پیچھے کی طرف دبک کر بتایا کہ حاضرین کی ہنسی آخر تک نہ رُک سکی اور وہ مجلس خراب ہو گئی ۴۶۔ پیارے صاحب رشید یہ بتانے کے بعد کہ "انیس کا پڑھنا بہت مہذب تھا" یہ بھی کہتے تھے کہ "آج کل کے پڑھنے والے تو منبر کی چولیں ہلا دیتے ہیں ۴۷۔" یہ واقعہ ہے کہ میر انیسؔ کے بعد مرثیہ خوانی میں بتانے کا چلن بڑھ گیا تھا۔ اس کی ذمہ داری بھی کسی حد تک خاندان انیسؔ ہی پر تھی۔ انیس کے بیٹے نفیس مرثیہ خوانی کے زبردست ماہر تھے لیکن وہ انیسؔ سے کچھ زیادہ بتاتے تھے۔ ایک موقع پر تلوار کھینچنا بتانے کے لیے انھوں نے ہاتھ کو بائیں جانب سے داہنی جانب کھینچا تھا۔ ۴۸ انیس ہاتھ بہت کم (اگر چہ مرزا دبیرؔ سے زیادہ ۴۹) اٹھاتا تھا ۵۰۔ نفیسؔ کے بیٹے عروجؔ نفیس سے بھی زیادہ بتاتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے یہ مصرعہ پڑھا "پشت پر مہر نبوت کی طرح ڈھال بھی ہے" تو "منبر پر گردن سینے تک جھکا کر مرثیہ پشت پر الٹا رکھ لیا تھا" ۵۱ یہ بتانا اتنی خوبصورتی کے ساتھ تھا کہ اہلِ مجلس پھڑک گئے، لیکن اگر میر انیس زندہ اور مجلس میں موجود ہوتے تو اس طرح بتانے پر اپنے پوتے کو ڈانٹ ضرور بتاتے۔ خود انیسؔ نے پھریرے کا لہرانا بتانے کے لیے مرثیے کو "ذرا سا پلٹ دیا تھا۔ یہاں بھی وہ مرثیے کو ذرا پلٹ کر پُشت پر ڈھال دکھا سکتے تھے۔

میر علی محمد عارفؔ میر نفیسؔ کے نواسے یعنی دولہا صاحب عروجؔ کے بھانجے تھے، مگر عمر میں عروجؔ سے بڑے اور بتانے کے ماہر تھے۔ اُن کی خواندگی کا شاہکار اُن کی یہ بیت تھی :

کچھ مُسکرائے زیورِ جنگی سنوار کے ڈالا گلے میں پر تلا ہیکل اتار کے

اس خواندگی کا ایک بیان حسب ذیل ہے :

"اس بیت کو عارف نے اس طرح پڑھا تھا کہ دیکھنے اور سننے والوں کی نظروں کے سامنے ایک مسکراتے ہوئے بچّے کے ننھے ننھے ہاتھوں سے ہیکل اتارنے کی تصویر صاف صاف نمودار ہو گئی۔ یہ نقشہ

انھوں نے اپنے ہاتھوں کی حرکت اور آنکھوں کے چڑھاؤ اتار سے پیش کیا تھا۔ لیکن قیامت کا وہ سماں تھا جب انھوں نے انھیں ہاتھوں سے گلے میں پر تلاڈالا تھا" ۵۱

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عارفؔ نے صورت واقعہ کے مطابق پہلے ہیکل اتارنا، پھر گلے میں پر تلاڈالنا بتایا تھا، درحالے کہ مصرع میں ضرورت شعری کے تحت صورت واقعہ کی ترتیب الٹ کر پہلے پر تلاڈالنا، پھر ہیکل اتارنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عارف کا بتانا الفاظ کے ساتھ نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ مناسب بھی نہیں تھا کہ وہ پر تلے کا ذکر کرتے وقت ہیکل اتارتے اور ہیکل کا ذکر کرتے وقت پر تلاڈالتے، یا پہلے پر تلاڈالتے، بعد میں ہیکل اتارنے کا ذکر کرتے۔ اس مصرع کا صحیح صحیح بتانا اُسی وقت ممکن تھا جب وہ پہلے مصرع پڑھتے، اس کے بعد اشارات سے اس کو بتاتے۔ یہ ایک نئی ایجاد تھی کہ اشارے لفظوں کے ساتھ نہ چلیں بلکہ بعد میں ہوں۔ عارفؔ اور اُن سے بڑھ کر عروجؔ نے اس طرز میں کمال کے جوہر دکھائے۔ "کی نموداروں پہ چن چن کے نظر غازی نے" پڑھ کر عروج کا اہلِ مجلس کی طرف باری باری دیکھنا بھی پڑھنے کے بعد بتانے کی مثال ہے۔ اس طرز میں مقبولِ عام ہونے کی بڑی گنجائش تھی اور غالبًا بتانے کے اِسی انداز کی وجہ سے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ عروجؔ انیسؔ سے بھی بہتر پڑھتے ہیں۔ عروجؔ کے معاصرین اور بعد کے پڑھنے والے اُن کے طرز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ پیارے صاحب رشید کے نواسے اور شاگرد سید سجاد حسین شدیدؔ مرحوم نے مجھے بتایا کہ شروع میں کچھ عرصے تک وہ رشید کے انداز میں خوانداری کرتے رہے لیکن عروجؔ کا رنگ اتنا چھا چکا تھا کہ مرثیہ خوانی کے دوسرے رنگ اس کے مقابلے میں پھیکے معلوم ہوتے تھے، لہٰذا انھوں نے کچھ انداز عروجؔ کا بھی اختیار کیا۔

شدیدؔ مرحوم ہمارے دور کے سب سے اچھے پڑھنے والوں میں تھے اور میں نے اسے بزرگوں کی بھی ان کی خواندگی کی تعریف کرتے سنا ہے جو عروجؔ اور عارفؔ کو سنے ہوئے تھے، لیکن مرثیہ خوانی کا وہ فن جو سحر کا اثر پیدا کرتا تھا، یکم مئی ۱۹۳۰ء کو ختم ہو گیا جب دولہا صاحب عروجؔ نے مرنے سے تین دن پہلے درگاہِ حضرت عباسؑ لکھنؤ میں اپنی آخری مجلس پڑھی تھی۔

حواشی

ا، ۲۔ "میرانیس کی خوش آوازی، خوش بیانی اور مرثیہ خوانی" مسعود حسن رضوی ادیب (انیسیا) مصرعے:
"شعلے تیری تلاش میں باہر نکلتے ہیں" (انیس) "نقاب چہرے سے الٹے ہوئے وہ حور سحر" (نفیس)

۳۔ مسموع از سید نظیر حسین رضوی الہ آبادی مرحوم، مصرع اغلباً "وہ بلندی پہ ستارہ سا چمکتا ہے۔ علم" (عروجؔ)

۴۔ میر انس کے پڑھنے کی ایک مجلس چشم دید بیان، شیخ ممتاز حسین جون پوری (اخبار "سرفراز لکھنؤ)

۵۔ "سبع مثانی" مرتبہ میر فراز حسین خبیر لکھنوی (مقدمہ از سید افضل حسین ثابت لکھنوی)

۶۔ "سخن دان ارس: محمد حسین آزاد ص ۱۵۸

۷۔ "خوش معرکہ زیبا" سعادت خاں ناصر ص ۳۰۳

۸۔ "شعر و داستان وغزل": سید علی حیدر نظم طباطبائی (ماہنامہ "ادبی دنیا" لاہور)

۹۔ "آب حیات" محمد حسین آزاد ص ۱۰۶

۱۰۔ "فسانہ عجائب": مرزا رجب علی بیگ سرورؔ دیباچہ مصنف

۱۱۔ سید محمد نصرت علی دہلوی بتاتے ہیں کہ تحت اللفظ مرثیہ خوانی کا رواج "بہت زمانے سے تھا مگر شاہانِ اودھ کے وقت سے اس کو زیادہ فروغ ہوا" (تاج التواریخ)

۱۲۔ مثنوی "مظہر العجائب" سید مظفر حسین ضمیر۔ ص ۲۷ تا ۳۰

۱۳۔ "حیات دبیر" (ا) سید افضل حسین ثابت دیباچہ صفحہ ۱۸

۱۴۔ "دربار حسین" سید افضل حسین ثابت ص ۲

۱۵۔ "محمد حسین آزاد" جلد دوم۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۲۵ (مکتوب شریف العلما مولوی سید شریف حسین بہ نام محمد حسین آزاد جس میں خلیق و انیس کے حالات بیان کیے گئے ہیں)

۱۶۔ "آب حیات" ص ۲۶۰ (میر خلیق کی ایک مجلس کا بیان)

۱۷۔ "فکر بلیغ" شادؔ عظیم آبادی (نسخہ ادیب) ص ۸۴۔ ۱۴۷ (مرزا دبیر کے طرز خواندگی کا بیان)

۱۸۔ حیات دبیر (ا) ص ۵۹

۱۹۔ "محمد حسین آزاد" : جلد دوم (مکتوب شریف العلما

۲۰۔ "حیات انیس" : سید امجد علی اشہری ص ۲۵۴ (سالک بتاتے ہیں کہ انیس نے ان کے سامنے مومن خاں کا یہ شعر پڑھا" نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی + بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی " پڑھنے کے بعد ایک چپ سی لگ گئی جیسے کوئی حسین صورت سامنے ہے اور ہوا سے اسکی زلف اڑ رہی ہے اور میر صاحب اس کو دیکھ کر ادائے کلام کے مزے لے رہے ہیں")

۲۱۔ "حضرت رشید" سید آغا اشہر لکھنوی ص ۴۱ (حمید بتاتے ہیں کہ انیس نے مصرع "وہ اپنے شغل میں ہیں، بال ادھر کھولے ادھر باندھے" اپنے دونوں ہاتھ کانوں کے پاس لے جاکے اور چاروں انگلیوں کو یکے بعد دیگرے ایک زوری حرکت دے کے ......اس طرح ادا کیا کہ اب تک وہ تصویر آنکھوں کے سامنے ہے۔ واقعی میر صاحب پڑھتے کیا تھے شعر کی تصویر کھینچتے تھے")

۲۲۔ "آب حیات" ص ۲۷۰ اور "حضرت رشید" ص ۱۰۹

۲۳۔ "آب حیات" ص ۳۷۰

۲۴۔ "حیات دبیر" (۱) ص ۵۵، ۵۶

۲۵۔ میر انیس کی خود آوازی، خوش بیانی اور مرثیہ خوانی ۲ "ذکر بلیغ": ص ۳۵۲

۲۶۔ "میر انیس کی خود آوازی، خوش بیانی اور مرثیہ خوانی" (بیان آرزو لکھنوی)

۲۷۔ "آب حیات" ص ۵۲۴ سے "میری انیس کی خوش آوازی، خوش بیانی اور مرثیہ خوانی"

۲۸۔ "عروج سخن" (مراثی عروج) مقدمہ از سید مسعود حسن رضوی ادیب

۲۹۔ "فکر بلیغ" ص ۲۵۳

۳۰۔ دبستان عشق کی مرثیہ گوئی" ڈاکٹر جعفر رضا ص ۲۷۷

۳۱۔ مکتوب میر مہر علی انس بہ نام حکیم سید علی دولھی پور (ذخیرہ ادیب لکھنوی)

۳۲۔ "سوانح عمری عروج" از سید حسن رضا عرف جھمن (مشمولہ "دولہا صاحب عروج": مرتبہ نیر مسعود) ص ۴۱

۳۳۔ "عروج کی تین مجلسیں" از مرزا جعفر حسین (شمولہ "ادبیات و شخصیات")

۳۴۔ قاعدہ تحت لفظ خوانی" سید مہدی حسن ص ۳

۳۵۔ "حیات دبیر" (ا) ص ۵۹

۳۶۔ "دولہا صاحب عروج" مقدمہ مرتب

۳۷۔ "میر انیس کی خوش آوازی، خوش بیانی اور مرثیہ خوانی

۳۸۔ میر انیس کی خوش آوازی، خوش بیانی اور مرثیہ خوانی

۳۹۔ "قاعدہ تحت لفظ خوانی" ص ۷

۴۰۔ "حال فارغ" حکیم سید نہال حسین سیتاپوری ص ۵

۴۱۔ مسموع از سید مسعود حسن رضوی ادیب

۴۲۔ میر انیس کی "خوش آوازی، خوش بیانی اور مرثیہ خوانی"

۴۳۔ مسموع از سید سجاد حسین شدید

۴۴۔ مضمون "میر ببر علی مرحوم و مغفور" زبدۃ العلماسید آغا مہدی لکھنوی (شمولہ "انیس")

۴۵۔ "تردید موازنہ" شیخ حسن رضا ص ۳۹

۴۶۔ "حیات دبیر" (ا) : ص ۴۳۲

۴۷۔ "حضرت رشید" ص ۱۰۹

۴۸۔ "طرز کلام دبیر کا مقابلہ ملٹن شاعر سے" از حامد علی (مشمولہ حیات دبیر "ا")

۴۹۔ "میر انیس کے کچھ چشم دید حالات" مسعود حسن رضوی ادیب (انیسیات)

۵۰۔ "آب حیات" ص ۴۷ ۷ عروج کی تین مجلسیں

۵۱۔ "قدیم لکھنؤ کی آخری بہار": مرزا جعفر حسین ص ۳۰۹

❁❁❁

الحاج پروفیسر سید مجاور حسین رضوی

امانت و دیانت کا سبق

اس وسیع و عریض کائنات میں کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جن کا عمل اُن کی ذات تک محدود رہتا ہے، کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے مخصوص دَور میں دوسروں کے لئے مثال یا نمونہ بن جاتے ہیں لیکن آنے والا وقت ان کے عمل کے روشن نگینوں پر گرد ڈال دیتا ہے اور یہ گرد اس لیے پڑ جاتی ہے کہ اُن کا عمل مخصوص معاشرے اور مخصوص تہذیب کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے جب وہ معاشرہ اور تہذیب ختم ہو جاتی ہے تو اُن کا عمل بھی ذہن سے فراموش ہو جاتا ہے مگر اللہ کے کچھ منتخب بندے ایسے ہوتے ہیں جن کا عمل ساری کائنات کے لیے حجت ہوتا ہے چونکہ اُن کے عمل کی اساس وقت کی پابندی نہیں ہوتی اور حدودِ زماں و مکاں سے ماورا ہوتی ہے اس لیے کتنے ہی انقلابات آئیں، تغیرات ہوں، تبدیلیاں ہوں، ان کا عمل منارۂ نور کی طرح روشن رہتا ہے اور دنیا کے لیے راہِ ہدایت اور وسیلۂ نجات بنتا ہے۔

انہی افراد کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے ان کے درجات اور سطحیں مختلف ہوتے ہیں کبھی نبی کہہ کر یا کبھی رسول کہہ کر، کبھی امام کعبہ کہہ کر ان کا تعارف کرایا جاتا ہے مگر ان سب کا مقصد و مشن ایک ہوتا ہے اور وہ مشن ہوتا ہے "دنیا کے سامنے ایک اعلیٰ معیار پیش کرنے کا"۔ ایک اور پہلو پر غور کر لینا چاہیئے۔ عمل اگر نظریہ اور علم نہیں رکھتا تو پھر وہ ایک ذات تک محدود ہو جاتا ہے بے شک اُس کو جزاء ملے گی لیکن وہ ماضی کی شئے بن جاتا ہے مستقبل کو اپنی گرفت میں نہیں لے پاتا۔ وہی عمل مستقبل پر محیط ہو جاتا ہے جس کی اساس علم اور آگہی، بصیرت و معرفت پر ہوتی ہے ایک اور پہلو کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے اور وہ یہ کہ الفاظ کی قدر و قیمت عمل سے ہی ظاہر ہوتی ہے۔ کوئی بھی پیغام، کوئی بھی درس، کوئی تصور، کوئی اُصول ۔ بے شک لفظوں کا پیکر ہوتا ہے لیکن اگر اس کے اندر عمل خون بن کر نہیں دوڑ رہا ہے تو پھر وہ الفاظ لاش کی طرح نظر آتے ہیں۔ ایسی لاش جسے مسالہ لگا کر تابوت میں رکھ دیا گیا ہو۔ لیکن جب

الفاظ کا مفہوم عمل سے ظاہر ہوتا ہے اور عمل، الفاظ کی شناخت کراتا ہے تو پھر الفاظ خود بولنے لگتے ہیں اور اس طرح بولتے ہیں کہ اُنہیں سنتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ حدودِ وقت سے کوئی آگے نکل گیا ہے۔

نہج البلاغہ - امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ارشادات، خطبات، فرمودات و مکتوبات کے مجموعہ کا نام ہے اور علماء کے نزدیک قرآنِ حکیم کے بعد دنیا کی سب سے بڑی کتاب ہے جسے فصاحت اور بلاغت کا شاہکار سمجھا جاتا ہے حالاں کہ یہ الفاظ یعنی فصاحت و بلاغت و شاہکار انسانی عجز کا اظہار ہے اور اس کتاب کی صحیح خوبی و معرفت کا اندازہ صرف ان الفاظ سے نہیں لگایا جاسکتا۔ دراصل انسان کا یہی عجز اسے امام کا اعجاز کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اربابِ شریعت کی نظر میں میرے یہ فقرے مناسب سمجھے جائیں گے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مجھ پر غلو کا الزام آئے اور میری کم علمی صحیح لفظ کے اظہار سے قاصر ہو لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ نہج البلاغہ قرآنِ حکیم کی لفظی و معنوی توسیع ہے قرآن میں متشابہات ہیں، مجازات ہیں، نہج البلاغہ میں علامتیں ہیں، تمثیلات ہیں اور استعارات ہیں -اگر فرق ہے تو یہی کہ وہ اللہ کا کلام ہے اور یہ اللہ کے اس بندے کا کلام ہے جسے خود قدرت نے لسان اللہ کہا ہے جیسے جیسے وقت گزرتا ہے انسانی علوم اور انسانی بصیرت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے نہج البلاغہ کی معرفت بڑھتی جاتی ہے۔ آج مغرب نہج البلاغہ کے ترجمے پڑھ کر انگشت بدنداں ہے کہ جو مسائل اُسے آج درپیش ہیں اُن مسائل کا ادراک چودہ سو سال پہلے عرب کی نیم ترقی یافتہ سوسائٹی میں کرلیا گیا تھا اور نہ صرف ادراک کرلیا گیا تھا بلکہ اُن مسائل کا حل بھی بتلادیا گیا تھا۔

نہج البلاغہ میں پھیلے ہوئے لاکھوں موضوعات میں سے ہر ایک موضوع پر لاکھوں صفحات لکھے جاسکتے ہیں۔ اگر میں بھی سعد الدین تفتہ زانی ہوتا یا محمد بن عبدہ ہوتا تو حقِ تشریح ادا کرپاتا۔ میری کج مج بیانی دراصل اُس عظیم بارگاہ میں اعترافِ عجز ہے اور اپنی فہم نارسا کا اقرار ہے لیکن آج کی دنیا کو متوجہ کرنے کے لیے شاید یہ سطور بھی کافی ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے دورِ حکومت سے متعلق پہلا واقعہ حضرت عقیل کا ہے۔ دو واقعات کا ذکر ضروری ہے۔ ۱۔ جب آپ نے امام سے ایک صاع گیہوں بیت المال سے طلب کیا۔ ایسے عالم میں کہ ان کے بچوں کے بال پریشان اور فقر و فاقہ کی وجہ سے رنگ بدلے ہوئے تھے۔

امیر المومنین نے انہیں گیہوں نہیں دیا بلکہ لوہے کا ایک ٹکڑا آگ میں تپا کے اُن کے جسم کے قریب لے گئے اور وہ چیخ اُٹھے۔ اور تب فرمایا کہ تم دنیا کی آگ سے ڈرتے ہو اور میں جہنم کی آگ سے نہ ڈروں؟
یہاں اتنے پہلو قابلِ غور ہیں۔

۱) حضرت عقیل پریشان حال تھے

۲) امیر المومنین کے ہاتھ میں اقتدار تھا

۳) یہ طرز عمل اُس شخص کا تھا جس نے خطبہ ۱۴۲ میں فرمایا "جسے اللہ نے مال دیا ہے اُسے چاہیے کہ قرابت داروں سے صلہ رحمی کرے۔ خستہ حالوں کو اُن کی مصیبت سے نجات دلائے، قرض داروں پر بخشش کرے۔ امیر المومنین نے یہ دولت کا مصرف بتلایا ہے۔ اِس روشنی میں اتنی باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔

۱) کہ دولت کا مصرف صلہ رحمی بے شک ہے لیکن اسی دولت کا مصرف جو ذاتی دولت میں شمار ہو اور اُس وقت جب بظاہر دنیاوی اقتدار امیر المومنین کے پاس تھا تو آپ کے پاس کوئی ذاتی ملکیت نہ تھی۔

۲) اسلامی مملکت کے سربراہ کے پاس کوئی ملکیت نہ تھی۔ اتنا نہ تھا کہ اپنے حقیقی بھائی کو ایک صاع گیہوں دے سکیں۔ اب اِسے آج کے دور میں دیکھیے۔ جب سربراہِ مملکت مختلف ملکوں میں اپنے ذاتی اکاونٹ رکھتا ہے۔ آرام و تعیش کے سارے اسباب فراہم کرتا ہے اور دنیا کے سربراہانِ مملکت کا یہ طریقِ کار امانت و دیانت کے خلاف ہے اِس لیے کہ وہ عوام کی ملکیت کے نگراں ہوتے ہیں اور نگراں کو حقِ تصرف وہی دے سکتا ہے جس کی وہ ملکیت ہے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ جس کی ملکیت ہو وہ خود تصرف نہ کرے اور دوسروں کو عیش و آرام کی اجازت دے اور اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ اسلام میں تقسیم دولت کا جو اصول تھا وہ اقربا پروری، اور خویش نوازی کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ جس کی وجہ سے طبقات اور ٹولے اور دولت مندوں کا خاندان بن سکے۔ آج کی سوسائٹی میں منسٹر کی دُور سے بھی رشتہ داری ہے، خودرو پودوں کی طرح کوٹھیاں اُٹھنے لگتی ہیں لیکن کیا کہنے جس نے لفظ "امانت" کو اپنے اس عمل سے ایسی معنویت عطا کی کہ یہاں لفظِ امانت خود بول رہا ہے، متحرک ہے۔

ایک اور پہلو۔ امیر المومنین اپنے طرزِ عمل سے جہاں امانت کے لفظ کی معنویت اور گہرائی کی

طرف متوجہ کر رہے ہیں اور اپنے کلام سے لفظ "امانت" کی تشریح کر رہے ہیں وہیں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں امانت کا تسلسل ہے اور اُس تصوّر کی اہم ترین کڑی امیر المومنین کی ذات گرامی۔ امانت کا نقطۂ اوّل ذات باری ہے جس نے جبرئیل کو امین وحی بنا کر بھیجا اور دنیا کو امانت کی عظمت سمجھائی امانت کا دوسرا نکتہ رسالت ختم المرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں جو اعلانِ رسالت سے قبل بھی عرب میں امین کے لقب سے مشہور تھے اور رسالت کے بعد بھی امین رہے۔ جس طرح اطیعو ا اللّٰہ کے بعد اطیعو الرسول اور پھر اولو الامر۔ اُسی طرح امانت کی بھی یہ تین کڑیاں ہیں۔ اللہ، رسول اور علی۔

اسی خطبہ کا دوسرا واقعہ - "دیانت" سے متعلق ہے عام طور پر امانت سے مراد ہے۔

۱) کسی شئے کا موجود ہونا ۲) اُس شئے کا کسی اور کا ہونا

۳) کسی کا اُس شئے پر نگران ہونا اور ۴) جس کی ملکیت ہے اُس کو ویسے ہی پلٹانا۔ اس طرح امانت میں تین کردار ہوں گے۔ شئے، مالک اور نگراں۔ مگر دیانت۔ ! صرف ایک فرد سے متعلق ہے اس میں مال کا لوٹانا شامل نہیں۔ امیر المومنین کو کسی شخص نے رات میں تحفہ لا کر دیا۔ یہ تحفہ ہدیہ نہ تھا۔ تحفہ اُسی وقت دیا جاتا ہے جب کسی کے عمل سے خوشی حاصل ہوئی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تحفہ علی الاعلان دیا جاسکتا ہے۔ رات کی تاریکی میں تحائف دینے کا مطلب کچھ نفع حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ایک طرح کا دباؤ۔ مروّت کا دباؤ کہ جسے تحفہ دیا گیا ہے اُس سے اپنی مرضی کے مطابق کام بھی لیا جاسکے۔ مروّت، شرطِ انسانیت ہے لیکن جب عدل و انصاف سے ٹکرائے تو مروت اور پاسداری، جانب داری (جسے Partiality کہتے ہیں) اور تحفہ رشوت بن جاتا ہے۔ سربراہِ مملکت میں اتنی دیانت، فہم و فراست ہونی چاہیے کہ وہ اس طرح کے تحائف کی نوعیت سے باخبر ہو اور یہ نہیں ہے کہ یہ کوئی الگ تھلگ ایک واقعہ ہے بلکہ اس میں ایک تسلسل ہے۔ حضرت عثمان بن حنیف عامل بصرہ کے نام فرمان حکومت میں لکھتے ہیں جس کے جستہ جستہ فقرے پیش کیے جارہے ہیں۔

"بصرہ کے کسی بڑے آدمی نے تمہیں لالچ میں بلایا۔ جہاں تمہارے لیے رنگارنگ نفیس کھانے کا انتخاب کیا گیا۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ تم ایسے لوگوں کے کھانے کی دعوت قبول کرلو گے جن کے ہاں غریبوں کو پھٹکنے بھی نہیں دیا جاتا۔ تمہارا امام وہ ہے جس نے دنیا کے مال و متاع میں اپنی دو پھٹی

پرانی چادروں اور کھانوں میں سے اپنی کمائی ہوئی دو روٹیوں پر اکتفاء کر رہا ہے۔"

"اگر میں چاہتا تو اس شہد مصفیٰ خالص گیہوں اور ریشمی پارچاجات کی اپنے مصرف میں لانے کی راہ نکال لیتا لیکن کیا مجال کہ مجھ پر خواہشات نفسانی غالب آتی۔ میں تورات کو پیٹ بھر کر سو جاؤں اور بھوکے پیٹ اور پیاسے کلیجے میرے آس پاس تلملاتے پڑے رہیں!"

خطبہ نمبر ۲۲۴ کے آخر میں اس کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ جو تحفہ دینے والا تھا وہ آپ سے کوئی ایسا کام لینا چاہتا تھا جس سے کسی کی حق تلفی بھی ہوتی تھی۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

"خدا کی قسم اگر ساتوں اقلیم میں اِن چیزوں سمیت جو آسمانوں کے نیچے ہیں مجھے دے دی جائیں صرف اس جرم کے عوض کہ میں چیونٹی سے جَو کا ایک چھلکا چھین لوں تو ایسا کبھی نہ کروں گا"۔

یہ امانت و دیانت کے دو سبق تھے جو بظاہر اخلاقیات تک محدود معلوم ہوتے ہیں لیکن در حقیقت جن میں سیاسیات اور حکمراں کا تصور بھی موجود ہے جس میں معاشیات کے اعلیٰ اخلاقی اقدار بھی کار فرما نظر آتے ہیں جو اپنے دَور میں بھی اہم تھے۔ اُس دور میں جب قبائلی نظام تھا اور آج کے دور میں بھی جب جمہوری نظام ہے ان اصولوں کی اور اس عمل کی اتنی ہی ضرورت ہے اور یہ ضرورت کسی ایک طبقہ کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی انفرادی زندگی میں امانت و دیانت کی اتنی ہی ضرورت ہے معجز نما کلام کا یہی خاصہ ہے کہ جز پر بھی اتنا ہی محیط ہوتا ہے جتنا کل پر۔ وہ قطرہ میں دجلہ دیکھتا ہے اور دجلہ سے پانی کی بوند نکال لیتا ہے۔

جب تک دریاؤں میں روانی رہے گی اور آفتاب و ماہتاب طلوع و غروب ہوتے رہیں گے اور آسمان کے ستارے ایک دوسرے کی طرف جھکتے رہیں گے اُس وقت قول و عمل کے اس آہنگ کا سرمدی نغمہ کائنات میں گونجتا رہے گا اور انسانوں کو دعوتِ عمل دیتا رہے گا۔"[۲]

حواشی :

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۲۲۱

۲۔ ،، ،، مکتوب نمبر ۴۵

❀❀❀

ڈاکٹر سید محمد مثنیٰ رضوی

ابن مسکویہ کا فلسفہ اخلاق

فلسفہ اسلام کی تاریخ میں جن حکماء اور مفکرین کو نمایاں حیثیت حاصل ہے ان میں ابن مسکویہ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ابن مسکویہ کے افکار وخیالات پر فارابی سے زیادہ کندی کا اثر محسوس ہوتا ہے لیکن فارابی کی طرح ابن مسکویہ پر بھی یونان کی حکمت بالخصوص ارسطو کے فلسفیانہ تصورات کا گہرا اثر تھا۔اس لئے یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ وہ فارابی کے اثر سے بالکل محفوظ تھا۔ابن مسکویہ فلسفہ اسلام کی دنیا میں اپنے نظریہ اخلاق کے لئے خاص طور پر مشہور تھے۔ مشرق میں اس کا ذکر آج تک بڑے احترام سے کیا جاتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک ممتاز ادیب، بلند پایا متکلم اور اعلیٰ درجے کا مفکر تھا لیکن اس کے افکار میں مرکز اور بنیادی حیثیت اس کے فلسفہ اخلاق ہی کو حاصل ہے۔

ابن مسکویہ کا نام احمد اور کنیت ابو علی ہے۔[1] ان کے باپ کا نام محمد تھا اور دادا کا نام یعقوب۔ کہا جاتا ہے کہ یعقوب پہلے مجوسی تھے بعد میں ایمان لائے اور مسلمان ہوگئے۔ ابن مسکویہ کی ولادت کب اور کہاں ہوئی اس کے بارے میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی لیکن چونکہ ابن عمید کے دربار سے ان کی وابستگی عنفوان شباب میں ہوئی تھی اور یہ تعلق ۳۵۲ھ کے بعد ہوا تھا اس لئے قرین قیاس یہی تھا کہ وہ ۳۲۵ھ اور ۳۳۰ھ کے درمیان کسی سنہ میں پیدا ہوئے ہوں۔ انھوں نے لمبی عمر پائی اور نو صفر ۴۲۱ھ کو ان کا انتقال ہوا۔[2] انھوں نے اپنے قصیدوں میں اپنے بڑھاپے کا تذکرہ کیا۔

فطاب لی هرمی والموت يلخطنی　　لخطا المعريب ولو لاانت لم يطب

(میرا بڑھاپا اچھی حالت میں گذرا، حالانکہ موت میری تاک میں ہے، اگر تو نہ ہوتا تو وہ اچھی حالت میں گزرتا)

ابن مسکویہ کی زندگی کا ابتدائی دور میں گزرا۔ اس زمانے میں ان کو علمی کاموں سے کوئی

دلچسپی نہیں تھی۔ ان کو بعد میں اس بات کا بڑا رنج اور افسوس تھا کہ کے قیام کے زمانے میں ابو القاسم الکاتب غلام ابی الحسن جیسے علم منطق کے ماہر سے بھی کوئی استفادہ نہیں کیا۔ انھوں نے ابو سلیمان منطقی کو بھی دیکھا تھا لیکن ان کے علم و فضل سے بھی انھوں نے کچھ نہیں حاصل کیا۔ ان کی دلچسپی زیادہ تر کیمیا سازی سے تھی۔ مورخوں کا خیال ہے کہ ابن مسکویہ جن دنوں شیراز میں عضد الدولہ کے قائم کردہ کتب خانے کے نگراں اور مہتمم تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے ذاتی مطالعے اور لگن سے علم و فضل میں کمال حاصل کیا۔ ان کا تعلق ہمیشہ ارباب حکومت سے رہا۔ دیلمیوں کی سلطنت تین حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ تین بھائی ان پر الگ الگ حکومت کرتے تھے۔ ابن مسکویہ تینوں حکومتوں کے ارباب اقتدار سے ربط و تعلق رکھتے تھے۔ اس زمانے میں فصاحت و بلاغت اور انشاء پردازی سے مراد سلاطین کو بڑی دلچسپی تھی اور ابن مسکویہ کو ان میں کمال حاصل تھا اس لئے دربار شاہی سے ان کا تعلق بالکل فطری تھا۔ عضد الدولہ کے انتقال کے بعد ابن مسکویہ نے ابن عمید کے دربار میں بھی بڑی مقبولیت حاصل کی ان کی یہ قدر و منزلت آخر تک قائم رہی۔ ان کو اپنی علمی حیثیت جاہ و منصب کی برتری اور اخلاقی مرتبے کا شدت سے احساس تھا۔ چنانچہ انھوں نے کئی بار صاحبان اقتدار کی دعوت اور پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی خودداری کے دامن کو داغدار نہیں ہونے دیا۔

اپنے معاصرین میں شیخ ابو علی سینا سے ان کے خصوصی تعلقات تھے۔ ان دونوں میں اکثر علم و حکمت کے مسائل پر بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ اس مسئلے میں ایک دلچسپ واقعے کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا۔ ابن مسکویہ اپنے تلامذہ کو درس دے رہا تھا کہ شیخ پہنچا۔ اس نے ابن مسکویہ کی جانب ایک اخروٹ پھینکا اور ایک مخصوص طریقے سے اس کی پیائش کرنے کے لئے کہا۔ ابن مسکویہ کو یہ انداز ناگوار ہوا۔ انھوں نے شیخ سے کہا کہ پہلے اپنے اخلاق کی اصلاح کیجئے پھر میں اخروٹ کی پیائش کروں گا۔ (شہر زوری ۲۴)

دربار شاہی سے وابستہ رہنے کے باعث ابن مسکویہ کا عہد شباب تمام تر عیش و عشرت میں گزرا لیکن عمر کے ڈھلنے اور علم و فن کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی توجہ آہستہ آہستہ انسانی اخلاق کی عظمت اور خوبی کی طرف زیادہ مبذول ہوتی گئی۔ چنانچہ، تہذیب الاخلاق میں اس نے اس پہلو کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

"جس شخص کے باپ نے اس کی تربیت اس طرح کی ہو کہ وہ فخر اشعار کی روایت کرے، ان کی جھوٹ باتوں کو قبول کرے، ان میں جو برائیاں اور لذت پرستی کے طریقے ہیں ان کو پسند کرے جیسا کہ امرالقیس اور نابغہ وغیرہ کے اشعار میں پائی جاتی ہیں۔ پھر اس کے بعد ان کو ایسے رؤسا کی صحبت حاصل ہو جو ان اشعار کی روایت یا ایسے ہی اشعار کہنے پر اس کو اپنا مقرب بنائیں اور اس کو عطیے دیں، پھر ایسے دوستوں سے اس کو سابقہ پڑے جو لذت پرستی میں اس کی اعانت کریں اور اس طرح اس کا میلان اچھے کمانے پہننے، سواریوں کی زیب وزینت، قومی گھوڑوں اور عمدہ غلاموں کی طرف ہو جائے۔ جیسا کہ بعض اوقات مجھ کو ہوا، پھر وہ ان چیزوں میں منہمک ہو جاتے اور وہ جس سعادت کا اہل ہے اس سے منہ موڑ لے تو اس کو چاہئے کہ ان کو بدبختی سمجھے، نعمت نہ سمجھے، نقصان سمجھے فائدہ نہ سمجھے، اور آہستہ آہستہ ان کو چھوڑنے کی کوشش کرے، اگرچہ بہت مشکل ہے، لیکن باطل میں پڑے رہنے سے بہر حال بہتر ہے، اس کتاب کے پڑھنے والے کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے بتدریج بڑے ہونے اور عادت کے مستحکم ہو جانے کے بعد ان چیزوں کو چھوڑا ہے، اور اس معاملے میں اپنے نفس سے بڑا جہاد کیا ہے، پس اے وہ شخص جو فضائل کی جستجو کر رہا ہے، اور ادب حقیقی کا طالب ہے۔ میں نے تیرے لئے وہی فضائل پسند کیے ہیں جن کو میں نے اپنے لئے پسند کیا ہے، بلکہ تیری نصیحت میں میں اس سے آگے بڑھ گیا ہوں، اور ایسے فضائل کی طرف اشارہ کیا ہے جو ابتداء میں مجھ کو حاصل نہ ہو سکے تاکہ تو اس کو حاصل کر سکے"[۳]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابن مسکویہ نے اخلاقی اور روحانی تہذیب و تربیت کے لئے زبردست ریاض اور جدوجہد کی۔ ان کے وصیت نامے سے قول و عمل کی ہم آہنگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ابن مسکویہ نے ریاضیات، طبعیات، الہیات، کیمیا، منطق، طب، فلسفہ غرض کہ تمام مروجہ علوم پر رسالے لکھے۔ لیکن حکمت کے جس شعبے کی طرف اس نے خاص طور پر اپنی توجہ مبذول کی وہ فلسفہ اخلاق ہے۔ دراصل وہ یونان کے عظیم المرتبت فلسفی ارسطو کی ان تحریروں سے بے حد متاثر تھا جو انسان کے اخلاقی پہلوؤں سے بحث کرتی ہے اور نفس کی اصلاح و تہذیب پر زور دیتی ہیں۔

انھوں نے فلسفے کے درس و تدریس اور تعلیم کی ابتداء منطق، استدلال، برہان اور استخراج

کے بجائے مسائل اخلاق کے مباحث سے کی کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ طالب علم کا نفس جب تک تربیت یافتہ اور مہذب نہیں ہوگا اس میں فلسفیانہ نکات کو قبول کرنے اور جذب کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوسکتی۔

ابن مسکویہ نے فلسفہ اخلاق کے باب میں جو کتابیں تصنیف کیں ہیں ان میں سے چند اہم کتابوں کے نام اس طرح ہیں۔(۱) کتاب ترتیب والسعادات (۲) کتاب السیہ (۳) الفوزالاصغر (۴) الفوزالاکبر (۵) کتاب آداب العرب والفرس (۶) تہذیب الاخلاق۔[۴]

ان کتابوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ابن مسکویہ کے فلسفہ میں شرح اسلامی کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ارسطو اور افلاطون کے تصورات کے اثرات بھی ملے جلے ہیں۔اس نے اپنے فلسفہ اخلاق کا آغاز نفس کی حقیقت اور ماہیت کے ذکر سے کیا ہے۔اسکی نظر میں انسان کے اندر ایک مستقل اور لطیف جوہر ہے جو نہ تو جسم رکھتا ہے اور نہ عرض۔اس میں ایسی صفات اور خصوصیات پائی جاتی ہیں جو انسان کو دوسرے حیوانوں سے الگ اور متمیز کرتی ہیں۔ نفس انسانی اپنے وجود اور اپنے علم و عمل کا شعور رکھتا ہے روح کا علم و عمل تمام عالم محسوسات سے بدرجہا وسیع ہے روح ایک ایسے ذہنی اور معقول علم کی حامل ہے جس کی مدد سے وہ حق و باطل میں امتیاز کرتی ہے اور حواس کی نگرانی اور پاسبانی کرتی ہے۔ ابن مسکویہ کے نزدیک انسانی روح دوسرے حیوانوں کی روح سے اس بنا پر ممتاز ہے کہ مقبولیت پر مبنی غور و فکر کو زندگی بسر کرنے کا ضابطہ اور دستور بتاتی ہے۔ جس کا اصل مقصد حصول خیر ہے۔ خیر کے ذریعے انسان اپنی زندگی کا مقصد حاصل کرتا ہے یا اس کی تکمیل کو منزل تک پہنچاتا ہے۔سرشت کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان طبائع کا اختلاف فطری ہے لیکن ایسے لوگ جو اپنی زندگی کی ابتدائی منزل میں نہ تو نیک ہوتے ہیں اور نہ بد۔ آگے چل کر صحبت اور تعلیم و تربیت کے اثر سے دونوں میں سے کوئی ایک اثر قبول کر لیتے ہیں۔اچھی صحبت اور اچھی تعلیم و تربیت نفس کی تہذیب و اصلاح کا کام کرتی ہے۔

مجموعی طور پر ابن مسکویہ کے نزدیک ایک اچھا یا نیک انسان کہلانے کا وہ مستحق ہوتا ہے جس کے اعمال اور افعال انسانیت کے آدرش اور معیار کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ نیکی یا اچھائی انسان کی مخصوص اور امتیازی صفت ہے لیکن سبھی انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ لازمہ انسانیت

ہونے کے باوجود مختلف انسانوں میں نیکی کے درجے مختلف ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے یہ اچھائی یا سعادت سب کے لئے یکساں نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں ابن مسکویہ نے انسان کی سماجی زندگی سے اخلاق کے بنیادی تعلق پر مفصل بحث کی ہے اور بڑے مفید نتائج نکالے ہیں۔

ابن مسکویہ کی نظر میں جو شخص بنی نوع انسان سے الگ رہ کر تنہائی میں بسر کی جانے والی زندگی کا انتخاب کرے گا اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ تمام نیکیوں کو حقیقت کی شکل میں ڈھال سکے۔ اس سے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ابن مسکویہ کے نزدیک نیکی، خیر اور سعادت کی بنیاد بنی نوع انسان کی محبت ہے۔ انسانیت کی تکمیل معاشرتی زندگی میں ہی ممکن ہے۔ انسانی محبت اور معاشرت دونوں کو ابن مسکویہ لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی محبت کے بغیر انسانی سماج کا تصور ممکن نہیں اور معاشرے کے بغیر انسانی محبت کا تصور بے معنی ہے۔ انسان جب دوسروں کے ساتھ رہ کر زندگی بسر کرتا ہے تب ہی اس کی شخصیت اعلیٰ مدارج طے کر کے اس جانب گامزن ہوتی ہے جس کو ہم شخصیت کی تکمیل کہتے ہیں۔ ابن مسکویہ کے تصور اخلاق پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ فلسفہ اخلاق دراصل معاشرتی اخلاق کا نظریہ یا علم ہے۔ محبت، خدمت، ایثار اور دوستی بلکہ یوں کہیے کہ ہر نیکی یا سعادت کے عملی اظہار کا موقع صرف سماجی زندگی یا مدنی جماعت کے اندر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ معاشرتی زندگی سے اپنے کو علیحدہ کر لینا اور دنیاوی زندگی کو ترک کر دینا سعادت، خیر اور نیکی کی منزل پالینا ہے۔ ان کو یہی نہیں معلوم کہ اعمال کی حقیقت اور ماہیت کیا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ زندگی بسر کرنے کا یہ راہبانہ طریقہ کسی روحانی یا مذہبی دائرہ میں لایا جاسکے لیکن یہ کسی نظریہ اخلاق کا موضوع ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ان کو کسی طور سے اخلاقی نہیں کہا جاسکتا۔ مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابن مسکویہ کے نزدیک فلسفہ اخلاق معاشرتی زندگی اور متمدن جماعت کے اندر ہی معرض وجود میں آسکتا ہے۔

اپنے نظریہ اخلاق کی تشریح اور وضاحت کرتے ہوئے ابن مسکویہ اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ اگر شرع اسلامی کے صحیح اور مفہوم کی تحلیل اور تجزیہ کے بعد پوری طرح سمجھ لیا جائے تو یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ بنی نوع انسان کی معاشرتی قدروں اور سماجی آدرشوں کے ساتھ وہ مکمل طور پر ہم آہنگ اور مربوط ہیں۔ جس طرح علم الاخلاق نوع انسانی کی مدنی اور معاشرتی

زندگی کو محبت اور اخوت کی بنیاد پر خوب سے خوب تر بنانے پر زور دیتا ہے اسی طرح شرعی اعتبار سے مذہب بھی عام انسانوں کی اخلاقی تعلیم و تربیت کا کام انجام دیتا ہے۔ شرعی احکام کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسانی برادری میں محبت کی بنیاد کو زیادہ سے زیادہ استوار کیا جائے اور اس کے دائرہ کو زیادہ سے زیادہ وسعت دی جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابن مسکویہ کی برابر یہ کوشش رہی ہے کہ یونانی فلسفہ اخلاق کی تعلیم کو وہ اسلامی شریعت کے احکام کے باہمی ربط و ہم آہنگی کو واضح کر سکے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کوشش میں ابن مسکویہ نے ایک دقیق اور جامع فلسفہ اخلاق پیش کر دیا ہے جسے اسلام کے نظریہ اخلاق کی فلسفیانہ اور حکیمانہ توضیح و تشریح کہا جاسکتا ہے۔

عدالت، عفت، شجاعت اور ان سے پیدا ہونے والی تمام اخلاقی خوبیوں سے انسانی نیکی حاصل ہوتی ہے علم الاخلاق کے ان بنیادی نکتوں پر ابن مسکویہ نے کافی غور و فکر کے بعد معنی خیز نتائج نکالے ہیں لیکن عدالت کے تصور پر انھوں نے جس باریکی اور گہرائی سے بحث کی ہے وہ کچھ اسی کا حصہ ہے۔ اس کے قول کے مطابق عادل صحیح معنی میں وہی شخص ہے جو غیر متساوی ہے جو غیر چیزوں میں مساوات پیدا کرے لیکن اس کے لئے سب سے پہلے اس بات کا علم ہونا چاہئے کہ وسط کیا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے جائز حق سے زیادہ حاصل کر لے تو یہ زیادتی ہے اور اگر جائز حق سے کم لے تو یہ نقصان ہے۔ ان دونوں کے درمیان کا درجہ اوسط ہے جس کا تعین شریعت کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ابن مسکویہ نے محبت کے تصور پر بھی مفصل بحث کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر کسی معاملے کے مختلف فریقوں کے درمیان باہم محبت کارفرما ہو تو عدل اپنے آپ پیدا ہو جائے گا۔ ابن مسکویہ نے اس سلسلے میں محبت کے اقسام سے مفصل بحث کی ہے اور فضائل اخلاق کی تجدید، تقسیم اور تفصیل کے ساتھ ساتھ اخلاقی برائیوں کے دور کرنے اور ان سے نجات پانے کے طریقوں پر بھی بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کو ہمیشہ اپنے اعمال پر غور و فکر کرتے رہنا چاہئے کیونکہ اکثر انسان سے ایسی غلطیاں صادر ہوتی ہیں جنہیں عدل و تمیز کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ اور اگر غور و فکر کرنے کی عادت مستقل طور پر ڈالی جائے تو اخلاقی تحفظ عین ممکن ہے۔ اس طرح بہت سارے غلط اعمال اور افعال سے بچنے کی تدبیر پیدا ہو جاتی ہے۔

ابن مسکویہ نے فضائل اخلاق کے سلسلے میں اصلاح نفس کے طریقہ کار پر بہت زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک اگر انسان اپنے دوستوں اور اپنے ملنے والوں کی کمزوریوں پر اچھی طرح نظر رکھے اور ان سے اپنی ذات کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرے تو یہ اخلاقی بہتری کے لئے ایک مفید اور عمدہ طریقہ کار ثابت ہو سکتا ہے اس نے اخلاقی برائیوں کو آٹھ قسموں میں تقسیم کیا ہے جب روح انسانی بیمار ہو جاتی ہے تو اخلاقی طور پر جن امراض کا شکار ہوتی ہے وہ ان ہی آٹھ میں شامل ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اگر انسان اصلاح نفس کے طریقہ کار کو اپنائے یعنی اپنے احباب اور اعزا کے غلط اور خراب اعمال کا جائزہ کڑی نظر سے لیتا رہے تو وہ ان اخلاقی امراض سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

اس مختصر اور سرسری جائزہ سے کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ فلسفے کی تاریخ میں بالخصوص فلسفہ اسلام کی تاریخ میں اپنے نظریہ اخلاق کی بنیاد پر ابن مسکویہ کو ایسا اعلیٰ وارفع مقام حاصل ہے جسے ماہ و سال کی گردش کبھی کم نہیں کر سکتی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ جیسے جیسے اہل علم کی نظر اس کے فلسفہ اخلاق کے رقیق نکتوں پر پڑتی جائے گی انسانی فکر و حکمت کی تاریخ میں ابن مسکویہ کی اہمیت بڑھتی جائے گی۔

حوالے:

۱۔ ابن مسکویہ کو ابو علی مسکویہ بھی کہتے ہیں۔

۲۔ ۴۲۱ھ (فرہنگ ادبیات فارسی دری ۲۷)۔

۳۔ تہذیب الاخلاق: ۶۱۔۶۰

۴۔ ان کے علاوہ الطہارۃ فی علم الاخلاق وکتاب فی جواب المسائل الثلث اور جامر یدان خرد کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ تاریخ میں اس کی کتاب "تجارب الامم" بے حد مشہور ہے (فرہنگ ادبیات فارسی دری: ۲۸)

ڈاکٹر صادق نقوی

دکن میں شیعہ سلطنتوں کے قیام کا

تاریخی پس منظر

شیعیان حیدر کرار ورق کائنات پر آدم سے خاتم تک اور دورۂ خاتم النبین سے آج تک باقی ہیں۔ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا۔ ''علی حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ'' اس حدیث کی روشنی میں صاحبان حق و دوستداران علی قرار پائے ہیں۔ ایسے ممکن ہی نہیں ہے کہ کائنات کے پردے پر پرستاران حق کا وجود نہ ہو اس لئے کہ اگر باطل پسندوں کا وجود ثابت ہے تو پھر حق پسندوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ تاریخ کے صفحات پر حق پسندوں کے تذکرے موجود ہیں بلکہ یوں بھی ہے کہ انسانیت کی بلندی اور شرف کا اندازہ ہوتا ہے لیکن سولھویں صدی عیسوی کے آغاز تک ورق کائنات پر کوئی ایسی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی جس کا سرکاری مذہب شیعیت ہو اور جہاں شیعوں کی اذان اور خطبہ کھلے عام پڑھا جاتا ہو —— لیکن سولھویں صدی کے آغاز سے شیعوں کی تاریخ کا ایک روشن باب شروع ہوا۔ ۱۵۰۱ء میں شاہ محمد اسمٰعیل صفوی نے اپنے (۳۰۰) جاں بازوں کے ساتھ ایران کے مقام اردبیلی پر قبضہ کر لیا۔ اور پھر مختصر سے عرصہ میں اس نے آس پاس کے زمینداروں ور شاہزادوں کو شکست دے کر اپنی سلطنت بنالی۔ شاہ محمد اسماعیل، شیخ صفی اردبیلی کے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے دنیا میں سب سے پہلے شیعیت کو اپنی حکومت کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ یہ دنیا میں پہلی شیعہ سلطنت تھی جو ایران میں قائم ہوئی(۱)

یہ تاریخ کا عجیب اتفاق ہے کہ قریب قریب اسی دور میں بیجاپور کے علاقہ پر یوسف عادل خان نے اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ اسماعیل کی طرح یوسف کی تعلیم و تربیت بھی شیخ صفی اردبیلی کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ سات برس کی عمر سے (۱۶) برس کی عمر تک یوسف شیخ کے زیر سایہ رہا۔ پلا بڑھا تھا (۲) اس کی تعلیم اور ذہنی تربیت شیخ صفی جیسے عالم باعمل کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اس لئے یوسف کا دل

نورایمان سے منور اور اس کا عزم و حوصلہ اہلبیتؑ اطہار کے در کی وابستگی کا نتیجہ تھا۔ تخت سلطنت پر آتے ہی یوسف عادل خان نے اعلان کیا کہ اس کے حدود سلطنت میں اذان اور خطبہ مذہب شیعہ کے اصول پر دیا جائے گا۔ فرشتہ نے اپنی تاریخ گلشن ابراہیمی "میں اس کا تذکرہ یوں کیا ہے وہ لکھتا ہے۔

۹۰۸ھ میں یوسف عادل خاں نے اپنے درباریوں امراء و علماء کو طلب کیا۔ دربار جب سج گیا تو اس نے مرزا جہانگیر، حیدر بیگ و سید احمد حیدر کو جو اس دور کے شیعہ علماء میں صاحب عظمت سمجھے جاتے تھے مخاطب کر کے اپنے خواب کو بیان کیا کہ خواب میں اسے رسالت مآب نے بادشاہت عطا کی تھی اور اس نے خواب سے بیدار ہوتے ہی یہ منت کی تھی کہ اگر وہ کبھی کسی وقت سلطنت کا فرمان روا ہوا تو وہ اپنی سلطنت کے حدود میں مذہب حقہ رائج کرے گا۔ اذان اور خطبہ ائمہ معصومینؑ کے نام پڑھوائے گا(۳) اب وہ وقت آگیا ہے اور اسی لئے وہ رسول اکرم سے اپنے کئے ہوئے وعدے کو پورا کر رہا ہے۔ یوسف عادل خاں نے اپنے امراء اور علماء کو اس دربار میں پوری آزادی دی کہ وہ اس سلسلہ میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ دربار میں امراء علماء کی اکثریت ترک دکھنی اور حبشی النسل تھی جو سنی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اقلیت اور اکثریت کا عذر پیش کیا اور بادشاہ سے کہا کہ اس کی رعایا، امراء علماء اور عہدہ داروں کی اکثریت چونکہ سنی مسلک کی پابند ہے اس لئے اقلیتی مسلک کو اکثریت کے مقابلہ میں رائج کرنا درست نہ ہوگا۔ دربار کی فضا مکدر ہو چلی تھی۔ اس لئے یوسف عادل خاں نے بغیر کوئی فیصلہ کئے ہی دربار کے برخواست ہونے کا اعلان کر دیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد اسے اطلاع ملی کہ ایران میں اسمٰعیل صفوی نے شیعہ اذان اور خطبہ کو اپنی سلطنت میں رائج کر دیا۔ اب یوسف کو قرار نہ آیا ابراہیم زبیری نے اپنی کتاب "بساطین السلاطین" میں پہلی شیعوں کی اذان اور خطبہ کا تذکرہ مختصر لفظوں میں یوں لکھا ہے۔ "ماہ جمادی الاول ۹۰۸ھ ۱۵۰۳ء) روز جمعہ قلعہ آرک کی مسجد میں یوسف عادل خاں نے نقیب خاں کو حکم دیا کہ وہ گلدستہ اذان پر بلند ہو اور شیعہ اذان دے۔ نماز کے بعد اس نے حکم دیا کہ خطبہ بارہ اماموں کے نام پڑھا جائے۔(۴)

ہندوستان کی سرزمین پر یہ پہلا موقع تھا۔ جب کسی مسجد میں اعلانیہ شیعوں کی اذان دی گئی اور مولائے کائنات کا نام نامی بغیر کسی خوف کے کسی بادشاہ کی موجودگی میں لیا گیا۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ تاریخ دانوں کی ایک بڑی تعداد یوسف عادل خاں پر سخت معترض ہے کہ اس نے اکثریت کے مسلک کو ٹھکرا کر اقلیت کے مذہب کو اپنی حکومت کا مذہب بنایا۔ لیکن یہ اعتراض اپنے میں کوئی وزن نہیں رکھتا اور بکنے والوں کی کوتاہ ذہنی کا اظہار کرتا ہے۔ اگر کسی بادشاہ کے عادل یا ظالم ہونے کا معیار یہ قرار پائے تو پھر ہندوستان پر حکومت کرنے والے سارے کے سارے بادشاہ قطب الدین سے بہادر شاہ ظفر تک ظالم قرار پائیں گے۔ اس لئے کہ انھوں نے ہندوستان میں جہاں کی اکثریت کا مذہب ہندو دھرم تھا اسلام کو اپنی حکومت کا مذہب قرار دیا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ تاریخ داں جو اورنگ زیب کو اس کے سارے مظالم کے باوجود اعزاز بخشتے ہیں یوسف عادل خاں پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے نہیں چوکتے۔ صرف اس لئے کہ اس نے مذہب اثنا عشری کو سرکار کا مذہب قرار دیا۔ اور شیعیت کو کھل کر اپنایا۔ حالانکہ یوسف عادل کا دور حکومت ہندوستان کے کسی بھی بادشاہ کے دور حکومت سے بہتر تھا۔ بیجاپور کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یوسف کے دور میں کوئی بھی فرد نہ تو اپنے مذہب کی بنیاد پر قتل کیا گیا اور نہ کسی کو جبر اً طاقت کے بل بوتے پر اپنے مذہب کو چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ سرکار کا مذہب امامیہ ہونے کے باوجود عوام امراء اور جاگیرداروں کو اس کی پوری پوری آزادی تھی کہ وہ جس مسلک کو چاہیں اپنائیں فرشتہ نے اپنی کتاب میں صاف صاف یہ لکھا کہ یوسف کی سلطنت میں مختلف مقامات پر لوگ مختلف انداز میں عبادت کرتے تھے۔ اور اپنے مذہبی رسوم آزادی کے ساتھ پورے کرتے تھے۔ حکومت اس میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرتی تھی (۵) اس کے ساتھ ساتھ یوسف عادل خان نے مذہب کی بنیاد پر حکومت کے عہدوں کی تقسیم کے اس اصول کو جو شمالی ہند کے بادشاہوں نے اپنایا تھا اپنی سلطنت میں ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ یہ تاریخ کی ایک روشن حقیقت ہے کہ علی کے چاہنے والے، حسینؑ مظلوم کا ماتم کرنے والے فطرتاً ظلم سے نفرت کرتے ہیں۔ ظلم چاہے کسی انداز میں ہو شخصی ہو کہ جماعتی، جسمانی ہو کہ ذہنی، اصول و آئین کی بنیادوں پر ہو کہ اعتقاد کی اساس پر مظلوم کے ماتم داروں کا ظلم سے کوئی ربط قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کسی کا ظلم ثابت ہو جائے، مشاہدے میں آجائے تو پھر ظالم سے دوری اور اس سے اظہار بیزاری مظلوم کے ماتم داروں کا فرض ہو جاتا ہے۔ یہ امام حسینؑ مظلوم کا ماتم داران حسینؑ کو عطیہ ہے۔ کہ وہ حق کا اظہار فریضہ سمجھتے

ہیں۔ان کے لئے حق کا انحصار اکثریت اور اقلیت کے چوکھٹے میں نہیں ہوتا۔ حق بہر حال حق ہوتا ہے، اسے اکثریت مانے کہ نہ مانے اس اصول کو اپنا کر زندگی کی راہوں پر چلنے والوں کا انداز ان کا فلسفۂ حیات ایک ہی ہوتا ہے۔ چاہے وہ تختِ سلطنت پر ہوں کہ بورے پر تاریخ اسلام کے دامن میں ماتم داران حسینؑ مظلوم کے جانے کتنے واقعات محفوظ ہیں جو اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ علیؑ کے چاہنے والوں نے، حسینؑ کے غم کو اپنا مقصد حیات بنانے والوں نے طوفان کی گودیوں اور آندھیوں کی باہوں میں حق کے چراغ کو اپنا لہو دے کر روشن رکھا۔ صدیوں تک انہیں تلواروں کی دھاروں پر چلنا پڑا۔ خنجروں کی زبانوں کی سہنا پڑا۔ تیر و تبر کے واروں کو اپنانا پڑا۔ لیکن سولھویں صدی کے آغاز نے انہیں سہارا دیا۔ شاہ اسمٰعیل نے ایران میں اپنی حکومت قائم کی۔ دکن میں بیجاپور کے یوسف عادل خاں نے اپنی حکومت کا مذہب شیعہ قرار دیا۔ صاحبان حق کے حوصلے بلند ہوئے فضاؤں میں شیعہ اذان گونجی۔ خطبہ میں بارہ اماموں کے ناموں کا اعلان ہوا۔ تو گولکنڈہ کی ریاست کے بانی قطب الملک نے بھی راہ حق و صداقت پر قدم بڑھائے۔ بیجاپور کی طرح گولکنڈہ میں بھی امراء اور علماء کی ایک قابل لحاظ تعداد ان کی تھی جو دکن میں ایران اور دوسری مغربی ایشائی مملکتوں سے ہجرت کر کے پہونچے تھے۔ان لوگوں کو دکن کی تاریخ میں آفاقی کہا گیا ہے۔ سلطان قلی کی مملکت میں آفاقی پارٹی کی قابل لحاظ طاقت تھی۔ جب یوسف عادل خاں نے سلطنت بیجاپور میں شیعہ اذان دلوائی تو آفاقیوں نے قطب الملک کی ہمت افزائی کی کہ وہ بھی اپنے مسلک کا کھل کر اعلان کرے اور اپنے حدودِ سلطنت میں شیعہ اذان اور خطبہ کو رائج کرے۔ ڈاکٹر ہارون خان شروانی نے اپنی مشہور کتاب ہسٹری آف قطب شاہی ڈینس میں مرغوب القلوب" کے حوالے سے لکھا ہے کہ قطب الملک نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی یہ منت کی تھی کہ اگر اسے مالک کائنات کبھی کسی مملکت کا حکمراں بنائے گا تو وہ اپنی مملکت میں شیعہ اذان اور خطبہ کو رائج کرے گا(٦) قطب الملک نے شیعہ اذان ۱۵۰۴ء کے بعد ہی رائج کی۔ اکثر تاریخ دانوں کا یہ خیال ہے کہ قطب الملک نے اپنے ارادے کو پورا کرنے میں پس و پیش اس لئے کیا کہ اس دور میں آفاقیوں کے علاوہ دکن میں قابل لحاظ تعداد دکھنی، افغانی اور حبشی امیروں کی تھی جو سب کے سب سنی مذہب کے پیرو تھے۔ قطب الملک کو ان کی مخالفت کا خوف تھا۔اس کے ساتھ ساتھ جس بات پر زور دیا جاتا تھا وہ

یہ ہے کہ قطب الملک بہمنی بادشاہوں کا وفادار تھا اس سے اس نے شیعہ اذان اور خطبہ کو رائج نہیں کیا لیکن تاریخ دکن کے صفحات پر اس بات کا کھلا ثبوت موجود ہے کہ بہمنی سلطنت کے کم از کم دو بادشاہوں نے شیعہ مسلک اختیار کر لیا تھا ہارون خان شیر وانی نے اپنی کتاب میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پندرھویں صدی کے دوران فیروز شاہ بہمنی اور اس کے بیٹے علاء الدین احمد اول شیعہ مذہب کی طرف راغب تھے۔ ان کے علاوہ برہان نظام شاہ نے جو بہمنی سلطنت کا مشہور حکمراں تھا۔ اپنے سنی ملک پر قائم رہنے کے باوجود خطبہ میں بارہ اماموں کے نام لینے کا حکم صادر کیا۔ (۷) بہمنی سلطنت میں شیعیت کا ارتقاء بہمنی، سلطنت کے حکمرانوں کی کاوشوں کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ طاہر کی روحانی عظمتوں اور ان کی بے تکان کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ان کے آباء واجداد نے کھونڈ ضلع قاذوین کو اپنا وطن بنایا تھا۔ شاہ طاہر یہیں پیدا ہوئے وہ احمد نگر ۹۲۸ھ میں آئے۔ شاہ طاہر کا اثر اتنا بڑھا اور ان کی روحانی اور علمی عظمتوں سے برہان نظام شاہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے بارہ اماموں کے نام سے خطبہ پڑھنے کا حکم صادر کیا۔ (۸)

دکن میں شیعہ سلطنتوں کے قیام اور ان کی ترقی کی تاریخ کتابوں میں محفوظ ہے اور آج بھی اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ وہ بادشاہ جن کے ہاتھوں میں دامان اہلبیتؑ رہا۔ ہمیشہ ظلم سے دور رہے۔ یہ صحیح ہے کہ بیجاپور کی سلطنت کے سارے حکمراں شیعہ مسلک پر نہیں رہے۔ یوسف عادل خاں کے بعد پہلی بار عادل شاہ اول نے شیعیت کی تبلیغ کی کوشش کی بلکہ وہ یوسف عادل خاں کے مقابل اپنے مسلک پر زیادہ ہی مضبوط تھا۔ لیکن قطب شاہی سلطنت کے تمام بادشاہوں کا مسلک مذہب حقہ ہی رہا۔ انھوں نے کسی دور میں بھی اپنے مسلک کو نہ چھپانے کی ضرورت محسوس کی نہ اس پر مصلحت کے پردے ڈالے۔ خود مختار سلطنت کے والی ہونے کے باوجود انھوں نے غلامی مولائے کائنات پر فخر کیا۔ اب بھی محمد قلی کا ایک کتبہ موجود ہے جس کے نیچے بادشاہ کا نام غلام علی محمد قلی لکھا ہے۔

انھوں نے عزاء حسین مظلوم کو اپنا فرض جانا اس میں خود بھی کھل کر حصہ لیا اور اپنی رعایا کو بھی اس کی ترغیب دی۔

اورنگ زیب نے دکن کی دونوں شیعہ ریاستوں بیجاپور اور گولکنڈہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس کے ان ریاستوں پر حملہ کی دیگر وجوہات کے منجملہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ریاستیں شیعہ مسلک

کی پابند تھیں۔ اور ان کے گہرے دوستانہ تعلقات ایران کے ساتھ تھے۔ شیعوں کی دونوں ریاستیں ختم ہو گئیں لیکن محبان اہلبیتؑ اور، ماتم داران حسینؑ مظلوم اب بھی سر زمین دکن پر بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ آج بھی ان کا فلسفۂ حیات وہی ہے جو تھا دنیا کے انقلابات نے جانے کتنے مذاہب، فلسفوں اور تحریکوں کو بدل ڈالا لیکن محبان اہلبیتؑ کا مسلک نہ کسی انقلاب سے بدلا اور نہ اقتدار کے چھن جانے سے ان میں کوئی تبدیلی آئی۔

وہی فلسفۂ حیات جو سلطنتوں کے عروج کے زمانوں میں تھا آج بھی باقی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

حوالے:—

۱۔ برگس رائیز آف محمڈن پاور ان انڈیا۔ جلد ۳ صفحہ ۲

۲۔ فرشتہ ہسٹری آف دکن۔، انگلش ٹرانسلیشن جان تھی اسکاٹ۔ صفحہ ۲۰۸

۳۔ فرشتہ۔ صفحہ ۲۲۱۔

۴۔ ابراہیم زبیری۔ بساطین السلاطین صفحہ ۲۰

۵۔ فرشتہ (۲۲۱)

۶۔ ہارون خاشیروانی ہسٹری آف قطب شاہی دنیاسٹی۔ صفحہ۔ ۴۵

۷۔ ہارون خان شیروانی صفحہ ۴۵

۸۔ ہارون خاں شیروانی۔ صفحہ ۴۳

❀❀❀

پروفیسر سید اطہر رضا بلگرامی

نوحہ: رثائی ادب کا اہم ستون و قومی یکجہتی کا آئینہ

رثائی ادب عربی لفظ "رثا" سے ماخوذ ہے جس کے معنی نالہ وشیون کے ذریعہ غم کا اظہار ہے۔ نوحہ آہ وزاری اور آواز والفاظ کے ساتھ رونے کو کہتے ہیں۔ غم کی افراط وشدت انسان کو فطری طور پر سر وسینہ پیٹنے پر مجبور کرتی ہے اس لیے نوحے کے ساتھ ماتم جز ولازم بن گیا۔ مزید چونکہ آہ وزاری اور بین وبکا خواتین سے مخصوص ہیں اس لیے نوحہ بھی خواتین کی مجلسوں میں زیادہ پنپا اور انھیں کے دائرہ میں مقبول ہوا۔ مرثیہ ونوحہ رثائی ادب کے خاص صنف سخن ہیں جن کا اصل موضوع سانحہ کربلا ہے۔ مرثیہ اس موضوع کی تفصیلی اور نوحہ اس کی اختصاری شکل ہے۔ مرثیہ کی مفصل شکل مختلف اجزا پر مشتمل ہے جس میں چہرہ 'سراپا' رجز' جنگ شہادت اور بین وبکا لازمی اجزا ہیں۔ نوحہ اس کے اختتامیہ حصہ بین کی اختصاری شکل ہے۔

اس اعتبار سے مرثیہ کا میدان انتہائی وسیع جبکہ نوحے کا میدان انتہائی تنگ نظر آتا ہے۔ نوحہ اپنے معنی ومقصد کے اعتبار سے بیان مصائب تک محدود رہا اور وہ بھی بالخصوص خواتین کے جذبات کی عکاسی کے ساتھ۔ شوکت و متین کے نوحوں کے مجموعے اس کی مثالیں ہیں جن کو بیبیہ نوحوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن باوجود اختصار کی تنگی وحدود بندی کے 'فصاحت وبلاغت' جذبات نگاری' منظر نگاری' مرقعہ نگاری' اور تخیل آفرینی کے جو ادبی رنگ نوحوں میں نظر آجاتے ہیں وہ کسی طور پر مرثیے سے کم نہیں ہیں۔ بلکہ بعض مقام پر تو مرثیے کی تفصیل کے بالمقابل نوحے کا اختصار زیادہ پُر اثر ثابت ہوتا ہے۔

میر انیسؔ کے مشہور مرثیے: آج شبر پہ کیا عالم تنہائی ہے" پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے یہی ایک مصرعہ مکمل مرثیہ ہے۔ نجم آفندی کے ایک نوحے کے مصرعہ: مسند کا گوشہ الٹا ہوا ہے" کے لئے بھی یہی بات صادق آتی ہے جہاں نوحہ اپنی تمام تر مسکی کیفیات کے ساتھ تمام ہو جاتا ہے۔ مکمل بند اس طرح ہے:

ملت کا حاکم امت کا والی — ترہے لہو میں سلطان عالی
خیمے کی رونق کس نے اٹھالی — دلدل کا رن میں ہے زین خالی

مسند کا گوشہ الٹا ہوا ہے۔

مرثیے نے اپنے ابتدائی دکنی دور سے عہد حاضر تک ہیئت' موضوعات' اور شعری تجربات کے اعتبار سے وقت کے تقاضوں میں ڈھلتے ہوئے تغیر و تبدل کے ساتھ کئی منازل طے کیے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے بعد مرثیہ واقعات کربلا تک محدود نہیں رہا بلکہ اسلام کے ساتھ دین انسانیت تک پھیل گیا جہاں واقعات کربلا اور اس کے کردار کو عالم انسانیت کے پیچیدہ مسائل کے لئے آئیڈیل ماڈل" بنالیا گیا۔ عصر حاضر کا مرثیہ کسی خاص فرقے یا قوم کی شاعری نہ رہ کر عالم انسانیت کی شاعری بن گیا۔ مرثیہ کی اس وسعت نے اس کو اُردو ادب میں ایک منفرد مقام دیا اور عالمی ادب سے آنکھ ملانے کی جرأت دی۔ نوحوں میں بھی وقت کے تقاضوں میں ڈھلنے کی کوشش ملتی ہے جہاں آہ وزاری کے دائرہ سے نکل کر تبلیغی موضوعات کو اختیار کیا گیا اور اسلام کے درس و تبلیغ کے ذریعہ اعلیٰ انسانی قدروں کو اُبھارا گیا۔

علامہ نجم آفندی، فضل لکھنوی کے مجموعے اس کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔ چند بند دیکھئے:

صبر عالم ان کے قدموں پر نثار — جو در خیمہ تک آکر رہ گئے
روشنی مقتل میں لاشوں پر کہاں — چار تارے جھلملا کر رہ گئے
سر جو نیزے پر چڑھا شبیر کا — دونوں عالم سر جھکا کر رہ گئے

خدا را سامنے سے ہر غم دنیا ہٹا دینا — حسین آتے ہیں اے کاشانۂ دل راستہ دینا
علی اصغر کو بھی ایثار کا احساس تھا ورنہ — یہ کس نے کہہ دیا تھا تیر کھا کر مسکرا دینا

یہ حسین تیرا ہی کام تھا کہ سب اپنے لال فدا کیے
تجھے ان ستاروں نے ڈوب کر شب غم کا چاند بنا دیا۔

دست جہاں پناہ میں اسلام کی نجات　　راہ خدا ثبات قدم سے لگی ہوئی
پانی کی بندشوں پہ حقارت کی ایک نظر　　عزت کی موت سے وہ نگاہیں لگی ہوئی
نجم آفندی

اللہ وہ میدان کی خاموش فضائیں　　تاریک گھٹائیں
مڑ مڑ کے چراغ رہ وحدت کا جلانا　　شبیر سے سیکھو
چلتے ہوئے خنجر کو سکھاتے ہوئے راہیں　　اللہ ری نگاہیں
خود موت کو بھی موت کی تصویر دکھانا　　شبیر سے سیکھو
لاشیں ہیں کہ قرآن کے بکھرے ہوئے پارے　　یا عرش کے تارے
ہر سورہ کو جلتی ہوئی ریتی سے اٹھانا　　شبیر سے سیکھو
پھولوں پہ ہیں خون کے دھاروں پہ نظر کی　　حد بھی ہے اثر کی
دولہا کی طرح لاشۂ قاسم کو اٹھانا　　شبیر سے سیکھو
خوں دیتے ہوئے سینے پہ جمتی ہوئی نظریں　　تھمتی ہوئی نظریں
اکبر کو نہیں میت اکبر کو اٹھانا　　شبیر سے سیکھو
فضل لکھنوی

نوحوں نے مرثیوں کی مانند 'ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد سے پیدا سیاسی بحران اتھل پتھل 'خوف وہراس 'بےچینی وبدنظمی دہشت گردی اور غدر کے دوران لوٹ مار کے مناظر کی بھی انتہائی پراثر عکاسی کی ہے۔ جس کیفیت کے اظہار کے لئے مرثیہ کو متعدد بند کا سہارا لینا پڑا ہے وہاں نوحے اپنی اختصاری ہیئت میں رہتے ہوئے صرف ایک یا چند بندوں میں بھرپور عکاسی کرتے ملتے ہیں۔ قتل حسین کے بعد خیمۂ حسینی کی تاراجی کا ایک منظر نوحے میں دیکھیے جو ۱۸۵۷ کے غدر کی لوٹ مار کا ہی ایک منظر ہے:

درانہ عدو بے ادبانہ ہوئے داخل
گھر فاطمہ کا ہوگیا بازار حسینا
سر ننگے بہن کو تیری اعدا نے پھرایا
یوں لوٹی گئی ہے تیری سرکار حسینا

ہندوستان میں مرثیہ نگاروں نے ہندوستان تہذیب و معاشرت' رسم و رواج عقائد کی زندہ تصویریں پیش کی ہیں۔ کرداروں کا لب ولہجہ نفسیات' حرکات و سکنات' زبان و محاورے حفظ مراتب طرز تخاطب ایسے رنگ میں پیش کیے گئے کہ خالص عربی کردار سراسر ہندوستانی فضا کے چلتے پھرتے کردار نظر آتے ہیں۔ انیس کے سامنے ہندوستان کی شیر دل' حوصلہ شکن اور دلیر خواتین کی پوری تاریخ تھی خواہ وہ راجپوت خواتین کی تاریخ ہو یا بیگم حضرت محل کی کربلا کے میدان میں جس حوصلہ سے انیس نے حضرت زینب کی زبان سے عون و محمد کو جنگ کی طرف راغب کیا اس کے پیچھے یہی تاریخ بول رہی ہے:

خیبر کی لڑائی کی طرح جنگ کو جھیلو بچے اسد اللہ کے ہو جان پہ کھیلو
تینوں میں دھنسو چھاتیوں سے نیزوں کو ریلو کوفے کو تہہ تیغ کرو شام کو لے لو
دو اور جلا آئینہ و تیغ عرب کو
لو روم کو قبضے میں تو قابو میں حلب کو

اب جا کے ہمالیہ پربت سے لئے ماتم کی ٹکراتی ہے
اس دیس کی نجمی دور بلا جس دیس پہ یہ غم چھا گیا

(۳) دیہی ماحول و معاشرت و اپدیشوں کا رنگ:

ڈوبی ہوئی دکھ کے ساگر میں سورج کی سنہری تھالی تھی
اس چاند کی دس کو سانجھ تلک شبیر سے دنیا خالی تھی

یوں جگ میں نہ لاگی آگ کہیں اس ڈھب سے نہ اجڑا باگ کہیں
سوکھی ہوئی پتی پتی تھی ٹوٹی ہوئی ڈالی ڈالی تھی

دوکھیت پر سے جل بہتا تھا اور پھول ادھر کھلاتے تھے
بن نیر یہ سوکھے جاتے تھے اور چار طرف ہریالی تھی

کیا نت کے گیے کربل سے حرم جب آئی ہیں سکھیاں ملنے کو
جس مانگ کو دیکھا اجڑی تھی جس گود کو دیکھا خالی تھی

نجمی یہ حسینی چوکھٹ ہے یاں آکے مرادیں ملتی ہیں
اس دوارسے بھکشا لے کے چلے آئے تھے تو جھولی خالی تھی

(۲)

درشن کا اجالا کر لے چلے آنکھوں میں اندھیرا چھوڑ گئے
اکبر کو کہاں کی جلدی تھی بابا کو اکیلا چھوڑ گیے
کربل کی انوکھی دھرتی ہے نردوش مسافر یثرب کا
سانچی تھی جو مہما لے کے اٹھے جھوٹی تھی جو مایا چھوڑ گئے

تیرہ سو برس سے چرچے ہیں ان جیوٹ مرنے والوں کے
تڑپے ہیں وہ خود خنجر کے تلے دنیا کو تڑپا چھوڑ گئے
اب سوگ ہے رہتی دنیا تک سنسار نے ایسا جوگ لیا
جیون میں رچے ہر دئے میں بسے ٹھکرا کر جو دنیا چھوڑ گئے

(۳)

اکبر کو سکارے مرنا تھا دھن موت کی سگری رات رہی
ماں سیس لگائے چھاتی سے بالوں کی لیس لٹیں سلجھات رہی
سانچے ہی رہے جو سانچے تھے ہاں سانچ کو کوئی آنچ نہیں
دشمن کو ہی سب نے دوش دیا اور ان کے لیے صلوات رہی
اب راجہ پر جا چوکھٹ پر سب سیس نوائے بیٹھے ہیں
جب چھوڑ کے دنیا دین لیا دنیا بھی انہیں کے ساتھ رہی

سب دل کی سوبھا ساتھ چلی جب دیس سے یہ پردیس گئے
پردیس سے جب پر لوگ گئے سنسار گی سوبھارت جات رہی
قاتل کو بلا کر دودھ گئے ایسے بھی دیا لو ہوتے ہیں
دنیا یہ اسی کے کنبے کو پانی کے لیے ترسات رہی
جب آئے حسینی سیوا میں سب ہندو مسلم ایک ہوئے
مل جائیں گے نجمی دل بھی کبھی جن ان کے نظر یہ بات رہی

(۴)

کربل بن سے چلے مسافر باجت کوچ نقارہ
جان گیے ہر دیسی بدیسی جھوٹی سانچی مہما کو
نگری نگری دھوم مچی ہے واحسینا بابا کی
اپنے کو جو چاہے نجمی اس کو کون نہ چاہے

ایک ایک سیس انی پہ چمکے، چمکے جیسے ستارہ
ہار کس کی جیت ہے کس کی مان گیو جگ سارا
کربل بن مادیا جلا یو سارا جگ اجیارا
بھارت ماتا سوگ سنا کر من ہر لیسن ہمارا

(۵)

کربل کا انوکھا جنگل ہے تیروں میں ہوا بل کھاتی ہے
یہ چراغ بھومی لوٹ چکی بھر پور جوانی پھولوں کی
مایا نے جنہیں ٹھکرایا تھا وہ مایا روپی بندے تھے

شبیر کا گھائل تن من ہے دھرتی کی دھڑکتی چھاتی ہے
اب گود میں اپنے مالی کے منھ بند کلی مرجھاتی ہے
یہ ایشور روپی بندے ہیں یاں مایا ٹھوکر کھاتی ہے

(۶)

جب جھوٹ کی ندی بڑھ چڑھ کر لہراتی ہے اٹھلاتی ہے
یہ چلتی پھرتی مایا جب کایا کا لہو پی جاتی ہے
ایک وقت نظر میں پھرتا ہے ایک بات مجھے یاد آتی ہے
سکھ کھونا یاد آتا ہے دکھ پانا یاد آتا ہے
شبیر کا ست کی سیوا میں مرجانا یاد آتا ہے

(۲)

جب سچوں کو ٹھکراتے ہیں اور جھوٹوں کو اپناتے ہیں
جب اچھے اچھے دھرم پجاری پاپ کی ٹھوکر کھاتے ہیں
جب مایا جال بچھاتی ہے دل پھندے میں پھنس جاتے ہیں
سنسار کی جھوٹی مایا کو ٹھکرانا یاد آتا ہے
شبیر کا ست کی سیوا میں مرجانا یاد آتا ہے

(۳)

جب تن کی مورت ہنستی ہے اور من کی دیوی روتی ہے
یہ دنیا نرم بچھونے پر جب آنکھیں مونڈے سوتی ہے
ست دھرم پہ مرنے والوں کی اس جگ میں کمی جب ہوتی ہے
میدان میں ننھے بچے کا لے آنا یاد آتا ہے
شبر کا ست کی سیوا میں مرجانا یاد آتا ہے

(۴)

جب تن کی رکشا کرنے والے من کا انس مٹاتے ہیں
در در کے جب سیوک بنکر گھر کی لاج مٹاتے ہیں
جب سکھ کے بندے سکھ کے کارن جگ جگ سیس نواتے ہیں
دکھ درد کے اونچے پربت سے ٹکرانا یاد آتا ہے
شبر کا ست کی سیوا میں مرجانا یاد آتا ہے

(۷)

پربھونا سے گلا کٹا ہو گھر بھر دیو لٹائے ست کی رکشا اس کری کلجگ سیس نوائے
تم سا ایک نا تکسا کو و گجر کے بہت حسین ایسی لیلا رچ گئے کہ تم بن جگ بیچین
دو جگ کے سہارے کیا کہنا ست جگ کے ستارے کیا کہنا
سگری باڑی دھوپ میں سوکھ گئی بن نیر کھیتی پیاسی نیر کی تس پہ برسے تیر
ہنس ہنس ایسا پن کیا پھوٹ کے رویا پاپ سارا باگ لٹائے کے کھیت رہے پھر آپ
دو جگ کے سہارے کیا کہنا ست جگ کے ستارے کیا کہنا
تس تس مکھڑا کھیت رہا جس جس باڑھی دھوپ پیاس بڑھا سنتوش بڑھا سونا چمکا روپ
من ما ایسی شانتی کو وہ کہاں سے لائے لاکھن کشٹ اٹھائے کے ایک نہ نکسی ہائے
دو جگ کے سہارے کیا کہنا ست جگ کے ستارے کیا کہنا
آنسو نکلے نین سے من سے نکسی کھوٹ مائیں تمرے نام کی پڑی کراری چوٹ
بجلی چمکی پریم کی جیو بھیا اجیارہ بادل گرجے ماتمی چیخ پڑا سنسار
دو جگ کے سہارے کیا کہنا ست جگ کے ستارے کیا کہنا
بستی بستی جنگل جنگل آج تمہاری سیت ابھری شکتی پریم کی بھئی ہار کی جیت
ہندو مسلم راجہ پرجا جن دیکھو گن گائے من کو بیر اپائے کے سبھی لیو اپنائے
دو جگ کے سہارے کیا کہنا ست جگ کے ستارے کیا کہنا
سوامی کتنے دور تھے لگا پریمی بان اٹھی لہر ذات سے پہونچی ہندوستان
بھومی رام کرشن کی کربل کا سندیس آنسو تمہرے سوگ کے اور گنگا جمنی دیس
دو جگ کے سہارے کیا کہنا ست جگ کے ستارے کیا کہنا
سب ہی کشٹ اٹھائے کے گئے علی کے لال بھارت سیوک بھوک کی آج کریں ہڑتال
آن سے جب آن بن بھئی من سے نکسے بین نجی ست کی ٹیک پر پیاسے لڑے حسین
دو جگ کے سہارے کیا کہنا ست جگ کے ستارے کیا کہنا

(۴) بنارس کے بنکر قوم کے نوحے کے چند بند

سنجوگ کے جوگ سجوگ بھئے سنسار ہمارا لوٹ لیا
سارے درباری جو جھ گئے دربار ہمارا لوٹ لیا
اپرادھی نے اپرادھ کیا سررام بھجن میں کاٹ لیا
بھگتی میں بھگت کا رکت بہاسکھ منڈل سارا لوٹ لیا۔
اکبر کو برچھی چھان گئی اصغر کے بان سے پر ان گئے
سنجیون بوٹی سوکھ گئی امرت رس دھارا لوٹ لیا
پوپھوٹی گردن تیاگ اٹھے پربت کے پنچھی جاگ اٹھے
میں کرم ابھاگن سوئے رہی سب ٹانڈہ لاد کے پار گئے۔
اے سورج روپی چندموہن بتلاؤ کروں اب کون جتن
تم گھوست ہوکر گھر آنگن اس راہ سے راجکمار گئے

(۵)نوحوں میں بھجن کاانداز:

(۶) یہ نوحہ بنارس سے حاصل کیا گیا جو وہاں کی بنکر قوم (جلاہوں) میں بہت مقبول ہے۔ میں محترم پروفیسر مجیب رضوی سابق صدر شعبہ ہندی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا بیحد مشکور ہوں جنہوں نے یہ نوحہ عنایت کیا۔

نواب ڈاکٹر رضا علی خاں (نواب رامپور) کی بیاض "سنگیت ساگر" سے ماخوذ جن کا تخلص رؔجا ہے۔

(۱)

دکھیا سنری چھاتی کوٹے مکھ پہ بکھرے بکھرے کیس ــ لہو کی لالی مہندی لینی نیر آنسو مرتیو بھینس
دھیر دھرائیں علی کی جائی کرار ورودیویں دھائی ــ کربل بن کی کے جوگن گھوموں گی میں دیس بدیس
قاسم پی کی ریت مناؤں نگر نگر مہندی رنگ جاؤں ــ من آگنی سے دیپ جلاؤں جگت سنے پتی سندیس
دیکھ کے سونا بیوہ ڈیرا رجا پیا کو شوک نے گھیرا ــ کربل ماٹی پر ڈالیں کھائیں نسدن تن پہ ٹھیس

(۲)

سمجھنے والے سمجھیں گے سدا بھجن تمرا | حسین ست کو امر کریگا گیو مترن تمرا
کٹا کے سیس بھی تڑپے نہ تپتی پر | سکھل بھیو وہ جونانا سے تھا وچن تمرا
نہ سوچو ریتی پہ تم کو لٹائے نے والوں نے | نبی کی گود میں بیتا ہے بال پن تمرا
گہارتی تھیں یہ قاسم کے سنگ میں ماتا | کہ چاند چھپ گیو بدلی میں اے حسین تمرا
پھنسی ہے ناؤ بھنور میں تو کاہے کی چنتا | کریں گے پار رجا بیڑا پنجتن تمرا

ہندوستان کی جنگ آزادی نے بھی نوحوں کو بہت متاثر کیا۔ انگریزوں کے جبر و تشدد کے خلاف گاندھی کی عدم تشدد کی تحریک سانحہ کربلا سے متاثر ہوئی۔ مہاتما گاندھی نے حسین کی قربانی کو آزادی کی جدوجہد کے لیے مشعل راہ بنایا اور کہا: ''ہندوستان کی اگر نجات ہوسکتی ہے تو ہم کو حسینی اصولوں پر عمل کرنا چاہئے۔'' ایک مولانا نے گاندھی جی سے دریافت کیا: '' آپ کا طریق کار اور ساتھیوں کی کم تعداد کیا انگریزوں کے خلاف کامیابی دلاسکتی ہے؟'' گاندھی جی نے جواب دیا: ''یہ آپ کہہ رہے ہیں مولانا جن کے پاس حسین جیسی مثال موجود ہے'' مہاراجہ گوالیار نے بھی یہ کہکر تائید کی: '' مجھے یقین ہے اس زندہ جاوید کی عظیم قربانی ہمیشہ ان لوگوں کے دلوں میں جوش و تازگی پیدا کرتی رہے گی جو انصاف' آزادی اور عزت کے لئے اپنی جانیں دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔'' گاندھی جی کے ''انشن'' [بھوک ہڑتال] نے کربلا کی بھوک پیاس سے قوت و توانائی حاصل کی اور آزادی کی لڑائی میں جھوجھے بھارت سیوک کہہ اٹھے:

سب ہی کشٹ اٹھائے کے گئے علی کے لال | بھارت سیوک بھوک کی آج کریں ہڑتال
ان سے جب ان بن بھئی من سے نکسے بین | تجی ست کی ٹیک پہ پیاسے لڑتے حسین

دو جگ کے سہارے کیا کہنا، ست جگ کے ستارے کیا کہنا

(نوحہ نجم آفندی)

ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں جہاں ایک طرف عدم تشدد کی تحریکیں پھیل رہی تھی تو دوسری طرف پوری فضا قومی گیتوں و ترانوں سے گونج رہی تھی۔ نوحوں نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا اور

حسینی پیغام کو قومی گیتوں اور ترانوں کی طرز پر پھیلایا۔ قومی گیتوں اور ترانوں کی طرز پر نوحوں کے چند نمونے دیکھئے :

(۱)

کیا صف ماتم پہ بیٹھے ہو عزادارو اٹھو   درد سے دنیا کو بھردو درد کے مارو اٹھو
حریت کی روح اعظم کے پرستارو اٹھو   فاطمہ کے لاڈلے پرجان ودل وارو اٹھو

چہرۂ روشن دکھا کر فطرت اسلام کا
کلمہ پڑھوادو شہید کربلا کے نام کا

ذرہ ذرہ کو سنا دو داستان کربلا   کس طرح لوٹا گیا تھا کاروانِ کربلا
کرگئے کیا کارنامے میہمان کربلا   بے زبان کے غم میں بن جاؤ زبان کربلا

چہرہ روشن دکھا کر فطرت اسلام کا
کلمہ پڑھوادو شہید کربلا کے نام کا

خلق سے کہدو کہ یہ شان شہادت دیکھ لے   تین دن کے بھوکے پیاسوں کی شجاعت دیکھ لے
دل پہن رکھے ہیں زرہوں پر جلالت دیکھ لے   اک سے بڑھکر ایک ہے معصوم صورت دیکھ لے

چہرہ روشن دکھا کر فطرت اسلام کا
کلمہ پڑھوادو شہید کربلا کے نام کا

دوش پر فوج حسینی کا علم لیکر چلو   یاد میں عباس کی باچشم نم لے کر چلو
پاؤں تھک جائیں تو ہمت کے قدم لیکر چلو   نجم آؤ بزم ماتم میں قلم لیکر چلو

چہرہ روشن دکھا کر فطرت اسلام کا
کلمہ پڑھوادو شہید کربلا کے نام کا

(۲)

بھردیا جوش عمل اسلام کی تلوار میں   یا حسین ابن علی کا شور ہے جھنکار میں
فاطمہ کی گود کا پالا جگا کر قوم کو   سورہا ہے کربلا کی منزل بیدار میں

(۳)

حسین سے ہے دین حق حسین دین پناہ ہے   حسین کا ہر ایک نفس نوائے لاالہ ہے
ہر ایک بوند خون کی بذکر حق گواہ ہے   جدھر ہوں اس کے نقش پا وہی خدا کی راہ ہے
حسین کے فدائیو ! علم بدوش بڑھ چلو

حسین اپنی بات پر جو سر کٹا کے سو گیا   شجاعت اور صبر کے اصول کو سمو گیا
عرب کے ریگ گرم میں وفا کے بیج بو گیا   حیات جاوداں ملی جو اس کے ساتھ ہو گیا
حسین کے فدائیو ! علم بدوش بڑھ چلو

نہ صرف اشک واہ کے ہی کارواں کو ساتھ لو   ضعیف تم سہی مگر دل جواں کو ساتھ لو
حسین کا ہے مدعا کہ دوجہاں کو ساتھ لو   زمین کو ساتھ لے چلے تو آسماں کو ساتھ لو
حسین کے فدائیو ! علم بدوش بڑھ چلو

لٹاؤ آشتی کے پھول زندگی کی راہ میں   امان والے تم بنو ستم کی جلوہ گاہ میں
صدائے یا حسین دو فضائے کوہ کاہ میں   تمام کروفر کو لو حسین کی پناہ میں
حسین کے فدائیو ! علم بدوش بڑھ چلو

محبت اس کی ذات سے ہر ایک کا نصب العین ہو   اسی کا مطمع نظر شعار مشرقین ہو
عمل میں اس کا ساتھ دو کہ اس کے دل کو چین ہو   زمیں سے آسمان تلک حسین ہی حسین ہو
حسین کے فدائیو ! علم بدوش بڑھ چلو

ان نوحوں کو پڑھیے تو ہندوستان کے عوام کی سیدھی سادی روزمرہ بول چال کی زبان ان کے محاورے وعقاید میں رچا بسا اور صوفیوں، سنتوں، رشیوں منیوں کے اپدیشوں میں ڈوبا ہندوستان ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ ہم جب جوگ لینا" د سیس نوانا، دھرم کا پالن ہارا" کھیون ہارا" سوامی"، "ست کی سیوا، بلونت، "ساونت"، جھوٹ ساچی مہما" وجگت اجیارا"، "مایاروپی 'ایشورروپی" "سنجوگ، رام بھجن "(عبادت)" بھگتی" بھگت"، امرت دھارا" سنجیونی بوٹی" چند موہن "رام" کرشن" ہمالیہ "گنگا جمنا" جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو ہندوستان کی روایتی پر امن، وفضا کا احساس جاگ اٹھتا ہے جہاں ہر چہار

طرف سکھ شانتی بھائی چارے خلوص وپانانیت کی لہریں موجزن نظر آتی ہیں یہ پرامن پریم و آشتی سے بھری رام کرشن کی بھومی ایسے پرامن پر خلوص و حق پرست معاشرے کی نشان دہی کرتی ہے جہاں کربلا کا سندیش عوام کی زبان پر بے اختیار یہ پیغام لے آتا ہے :

سوامی کتنے دور تئے لگا پریمی بان　　اٹھی لہر فرات سے پہونچی ہندوستان
بھومی رام کرشن کی کربل کا سندیس　　آنسو تمہرے سوگ کے اور گنگا جمنی دیس
دو جگ کے سہارے کیا کہنا، ست جگ کے ستارے کیا کہنا

(نوحہ نجم آفندی)

رثائی ادب میں نوحوں کا کینوس انتہائی وسیع ہے۔ نوحوں نے ہندوستانی معاشرہ کی جیسی جامع اور مکمل تصویر پیش کی ہے۔ یہاں گنگا جمنی تہذیب و قومی یک جہتی کی جیسی منہ بولتی تصویر کشی کی ہے مرثیے ویسی مکمل و حقیقی تصویر پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ مرثیوں کی زبان خالص ادبی رہی اور تہذیب و معاشرے رسم ورواج شہری، لیکن نوحوں نے ایک طرف شہری تمدن کے عوامل کو سمویا تو دوسری تبلیغ کے دایرہ میں آکر عوام کا لب ولہجہ اختیار کرکے، ان کے رسم ورواج وعقائد کی عکاسی کرکے اور انہیں کے جذبات کی ترجمانی کرکے مقصد حسینی کی جس طرح تبلیغ کی اس نے ان کے دائرہ اثر کو مرثیوں کے بالمقابل کہیں زیادہ وسیع کر دیا اور پر اثر بنادیا۔

شوکت، متین، نجم افندی، فضل لکھنوی اور نواب رام پور کے مجموعہ کلام رثائی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں جن کی قومی یکجہتی کے آئینہ میں ادبی حیثیت کو سمجھا اور ایک مقام پر کہا: "اگر نجم افندی کے نوحے نہ ہوتے تو میں مرثیہ نہیں کہہ سکتا تھا" یقیناً یہ پہلی آواز ہے جس نے نوحوں کی ادبی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ میں ادبی حلقہ سے امید کرتا ہوں کہ وہ نوحوں کے جائز ادبی مقام کو روشناس کرائیں گے۔

حواشی:

ا۔ شبلی نعمانی۔ موازنہ انیس و دبیر، تصحیح وترتیب رشید حسن خاں مکتبہ جامعہ دہلی۔
۲۔ انیس شناسی، مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس۔ دہلی
۳۔ ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی، اردو مرثیہ میر انیس کے بعد، ایرانین آرٹ پرنٹر۔ دہلی

۴۔ "القلم" مدیر اعلیٰ سید ضمیر اختر نقوی مرکز علوم اسلامیہ کراچی (پاکستان) شمارہ ۴

۵۔ بیاض نجم، افتخار دپو۔ اسلام پورہ۔ لاہور

۶۔ بیاض نجم، حیدری کتب خانہ امام باڑہ روڈ ممبئی

۷۔ بیاض شوکت مجموعہ نوحے جات

۸۔ بیاض متین مجموعہ نوحے جات

۹۔ بیاض فضل لکھنوی مجموعہ نوحے جات

۱۰۔ مجموعے کلام نواب رام پور (نواب ڈاکٹر سید رضا علیخاں بہادر) سنگیت ساگر" حصہ اوّل

۱۱۔ سرفراز محرم نمبر ۱۹۶۶

۱۲۔ سید معصوم حیدر نقوی "شعراء مورخین اہل بیت کے حضور میں" الاتحاد کراچی (پاکستان) ۱۹۸۰

اپیل

قارئین کرام!

بعض ناگفتہ بہ اسباب و عوامل کی وجہ سے ماہنامہ راہ اسلام کی اشاعت کا سلسلہ ایک مدت تک منقطع رہا اب اسے "فصلنامہ" کی شکل میں آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے اور زیر نظر شمارہ اپنی نوعیت کی پانچویں پیشکش ہے جس کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ آپ لوگوں پر ہے۔ سردست مقالہ نگار دانشمندوں اور شاعروں کی خدمت میں یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ وہ اپنی غیر مطبوعہ اسلامی ادبی اور علمی تخلیقات کی طرح زیر نظر پتہ پر ارسال فرمائیں۔ شعراء و مقالہ نگار حضرات کا مناسب اعزازیہ ان کی ادبی تخلیق کی اشاعت کے بعد ان کے پتہ پر ارسال کردیا جائے گا۔

محمد حسن مظفری

ایڈیٹر

"فصلنامہ راہ اسلام"

۱۸۔ تلک مارگ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

محمد اشرف شاہ بن خضر محمد شاہ

مظلوم و آوارہ وطن

فلسطینی عوام کے حقوق

دنیا میں حقوق انسانی کے تحفظ کے لیے روز روز کانفرنسیں ہوتی ہیں ہیومن رائٹس کے لیے ہزاروں بین الاقوامی اور ملکی سطح کے ادارے اور تنظیمیں کام کر رہے ہیں۔ پانچ ملین سے زیادہ فلسطینی رفیوجیوں کی حالت زار پر کوئی توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ فلسطین جو عربوں کا جائز موروثی اور تسلیم شدہ وطن تھا وہاں یہودی ریاست کا قیام حقوق انسانی کے ساتھ بیسویں صدی کا سب سے بڑا مذاق ہے اور اس جرم میں فرانس، برطانیہ، یو این او اور امریکہ نے سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ترکی خلافت ہر طرف سے خطروں سے دوچار تھی مگر اس کے باوجود غیور سلطان عبدالحمید نے یہودیوں کی فلسطین کے بدلے سلطنت کے قرضے چکانے کے فراخ دلانہ سودے کو سختی سے مسترد کر دیا تھا۔ اُس کے بعد ہی انہیں صیہونی قوتوں نے خلیفہ عبدالحمیدؒ ثانی اور خلافت کو اپنے راستہ کا سب سے بڑا روڑا سمجھ کر اس کا شیرازہ بکھیرنے کی کوششیں تیز تر کر دیں، اور اس کے لیے انھیں دونمہ یہودیوں اور نوجوانوں ترکوں (Young turks) سے زبردست مدد ملی جو خود فری مشنیری کے ایجنٹ تھے، رہی سہی کسر شریف حسین اور ان کے جیسے ضمیر فروش عرب قومیت کے پجاریوں اور اسلام کے غداروں نے پوری کر دی جس کے ہاتھ میں اکثر عرب علاقوں کی باگ ڈور آگئی تھی۔ عربوں میں امیر شکیب ارسلان مفتی امین الحسینی جیسے بابصیرت اور دیدہ ور افراد موجود تھے جنہوں نے اپنی بصیرت سے حالات کی تیز تر تبدیلیوں کو محسوس کر لیا تھا۔ مفتی صاحب کی قیادت میں محب وطن اور اسلام پسند عناصر نے یہودیوں کی فلسطین کی طرف بے پناہ ہجرت کو روکنے اور عربوں کے حقوق کے تحفظ کے سیاسی اور قومی سطح پر زبردست

تحریک چلائی اور یہ مبارک جدوجہد برطانیہ کے لاؤلشکر یہودیوں کی منظم جارحیت اور دہشت گردانہ کار روائیوں سے زیادہ عرب لیگ اور اردن، مصر، سیریا وغیرہ کے دین سے بے بہرہ قومی حمیت سے نا آشنا، بے ضمیر اقتدار کے صریحی لالچی عرب حکمرانوں اور برطانیہ اور یو این او کے فریب میں آئے رہنماؤں کی اپنی کوششوں سے ناکام ہوئی۔[1]

جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

پھر بھی فلسطینی قوم کی لازوال قربانیوں اور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۹ تک چلنے والے قسامی انقلاب کے دباؤ کے نتیجہ میں برطانیہ نے قرطاس ابیض (White paper) شائع کیا، جس میں اس نے آئندہ دس سالوں میں فلسطینی ریاست کے قیام کا وعدہ کیا، اور یہودیوں کے ہاتھوں فلسطینی زمین کا سودا کرنے کا بھی وعدہ کیا نیز یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ ۵ سال بعد فلسطین کی طرف یہودیوں کی ہجرت بھی بند ہو جائے گی۔ لیکن جنگ عظیم اول کے بعد یہودی آبادکار اس طرح مسلح اور منظم ہو چکے تھے کہ انھوں نے پورے فلسطین میں نہ صرف عربوں کے بلکہ خود برطانوی فوجوں کے خلاف قتل وغارت گری کا طوفان برپا کر دیا۔ عربوں نے خود دہشت سے سہم کر اپنے جان و مال کے تحفظ کے لیے بڑے پیمانے پر نقل مکانی شروع کر دی، یو این او نے تقسیم فلسطین کی قرارداد منظور تو کر دی لیکن نہ اس نے اور نہ برطانیہ اور نہ دوسری مغربی قوتوں نے اور نہ عرب حکومتوں نے فلسطینیوں کے حقوق کے تحفظ اور تقسیم کے نتیجہ میں جو رقبہ قانونی طور پر ان کا حصہ بنتا تھا اس کے تحفظ کے لیے کوئی اقدامات کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب برطانیہ نے مقررہ وقت سے پہلے ہی ۱۹۴۵ میں فلسطین سے اپنا بستر گول کیا ایک طرف تو منظم یہودی قوت نے جو ہر طرح تیار بیٹھی تھی برطانیہ کے بجائے امریکہ کو اپنا سرپرست بنالیا اور دوسری طرف ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو ریاست اسرائیل کے غاصبانہ قیام کا اعلان کر دیا پھر ۱۹۴۸ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی بدترین ہزیمت کی وجہ سے فلسطین کی ۷۷ فیصد اراضی پر اسرائیل کا قبضہ ہو گیا، اس وقت کے اعداد و شمار کے مطابق ۹ لاکھ ۲۵ ہزار فلسطینیوں میں سے ۸ لاکھ کے بے خانماں برباد اور آوارہ وطن کر دیا گیا ۵۸۵ فلسطینی گاؤں میں سے ۴۷۸ کو تاراج کر دیا ۴۳ ہزار فلسطینی قتل عام میں مارے گئے فلسطین کی بقیہ زمین کے ایک حصہ کو اردن نے اپنے ساتھ ملالیا جس کا رقبہ ۵۸۷۷ کلومیٹر تھا، اقوام متحدہ نے

اسرائیل کو اپنی رکنیت رہنے کی شرط یہ رکھی کہ بے خانماں فلسطینیوں کو اپنی اراضی میں واپس آنے دیا جائے لیکن یہ وہ شرط ہے جسے اسرائیل نے آج تک پورا نہیں کیا۔ نہ اس کی کوئی پرواکی۔ اقوام متحدہ محض قراردادوں کا ڈھیر لگا کر مسلمانوں کو مطمئن کرنے یا میٹھا زہر دینے کی پالیسی پر گامزن ہے۔ ؎

تو راضی رہے رحمان بھی اور خوش رہے شیطان بھی

۱۹۶۷ء کی جنگ میں عربوں کی دوبارہ شکست کے بعد القدس اور غازہ پٹی بھی اسرائیلی قبضہ و تسلط میں آگئے اور تین لاکھ ۳۰ ہزار فلسطینی مزید آوارہ وطن کر دیئے گئے۔ اسرائیل نے بڑی تیزی سے سرزمین فلسطین کا یہودی کرن کیا۔ مہاجرین کی جائدادیں، آراضی، مکانات، اوقاف کی املاک سب ضبط کر لیے، ۱۹۴۸ء میں اسرائیل نے اس تباہ شدہ زمین پر ۷۵۶ شہر اور بستیاں Settlemants تعمیر کئے ۱۹۶۷ء کے بعد مزید ۱۹۲ بستیاں تعمیر کیے، غازہ پٹی کو چاروں طرف سے سیل کر دیا وہاں بھی ۱۴ یہودی Settlemants تعمیر کیے۔ انھوں نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ آوارہ وطن لوگوں کو اپنی سر زمین کو واپسی قانوناً ممنوع قرار دیدی۔ اور بیرونی یہودیوں کے لیے مزید وہاں آنے اور آباد ہونے کے دروازے کھول دیے۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء سے ۲۰۰۰ء تک دنیا کے مختلف ملکوں سے ۲۸ لاکھ یہودی وہاں آکر آباد ہوگئے۔ ان آبادکاروں کی مجموعی تعداد ۵۰ لاکھ سے بڑھ گئی۔ ؎

فلسطین پناہ گزیں لبنان، اردن، مصر، کویت اور عراق گئے۔ اُردن اور لبنان میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، ایک بڑی تعداد آوارہ وطن لوگوں کے لیے بنائے گئے کیمپوں میں بس گئی ہاں پڑے پڑے ان کی دو نسلیں گزر چکی ہیں جو اس وقت نومولود تھے وہ جوان، جو بچے تھے وہ بوڑھے اور نوجوان اور ادھیڑیا بوڑھے تھے وہ وطن عزیز کی واپسی کی حسرت لیے دنیا سے رخصت ہوگئے، ان پناہ گزیں کیمپوں میں ہی موجودہ وطنی اور آزادی کی تحریکات پل کر جوان ہوئی ہیں اور اسی وجہ سے یہ پناہ گزیں کیمپ بھی اسرائیلی راکٹوں اور غارت گری حملوں کا مسلسل نشانہ بنتے رہے ہیں، صرف اسرائیل میں نہیں بلکہ لبنان میں عیسائی فوجیوں نے اسرائیل کے تعاون سے صبرا اور شتیلا کیمپوں میں فلسطینی آوارہ وطن لوگوں کا قتل عام کیا، اردن میں پاکستانی فوج کی مدد سے ان کے کیمپ تباہ کیے گئے۔ شام اور مصر میں بھی انھیں حکومتوں کی جانب سے بیشمار مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ صہیونی دشمنوں کے خلاف عرب ملک کی

پے در پے شکست اور مجاہدین فلسطین کی سر فروشانہ جد و جہد جن کے باعث مغربی اسلام دشمن میڈیا پوری دنیا کو یہ باور کرتی رہی ہے کہ عربوں اور یہودیوں کی یہ دشمنی بہت پرانی ہے اور اسی وجہ سے یہ لوگ آئے دن بر سر پیکار رہا کرتے ہیں۔ اس زبردست پروپیگنڈہ میں یہ بات بالکل فراموش کر دی گئی کہ ۵ ملین سے زیادہ مظلوم فلسطینی گزشتہ ۶ دہائیوں سے آوارہ وطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور افسوس ناک صورتِ حال یہ ہے کہ عالم اسلام اور عالم عرب سے ان لاکھوں اور آوارہ فلسطینیوں کو کچھ نہیں ملا، بعض ممالک نے تو خود ان کا گلا گھونٹا، اور بعض ممالک سے انھیں زکوٰۃ و صدقات و خیرات کے علاوہ کچھ نہیں مل سکا۔ بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حکومتوں کی زبانی جمع خرچ اور لفظی حمایت و سرپرستی کے علاوہ کچھ نہیں مل سکا۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۲۸ لاکھ فلسطینی کا آبادی 59.5% اپنے ملک سے باہر ہیں اور باقی 40.5% تقریباً ۲۰ لاکھ اسرائیلی حکومت کے جبر کے سایہ میں زندگی گزار رہے ہیں فلسطینی آوارہ وطن لوگوں کی پہلی نسل ختم ہو گئی، آج ان کی دوسری نسل کے لوگ دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی زیادہ تر توجہ تعلیم کے حصول پر ہے اور مستقبل میں یہی نوجوان آزاد ریاست فلسطین کا خواب پورا کر سکتے ہیں۔ فلسطینی آوارہ وطن لوگ جن کیمپوں میں برسہا برس سے پڑے ہوئے ہیں، ان کی حیثیت جنگی جھونپڑیوں سے زیادہ نہیں ہے اور ان میں سے اکثر کیمپوں کو یو ان او کی ریلیف ایجنسی UNRAW علاج تعلیم اور خوراک وغیرہ کی سہولیات فراہم کرتی ہے۔ بعض عرب اور اسلامی تنظیمیں ھیئۃ الاغاثہ، الجزیہ وغیرہ ہیں، جو ریلیف کا اور انسانی امداد کا کام کرتی ہیں۔ لیکن یہ سارے کام اتنے چھوٹے پیمانے پر ہیں اور آوارہ وطن لوگوں کی تعداد ۶۰ لاکھ سے بھی زیادہ ہے اس لیے بالعموم ان کے کیمپ انتہائی خستہ حال، صحت تشویش ناک اور رہائش کی حالت افسوس ناک ہے جس سے عالمی برادری المناک غفلت برت رہی ہے۔ یہ رپورٹ ۱۹۹۳ء کی ہے ظاہر ہے کہ اب ان آوارہ وطن لوگوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہوگا۔ [۳۴]

اوسلو کا ڈرامہ چھاپا گیا جس میں القدس اور فلسطینی آوارہ وطن لوگوں کی واپسی کے مسئلہ پر کوئی بات ہی نہیں ہوئی اور اس کے بعد جتنے بھی مذاکرات ہوئے ہیں ان میں جان بوجھ کر اسرائیل کی جانب سے بھی ان دونوں حساس مسئلوں کو چھیڑا تک نہیں گیا۔ یہودی نفسیات یہ ہے کہ کسی بھی مسئلہ

کو اس حد تک ٹالتے جاؤ کہ وہ دنیا کے ذہن سے محو ہو جائے وہ فلسطینی جو مقبوضہ مغربی کنارے یا غزہ پٹی میں رہتے ہیں ان کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں "ان کے لیے عام انسانوں کی زندگی گزارنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے اب تک ہوئے امن سمجھوتوں کے تحت جن ۱۳۰۰ ۱۱ اہم فلسطینیوں کی آمد و رفت کی اجازت دی گئی تھی اب انھیں بھی اس حق سے محروم کر دیا گیا ہے اور باقی تین لاکھ یا اس سے بھی زیادہ لوگ فلسطینی اتھارٹی اور اسرائیلی تحکم کی وجہ سے دوہرا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔ انھیں مستقلاً ہر طرح کی رکاوٹوں، بندشوں اور ناکابندیوں کا اس حد تک سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ تقریباً سبھی کے لیے آمد و رفت کا سلسلہ بند ہو گیا ہے" وہ مزید لکھتے ہیں کہ انسانی حقوق کا فلسطینی مرکز نے، جو غزہ میں قائم ہے، اسرائیلی افواج کے ذریعہ زمینوں کے قطعات اور سبزی فارموں کو دفاعیٰ سرحد کے نزدیک روندے جانے کے سلسلہ میں ایک دستاویز تیار کی ہے جس کے مطابق یہ کام سرحد کے دونوں طرف کے علاقہ میں کیا جا رہا ہے خصوصاً غوش کاطف کے علاقوں میں غوش کاطف غزہ کا ایک وسیع علاقہ ہے بلکہ پورے غزہ پٹی کا تقریباً گیارہ فیصدی حصہ جس پر ہزاروں یہودی بستیوں کے لوگ قابض ہیں اور جنھیں پانی کی اس قدر فراہمی کی جاتی ہے جس سے وہ اپنے تالابوں کو سیراب کر سکیں، تیراکی کے تالابوں کو بھی بھر سکیں جب کہ اسی علاقہ کے دس لاکھ سے زیادہ فلسطینی باشندوں (جن میں تقریباً آٹھ لاکھ آوارہ وطن لوگ ہیں) کو سوکھے اور پانی کی قلت والی جگہ پر رہنا پڑتا ہے۔ بات یہ ہے کہ سارے مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کا پانی پر مکمل کنٹرول ہے جس کا ۸۰ فیصد وہ اپنے یہودی شہریوں کو دیتا ہے اور پوری فلسطینی آبادی کو راشن سے پانی دیا جاتا ہے اور اس معاملہ میں اسولو میں کوئی بات بھی نہیں ہوئی"۔ ۵

وہ مزید لکھتے ہیں "بطور وضاحت اس بات کا اضافہ کر لیا جائے کہ اسرائیل کے لیے پانی کے سارے ذخیرے مغربی کنارے کے حصے میں ہی ہیں اور یہ کہ پورے ملک کی جو تعریف کی گئی ہے اس میں چار ملین آوارہ وطن لوگوں کو چھوڑ دیا گیا جنھیں اب یہاں لوٹنے کی اجازت نہیں ہے گرچہ کہیں کے بھی رہنے والے یہودیوں کو اب بھی اس بات کا مکمل حق حاصل ہے کہ وہ جس وقت چاہیں واپس لوٹ سکتے ہیں۔ ٦

ان فلسطینی مہاجرین کے ساتھ معاشی، صحت، تعلیم، علاج معالجہ بے پناہ مسائل تواپنی جگہ، ایک بڑا خاندانی انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا ہے۔ ہر خاندان کے افراد اسی طرح مختلف جگہوں پر بکھر گئے ہیں ان کا آپس میں ملنا محال ہے۔ ایک خاندان کے بعض افراد اسرائیل میں ہیں تو دوسرے مغربی ممالک میں یا خلیج کے دوسرے ملکوں میں اور بسااوقات ماں بیٹے، باپ بیٹی اور شوہر بیوی اور بھائی بہنوں میں جدائی واقع ہوگئی ہے اور ان کے آپس میں ملنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اور ملاقات کے اس عدم امکان کی وجہ سے واپسی کا وہ قانون ہے جو رچی منطق کے اعتبار سے دنیا بھر میں عجیب وغریب ہے لیکن ساری دنیا اس پر اندھی بہری بنی ہوئی ہے۔ یہ قانون کہتا ہے "یہودی چونکہ دو ہزار سال سے مستقل فلسطین میں رہ رہے ہیں وہ ان کی آبائی میراث ہے، اسے صرف انھیں کو وہاں رہنے کا حق ہے اس کے بالکل برخلاف جو فلسطینی ملک سے باہر چلا جائے گا اور ایک یا دو سال تک باہر قیام کرے گا تو وہ قانونی طور پر فلسطین میں رہنے کے حق سے محروم کردیا جائے گا۔" واپسی کا یہ قانون (The Law of Return) پہلی مرتبہ جولائی ۱۹۵۰ء میں نافذ ہوا، اس میں دو مرتبہ ترمیم کی گئی اور ہر ترمیم فلسطینی آوارہ وطن لوگوں کے حق میں مزید سخت ہوگئی۔ اب اس کے مطابق ایک روسی یہودی اپنی ماں یا بیوی کے ساتھ (جو خود بھی نقل مکانی کرکے آئی ہو) یروشلم میں رہ سکتا ہے۔ اسی طرح بکھرنے والے فلسطینی خاندانوں کا دوبارہ یکجا ہونا تو دور کی بات ان کی ملاقات بھی ایک بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ نیویارک ٹائمز (جنوری ۱۹۸۶ء) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اسرائیلی حکومت نے ۱۹۸۵ء میں فلسطینی خاندانوں کی ملاقات کے لیے صرف ۱۳۳۰ اجازت نامہ جاری کیے گئے ایک اور رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اسرائیلی حکومت کو ایک لاکھ چالیس ہزار درخواستیں دی گئیں جن میں سے صرف انیس ہزار کو منظوری دی گئی یعنی صرف 13% فیصد کو۔ حالانکہ بین الاقوامی قانون کے ماہرین بالکل واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اسرائیل کی اس پالیسی پر سخت تنقید کرچکے ہیں اور کئی بین الاقوامی وکلاء نے اس طرح کے مقدموں مثلاً ایک فلسطینی خاتون عامرہ کا مقدمہ اسرائیلی عدالت میں داخل کیا، لیکن اسرائیل کی عدلیہ بھی متعصب ہے اس نے مقدمہ کو خارج کردیا خاندانوں کی یکجائی کی ایسی پالیسی میں اسرائیلی ان لوگوں کے ساتھ کافی نرمی برتتے جو ان کے مقاصد کے لیے کام کرنے پر تیار ہو جائیں جو اپنے وطن اور دین وایمان سے غداری کرکے ان کا مفادات

کے لیے کام کریں، ڈاکٹر مظفر احمد کے الفاظ میں ایک ایسی دنیا (بالخصوص مغربی ممالک اور امریکہ) مسلسل رات و دن آزادی جمہوریت اور انسانی حقوق کا راگ الاپ رہی ہے مگر اس کا اطلاق کچھ آدمیوں پر ہو اور کچھ ان سے محروم سمجھے جائیں؟ اور بالخصوص فلسطینیوں کے لیے ہے۔ حقوق انسانی کا دوہرا معیار قائم کیا جائے؟ (یہ میری سمجھ میں نہیں آئی) ۷

اقوام متحدہ ۱۹۴۸ سے لے کر مسئلہ فلسطین کے ساتھ مہاجرین کی حیثیت سے معاملہ کرتا آیا ہے، اور اس تعلق سے اس نے اب تک متعدد قرار دادیں پاس کی ہیں جن میں چند درج کی جاتی ہیں:-

(۱) جنرل اسمبلی کی قرار داد نمبر ۱۹۴ (III) یہ قرار داد دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے منظور کی، اس کے دائرہ میں تین امور تھے (i) مصالحتی کمیشن (ii) یروشلم میں بین الاقوامی طرز کی حکومت (iii) فلسطینی مہاجرین کی "اسرائیل" میں اپنے گھروں کو واپسی کا مسئلہ۔

(۲) قرار داد نمبر ۲۶۳۵B (XXIV) یہ جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۶۹ء کو منظور کی۔ جو تین نکات پر مشتمل ہے:-

(i) وطن واپسی (ii) نقصان کی تلافی (iii) فلسطینیوں کے آزادانہ حقوق کی توثیق۔ اس قرار داد میں فلسطینیوں کے ان تینوں حقوق کے لیے سلامتی کونسل کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ اور ان حقوق کی بحالی میں ناکامی پر اظہار افسوس اور ندامت کیا گیا ہے اور آخر میں سابقہ کئی قرار دادوں کا پھر اعادہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "اسرائیلی حکومت بلا تاخیر مقبوضہ عرب علاقوں کے ان فلسطینی باشندوں کی فی الفور واپسی کے لیے مؤثر اقدامات کرے جو ۱۹۶۷ء کی جنگ کے سبب ہجرت پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور جنرل اسمبلی کی خواہش ہے کہ وہ اپنی قرار دادوں پر عمل کے ذریعہ مہاجر اور آوارہ وطن فلسطینیوں کے زخموں کا مداوا کر سکے۔ ۸

حقوق انسانی سے متعلق بین الاقوامی کانفرنسوں کی قرار دادیں موجود ہیں ان سب کی نفی اور خلاف ورزی اسرائیل پوری بے شرمی اور ہٹ دھرمی کے ساتھ پون صدی سے کرتا آرہا ہے۔ مغربی طاقتیں امریکہ فرانس، یو این او کا ادارہ سب اپنے کو غیر جانب اور انصاف پسند کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ انصاف کا کون سا پیمانہ ہے کہ ذرا سے الزام پر کوڑے لگائے جائیں۔ ایران اور ساؤتھ کوریا کو دہشت

گردملک قرار دیا جائے، سوڈان اور افغانستان پر بلا جواز بمباری کردی جائے۔ لیکن عدل وانصاف کے یہ ٹھیکہ دار عرب علاقوں میں یہودیوں کی آبادی کاری کو غیر قانونی قرار دے کر انھیں فوراً ختم کیوں نہیں کرادیتے۔ باہر سے آئے یہودیوں کو ان کے گھر واپس کیوں نہیں بھیج دیتے، فلسطینیوں کو ان کے اصل حقیقی اور موروثی وطن لوٹنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے ہیں۔ لیکن وہ ایسا کیوں کریں؟ یہ مسئلہ دراصل برطانیہ یو این او اور صیہونی تحریک اور امریکہ کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔ وہ اسے برقرار رکھنا چاہتے ہیں اسی میں ان کا مفاد مضمر ہے اور طرح طرح کے انسانی قوانین بنا کر حقوق انسانی کی دہائی دے کر قرار دادیں پاس کر کے تیسری دنیا کے لوگوں کو بے وقوف بھی بناتے رہے ہیں۔ بقول شاعر 9

وہی قاتل، وہی شاہد وہی منصف ٹھہرے
اقرباء میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

1987 میں لبنان کے چھاپہ ماروں پر وحشت ناک حملہ اور اسی سال تحریک انتفاضہ (مزاحمتی تحریکِ آزادی) نے ایک نئی روح پھونک کر آغاز کیا تحریک انتفاضہ مبارکہ میں مظاہرین کا ہتھیار "پتھر" ہے انتفاضہ کا آغاز بڑے بڑے اجتماعات مظاہروں اور عوامی ریلیوں سے ہوا اس میں بچے نوجوان بوڑھے اور عورتیں بھی حصہ لیتی ہیں انتفاضہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ سازشوں اور لا حاصل قرار دادوں سے لاتعلقی اور اعلان جرأت دکھانا ہے صرف 2001ء میں 615 شہیدوں سمیت 1100 سے زیادہ انتفاضہ مبارکہ میں شہید ہوئے ہیں جن میں تقریباً 300 بچے بھی شامل ہیں 1988 میں یاسر عرفات نے اسرائیل کے حق بقاء کو تسلیم کرتے ہوئے دہشت گردی سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ 1995ء میں یاسر عرفات کو غزہ اور جریکو میں نیم خود مختاری دی گئی۔ 1996ء میں لبنان کے جانبازوں پر دوبارہ حملہ ہوا 2000ء کو ایران کے لاکھوں لوگوں نے فلسطین کے حق میں ریلی نکال کر حمایت کا اعلان کیا اور اسلامی انقلاب ایران میں فلسطین انتفاضہ حمایت کانفرنس ہوئی۔ ایک طرف فلسطین کا لہو عربوں کی گردن پر ہے جواب مزید کوئی جنگ اسرائیل کے خلاف کرنے سے بالکل قاصر ہیں اور دوسری طرف اقوام متحدہ قرار داد پاس کرنے کے سوا اسرائیل کو کسی مجرمانہ ارتکاب سے روک نہیں سکتی کیونکہ دنیا کی بڑی طاقتیں اسرائیل کی سرپرستی کرتی ہیں اسرائیل نے دنیا پر اپنا مکمل کنٹرول حاصل

کرنے کے لیے اپنی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ آویزاں کیے ہیں کہ "اسرائیل تیری سلطنت نیل سے فرات تک ہے"۔ ۱۰

یہاں اصل مسئلہ محض قبلہ اول کی بازیابی کا نہیں ہے کیونکہ قبلہ اول محفوظ نہیں ہو سکتی جب تک بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں ہے اور خود بیت المقدس بھی محفوظ نہیں ہو سکتی جب تک فلسطین پر یہودی قابض ہیں بلکہ اصل مسئلہ فلسطین کو یہودیوں کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کرانے کا ہے۔ مسئلے کا سو فیصد حل یہ ہے کہ اعلان بالفور سے قبل یہودی فلسطین میں آباد تھے صرف وہی فلسطین میں رہنے کا حق رکھتے ہیں باقی جتنے 1917ء کے بعد سے جو اب تک وہاں باہر سے آئے ہوئے ہیں ان غاصبوں کو نکل جانا چاہیے جو زبردستی اس ملک میں قومی وطن اور قومی ریاست بنانے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ۱۱

فلسطین ایک اسلامی مسئلہ ہے تاریخی، تہذیبی اور مذہبی بنیادوں پر اس سرزمین کے حقیقی اور جائز وارث اور حق دار مسلمان ہیں۔ قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام تینوں سے یہ حقیقت صراحت کے ساتھ ثابت ہے جب کہ یہودیوں کا ایسا دعویٰ تاریخی سطح پر ناقابل تسلیم ہے۔ آثار و روایات کے باعث صدر اسلام ہی سے مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ اور فلسطین کے پورے علاقہ کو اپنی دینی، فکری، علمی، رواداری اور تہذیبی تاریخ کا غیر منفک جز تصور کیا ہے۔ 1956ء کے آس پاس علماء فلسطین نجد، ہند، ایران وغیرہ نے فتویٰ دیا تھا کہ اسرائیل کے ساتھ کوئی امن معاہدہ شرعی طور پر جائز نہیں ہے۔ 1979ء میں اسلامی انقلاب نے ہر سال رمضان المبارک کے آخری جمعہ کو "عالمی یوم مقدس" کے منانے کا اعلان کرتے ہوئے فلسطینیوں کے اندر ایک نیا جوش و خروش پیدا کیا۔ امام خمینیؒ کے بقول یوم قدس صرف یوم فلسطین نہیں ہے بلکہ یوم اسلام اور یوم حیات ہے۔ اسلامی انقلاب نے صہیونیوں کے لیے ناامیدی اور فلسطینی مجاہدین کے لیے "آج ایران کل فلسطین" کا نعرہ بلند کیا۔ اس نعرہ کے بدولت آج تک امریکہ اور اسرائیل کے ایوانوں میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ ۱۲

البتہ صورت حال یہ کہتی ہے کہ نہ عرب قیادتیں، نہ امن مذاکرات اور نہ ہی امریکہ اور اقوام متحدہ اس مسئلہ کو حل کر سکتی ہے بلکہ جہاد اور مسلح قتال کیا جائے جیسا کہ فلسطین کی سطح پر چل رہا ہے اور

عالم اسلام عملی طور پر اس جہاد میں شامل ہو اس مسئلہ کا واحد حل ہے چنانچہ اسلام مسلمانوں پر اپنی غصب شدہ زمین کی بازیابی کے لیے جان و مال سے جہاد کرنے کو فرض قرار دیتا ہے۔ اسراء و معراج اور قبلہ اوّل ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے ان کا دین ان پر لازم کرتا ہے کہ وہ دشمن کا سماجی سیاسی، معاشی، ثقافتی اور سیاحتی، الغرض ہر طرح سے بائیکاٹ کریں۔ یہ سرزمین فلسطین جو 27000 مربع کلو میٹر پر مشتمل ہے جس کو کنعان کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا آج تینوں براعظموں کے مابین رابطہ اور پل کا کام دیتی ہے جس کے جنوب میں مصر کے ماتحت صحرائے سینا اور خلیج عقبہ اور شمال میں لبنان اور شام واقع ہیں مشرق میں اردن اور مغرب میں بہت متوسط واقع ہے یہ پڑوسی بھی بے کس اور مجبور ہیں 1948ء سے قبل فلسطین 6 صوبوں اور 16 ضلعوں پر مشتمل تھا آج مکمل طور پر غاصبوں کے قبضے میں ہے۔ ۱۳

ارض مقدس مختلف مذاہب و ادیان کے درمیان اختلاط کی جیتی جاگتی آواز ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ و تمدن اور فرہنگ و ثقافت کا جوہر ہے اس کی صدا پر لبیک کرنا ہمارا فرض ہے عوام الناس کے تقاضے منصفانہ عدالت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مشرق وسطیٰ میں اسی وقت ایک مستحکم صلح قائم ہو سکتی ہے جب ملت اسلامیہ فلسطین کے تمام جائز حقوق بحال ہو جائیں جملہ آوارہ وطن فلسطینیوں کی حق ارادیت، قومی آزادی، خود مختار ریاست اور اپنے وطن کی واپسی۔ بلا تاخیر اسرائیل قبضے والے فلسطینی علاقوں سے نکل جائے بشمول بیت المقدس، اپنی تقدیر کو بنانے اور سنوارنے کا حق مقبوضہ علاقوں کی مکمل آزادی و بازیابی کا حق، مستقل آزاد و آباد وطن کی دولت سے مالا مال ہونے کا حق، پرامن زندگی بسر کرنے کا حق اور فلسطینی مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کو دوستانہ ماحول میں زندگی بسر کرنے کا حق، اس خطے میں مستحکم امن وامان کی بحالی کے لوازم ہیں۔ ۱۴

مظلوم و آوارہ وطن فلسطینی عوام نے حق خود ارادیت کو دوبارہ حاصل کرنے کا ٹھوس ارادہ کر لیا ہے۔ یہی ان کا بنیادی حق ہے جس کا وہ تقاضہ کر رہے ہیں فلسطینی عوام کبھی سمجھوتے، مذاکرات، نیم خود مختاری، صلح غرض جابرانہ روابط پر مشتمل مکارانہ ہتھکنڈوں سے مایوس ہو کر انتفاضہ کی سمت گامزن ہیں جو ان کا حق ہے (کوئی حتمی فیصلہ کرنے کے لیے فلسطین کے آئندہ لائحہ عمل کے سلسلے میں

اس سرزمین کے حقیقی مسلمان، یہودی اور عیسائی باشندوں کے درمیان استصواب عامہ کی تشکیل)
فلسطین کے بچے اور نوجوان طبی سہولیات، حق سالمیت، تعلیمی حقوق اور مستقبل سے متعلق خود فیصلہ کرنے کے اختیار اور دیگر تمام سیاسی، اقتصادی، اجتماعی، ثقافتی، شہری حقوق جن کا حقوق بشر کے قانونی دائرے میں اعتراف کیا گیا ہے بلکہ پوری کیا جائے۔ جو کہ زندگی گذارنے کے بنیادی حق سے بھی محروم ہیں جو کہ ایک فرد بشر کا دنیا میں پہلا حق ہے۔ بیت المقدس کو فلسطین کا صدر مقام بنانا اور فلسطینی عوام کی پسندیدہ حکومت کا قیام، موجودہ باشندوں کے سلسلے میں فلسطینی عوام کا آخری فیصلہ۔ یہ سب حقوق میں شامل ہیں۔ ۱۵

غزہ جریکو جو اسرائیل کے اثر ورسوخ پر چل رہا ہے ان کو مکمل حق خود ارادیت دی جائے مقبوضہ علاقوں میں 1967ء کی جارحیت کے سبب آوارہ ہوئے لوگوں کو شہری حقوق دینا۔ مقبوضہ علاقوں میں لوٹ کھسوٹ کو روکنا۔ آثار قدیمہ اور ثقافتی ورثہ کو لوٹ کھسوٹ سے روکنا۔ مقبوضہ علاقوں میں مساجد کی عبادت کرنے دینا، مستقل زیادتیوں کو بند کر کے انسانی حقوق اور فلاح وبہبود کے کام کو شروع کرنا تاکہ مزید انسانی حقوق کی پامالی نہ ہو۔ سرحدوں کی ناکہ بندی اور چلنے پھرنے پر لگی پابندیوں کو ختم کرنا، اقوام متحدہ کو تباہی اور لاپرواہی ختم کر کے لوگوں کے اہم دستاویزات اور ان کی زبانی اطلاعات پر غور کرنا، لوگوں کے حرکات وسکنات اشیاء خوردنی کی چیزیں بحال کرنا، زمین کو ناجائز طریقے سے ضبط کر کے ناجائز طریقے سے تعمیر کرنا، اسرائیل کی تعمیرات کی توسیع بند کرنا، اسرائیلی وحدت کی توسیع پر روک لگانا، بلکہ فلسطینی گھروں کی از سر نو تعمیر و توسیع کرنا، اور فلسطینی انتظامیہ اور عام بے گناہ قیدیوں کو رہا کرنا، ماحول استوار کرنا، مقبوضہ علاقوں میں وہ کام کرنے والے جو ملازمت پر انحصار کرتے ہیں ان کے لیے اسرائیل کے وسائل میں تخفیف کرنا۔ سیریا کے لوگوں کو اپنی شناخت بنانے کا حق، اسرائیلوں کے ذریعہ سیریا غیلان کے آثار قدیمہ کے چوری ہوئے سامان کی واپسی 1967ء میں 244 گاؤں تباہ کر دیئے گئے ان کی آبادکاری کی جائے اور ایسے مجرموں کے خلاف کارروائی کی جائے۔ یہ سب آوارہ وطن لوگوں کے حقوق ہیں۔ ۱۶

ٹینک اور آتش گیر مادہ کے ذریعہ فطرت کو بگاڑنا بند کرے۔ ہزاروں سال سے صحیح تبرکات

اور آثار قدیمہ کو پہنچائے گئے نقصان کی بحالی۔ مقبوضہ علاقوں میں سرنگیں بچھانا جس کے سبب مویشی اور دوسرے جانور ہلاک ہو جاتے ہیں اور کاشت کاری کی زمین کاشت کے لائق نہیں رہتی۔ ایسی کار روائیوں پر پابندی اور زراعت کی زمین کی واپسی، کیونکہ اسی پر فلسطینیوں کا انحصار ہے، ہسپتالوں میں غیر معمولی دوائیوں کی عدم دستیابی کو ممکن بنانا۔ اسرائیلی فیکٹریاں زہر بیار کر کے سیریا، ویسٹ بنک اور دوسرے قبضے والے علاقوں میں لوگوں کو کھلا کر مار دیتی ہے ایسی کار روائیوں پر پابندی لگائی جانے کی جدو جہد کرنے دینا۔ روزانہ کے اخبار و جرائد پڑھنے کی آزادی فراہم کرنا۔ برّی او بحری مناظر کو تباہی سے بچا کر ماحول کو گندہ کرنے سے روکنا۔ ۱۷

بطور خاص تقریباً 210 آثار قدیمہ کے مقامات سے سامان کی ضبطی کی واپسی۔ فلسطینیوں کے حالات پوری دنیا کو باخبر رکھنے کے لیے میڈیا کو آزاد رکھنا۔ بے شمار دیہات دواؤں کے عدم دستیابی سے پریشانی میں مبتلا ہیں کوئی ہسپتال نہیں ہے کوئی لائق ڈاکٹر نہیں، کوئی سرجن نہیں، طبی امداد کا کوئی سینٹر نہیں، بگڑی صحت کے سبب بے شمار مشکلات کا سامنا کر کے نہ جانے کتنے لوگ مر جاتے ہیں۔ لہذا! ان سب چیزوں کی بحالی، غیلان میں کوئی ہسپتال یا لیبارٹری نہیں، کوئی مرکز بہبود بچگان نہیں۔ کوئی ایکسرے سینٹر نہیں، ایمرجنسی کا کوئی سینٹر نہیں، کم توجہ اور غفلت میں یہاں کے اکثر لوگ صحت کی خرابی میں مبتلا رہتے ہیں لہذا ان سب چیزوں کو بحال کیا جائے۔ غیلان اور دوسری جگہوں پر بے شمار لوگ تعلیم کے شوقین ہیں لیکن ان کو تعلیم سے محروم رکھا گیا ہے فارم 50 ڈالر کا ہے اگر کوئی فارم بھرنا برداشت کر بھی لے گا تو اس کو اپنے گھر سے نکلنے کے لیے کئی سرنگوں کے اوپر سے گذرنا پڑتا ہے علاوہ ازیں کلاس فیس سالانہ ٹیوشن فیس وغیرہ یعنی 10 ہزار ڈالر کی ضرورت ایک طالب علم کو ہے فلسطینی آوارہ نوجوان جس کے پاس کھانے پینے کے لیے پیسے نہیں وہ اتنے پیسے کہاں سے لائے گا یہ ظلم و تشدد بند کر کے ان کو مرضی کے مطابق مفت تعلیم دی جائے اور مناسب تعلیمی مراکز قائم کیے جائیں۔ ۱۸

فن علاج دندان، دواسازی، وکالت یا قانون کی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے ہیں یہ تفرقہ ختم کیا جائے۔ 1967ء سے اسرائیلی تعلیمی نصاب اپنا کام کرتا ہے جس کا واحد مقصد جابرانہ اسرائیلی پالیسی کی

تعلیم دلا کر عرب اور فلسطینی تاریخ وادب کو ان کے ذہن سے نکالنا ہے۔ فلسطینیوں کو اپنی اصلی عربی زبان میں ہر علوم وفنون کی تعلیم کا حق حاصل ہے اسرائیل ہبرون (الخلیل) کی زبان کو مسخ کر رہا ہے لہذا ان کو اپنی زبان کی شناخت بنانے کا حق ہے اسرائیل اپنی تعلیمی نصاب کے ذریعہ عرب قومیت کی شناخت کو مٹا رہا ہے اور اگر کوئی تعلیم یافتہ شخص استاد بننے کے لائق بھی ہے تب بھی اس کو استاد بننے نہیں دیا جاتا ہے اتنا ہی نہیں بلکہ سست اور کمزور ذہن پیدا کرنا مقصود ہے جس سے ان کے دل میں جمی ہوئی قومیت کی شناخت ختم ہو جائے لہذا فلسطینیوں کو اپنی اسلامی تعلیم نصاب کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے۔ ۱۹

غیر قانونی آبادکاری بند کر کے اقوام متحدہ کی طرف سے فلسطینیوں کو مکمل تحفظ فراہم کرنا، اقوام متحدہ کا اسرائیل کی غیر قانونی کارروائیوں کے خلاف کارروائی کرنا اور فلسطینی اتھارٹی کے ساتھ مضحکہ خیز سلوک بند کرنا، اسرائیل کو اقوام متحدہ کا بین الاقوامی امداد دینا بند کرنا اور فلسطین کے ساتھ بھر پور تعاون کرنا۔ اقوام متحدہ ویٹو کے ذریعہ فلسطینیوں کو مساوی حقوق کو بحال کرنا۔ لڑائی کے وقت شہری حقوق کا لحاظ کرنا۔ قدرتی وسائل کا تحفظ کرنا۔ فلسطین کی تاریخ کو بگاڑنے پر اقوام متحدہ کا اسرائیل کے خلاف کارروائی کرنے دینا۔ اسرائیل کا عام شہری فلسطینیوں کے خلاف حد سے زیادہ فوجی طاقت کو روکنا۔ فلسطینیوں کو سیاحت اور سفر کرنے کا حق۔ فلسطینیوں کو اقوام متحدہ کے اجلاسوں میں شرکت کرنے کا حق ہے۔ الغرض اسرائیل یعنی یہودیوں یا راندہ لوگوں کا فلسطین سے انخلاء۔ ۲۰

3.7 ملین فلسطین مہاجرین UNRWA کے یہاں رجسٹری کر چکے ہیں جو مہاجر کیمپوں میں رہتے ہیں آوارہ وطن کہلاتے ہیں وہ اپنی امیدیں اور خواہشات پوری نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہیں اس وقت ان کا انحصار اقوام متحدہ کے ادارہ اعانۃ المہاجرین یا فلسطین سے باہر ممالک کے صدقہ وزکوۃ پر ہوتا ہے لہذا ان کو اپنی امیدیں خواہشات اور اپنے گھروں کو واپسی کا حق ہے۔ ان کے اجڑے ہوئے گھروں کا معاوضہ ان کو ملنے کا حق ہے۔ شہروں، دیہاتوں کی جغرافیائی اور قانونی مرتبہ بحال رکھنے کا حق ہے لبنان جولان اور دوسرے عارضی جگہوں پر مقیم فلسطینیوں کو مستقل فلسطین میں رہنے کا حق ہے۔ ۲۱

امریکہ اسرائیل کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور اسرائیل امریکہ کا مغز ہے اور فلسطینی امریکہ کو اپنا ایک نمبر دشمن تصور کرتے ہیں کیونکہ امریکہ اسرائیل کی پشت پناہی کر کے سالانہ چار ملین ڈالر امداد فراہم کرتا ہے جس کے سبب اسرائیل کے پاس دو سو نیو کلیائی بم اور لا تعداد دوسرے تباہ کن ہتھیار موجود ہیں۔اس لیے فلسطینیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ انھیں دوسروں پر بھروسہ کرنے کے بجائے مسئلہ خود حل کرنا ہے۔اس لیے گزشتہ پندرہ ماہ سے وہ اس سمت میں ایک نئے جوش و جذبہ کے ساتھ جدو جہد کر رہے ہیں جوان کا حق ہے۔ ۲۲

اب تک چار ملین 90 نوے ہزار فلسطینی جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں دو ملین شرق قدس اور مغربی کنارہ میں رہ رہے ہیں ایک ملین سے زیادہ غزہ میں اور اسی طرح اردن، سیریا اور کئی ہزار لبنان میں آوارہ وطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں لہذا ایسے میں پانچ ملین لوگ بلا تاخیر اسے اپنے گھر اور وطن واپسی کا حق رکھتے ہیں۔ ہبرون میں 30,000 فلسطینی کرفیو کی وجہ سے اپنے گھروں میں گرفتار رہتے ہیں اور 30,000 یہودی اس کرفیوں سے مستثنٰی ہیں۔لہذا ایسے میں ہبرون کے ان قیدیوں کو اپنے خواہشات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق ہے۔ الغرض نسلی امتیاز و تفرقہ کا خاتمہ کرنے کا فلسطینی حق رکھتے ہیں۔ فلسطینیوں کے بقول اسرائیل مقبوضہ علاقوں کے یہودیوں کو مسلح کرنا بند کر دے۔انتفاضہ کی لگاتار مہم اور فلسطینی عوام کی منصفانہ جدو جہد ان کا حق ہے کیونکہ انتفاضہ تحریک بعض وجوہات کی بنا پر اسلامی انقلاب سے ملتی ہے۔ ۲۳

فلسطینیوں کو 1922ء کے ڈرامہ کے بجائے مذہبی، قانونی، شہری اور سیاسی حقوق رکھنے کا حق حاصل ہے اخلاقی اور قانونی حقوق اس وقت تک روبہ عمل نہیں آتے جب تک سیاسی حق قائم نہیں ہو جاتا اور یہ سیاسی حق بغیر قوت کے حاصل نہیں ہو سکتا۔لہذا امریکہ اسرائیل کی پشت پناہی بلا تاخیر بند کرے یہی پشت پناہی فلسطینیوں کے حقوق کی پامالیوں کا تادم سب سے بڑا چیلنج اور عنصر ہے۔ اس شیطان امریکہ کے خلاف فلسطینی کسی بھی طرح کی کوئی بھی کارروائی کا بھرپور حق رکھتے ہیں۔ ۲۴

اسلام ایک نوجوان آفاقی مذہب ہونے کے ناطے ۱۴۲۲ سال کا ہے اور شیطان یہودی اور عیسائی سال خوردہ ہو چکے ہیں لہذا تسلط و سرکوبی کے خلاف جائز جدو جہد کی حیثیت سے انتفاضہ فلسطین

کی بھرپور حمایت کی کوشش کر کے حملہ اسلامی ملکوں کی طرف سے اسرائیل کی مکمل تحریم، جنگی جرائم کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کے لیے مقبوضہ فلسطین میں اقوام متحدہ کی طرف سے ایک عدالت کی تشکیل نو کی ضرورت، مقبوضہ فلسطین میں رونما ہونے والے انسانیت سوز واقعات کے تجزیہ کے لیے ایک غیر جانبدار تحقیقاتی کمیشن کی تشکیل کے لیے مسلمان ملکوں کی مشترکہ سفارتی جدو جہد، تاکہ سر زمین فلسطین پر فلسطینی عوام کی حکومت کی تعمیل کی زمین ہموار ہونے کے لیے بیت المقدس کو دارالحکومت قرار دیتے ہوئے ایک فلسطینی حکومت کی تاسیس کی حمایت، موجودہ دور کے فوری عوامل ہیں۔ ۲۵

البتہ بیت المقدس کی آزادی اور مظلوم و آوارہ وطن فلسطینی عوام کے حقوق کی بحالی کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ تمسک بالقرآن والسنہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اور سامراجی تفرقہ ور نسلی نفاق سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے ایک متحدہ اسلامی محاذ کی تشکیل نو کی ضرورت ہے۔ امام خمینیؒ کے ارشادات اور پیغامات کی روشنی میں ایران کی سرپرستی میں ٹھوس اور موثر قدم اٹھائے جائیں تاکہ اسلامی سرزمین اور قبلہ اول کی آزادی حاصل کر کے لاشرقیہ ولاغربیہ اسلامیہ ایرانیہ جیسے بنیادی اسلامی نعرے کی مدد سے ملک میں اسلامی جمہوری حکومت کی تشکیل عمل میں لائی جائے۔ ۲۶

اسلامی ممالک کے سربراہان بالخصوص عرب حکومتیں باہمی اتحاد اور وحدت کلمہ کے پابند رہ کر خداوند متعال کی نصرت سے خارجی حملہ آوروں کی نابودی اور اسلامی حکومتوں کی حقیقی آزادی کے خواستگار بن جائیں۔ گویا دنیائے اسلام کی معنوی حمایت درکار ہے سرزمین فلسطین میں فلسطینی عوام کی جدو جہد کو جاری رکھنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے اور انھیں جن چیزوں کی ضرورت ہو اسے فراہم کرنے میں ذرہ برابر کوتاہی نہیں کرنی چاہیے تاکہ وہ مکمل آزادی حاصل کر سکیں فلسطین کو روزانہ دس ملین ڈالر کا خسارہ ہوتا ہے ایک ملین ۲۵ ہزار فلسطینی اپنے پیشوں سے محروم ہیں ان پریشانیوں کو فوری حل کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ عربوں نے ۱۵ ٹریلین ڈالر اب تک فلسطین پر خرچ کیے ہیں لیکن وہ عملی طور پر جہاد میں شریک نہیں ہو رہے ہیں کیونکہ اب ان کی ریڑھ کی ہڈی امریکہ بن چکا ہے لہذا عرب اپنی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی پوری کریں دشمنوں کے ساتھ ہمارے لین دین کے تعلقات،

ان کے ساتھ خرید و فروخت کا معاملہ اور ان کے دیار سفر کرنا، اقتصادی، اور مادی فوائد پہنچانا الغرض اسرائیل امریکہ اور دوسرے اسلام دشمن عناصر کے مصنوعات کے استعمال کا مکمل بائیکاٹ کریں قصہ کوتاہ ہر طرح کا ان کو تعاون کرنا ہمارے اوپر حرام ہے امت مسلمہ کو اقصیٰ کے تحفظ کے لیے سوچنا چاہئے تاکہ قدس کا معاملہ ہمیشہ ہمیشہ دلوں میں جاگزیں رہے اور بھولنے کا سوال ہی نہ پیدا ہو۔ ۲۷

(اے اللہ ہمیں بیت المقدس کی آزادی کے خاطر صحیح جد و جھد کرنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین)

حوالے :

۱۔ فلسطین ماضی، حال اور مستقبل ص 1-7

۲۔ فلسطین ماضی، حال اور مستقبل ص 24-49-59

النورہ ص 1

البعث ص 8

۳۔ فلسطین ماضی، حال اور مستقبل ص 45-46

Palestine Documents-

۴۔ فلسطین ماضی، حال اور مستقبل ص 48-70

Resolution A/56/491, 22 Oct. 2001 ص 45-46-47

۵۔ فلسطین ماضی، حال اور مستقبل ص 160-161

فلسطین تاریخ، پس منظر، صورت حال (سہ روزہ دعوت) ص 91-92-93

۶۔ فلسطین ماضی، حال اور مستقبل ص 165-166

۷۔ فلسطین ماضی، حال اور مستقبل ص 170-171-172

معارف دار المصنفین جولائی اگست ص 81-82-83

۸۔ فلسطین تاریخی پس منظر، صورت حال سہ روزہ دعوت ص 37-38-39

Resolution A/56/1491, 22 Oct. 2001 ص 12-13-14-15

۹۔ معارف دارالمصنفین جولائی اگست ص83-82-81

۱۰۔ فلسطین تاریخی، پس منظر، صورت حال ص 110-86-85-84

راہ اسلام شمارہ:۱۸۱۔ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱ء ص 53-52

۱۱۔ فلسطین تاریخی، پس منظر، صورت حال ص 62-61

۱۲۔ راہ اسلام شمارہ ۱۸۱/ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱ء ص 12-11

جمعۃ الوداع یوم قدس ص18

۱۳۔ Palestine Documents ص 1-2

فلسطین تاریخی، پس منظر، صورت حال ص 121-120

۱۴۔ راہ اسلام شمارہ ۱۸۱/ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱ء ص 47-46

۱۵۔ بیت المقدس تاریخ کے آئینے میں ص 23-22-21

راہ اسلام شمارہ ۱۸۱ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱ء ص 52-51-50

فلسطین تاریخی، پس منظر، صورت حال ص146-145

Havana 12 June 2001

۱۶۔ راہ اسلام شمارہ ۱۸۱۔ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱ء ص 106-105-104

rasalution- A/Ac 183/E2/ Add. 22-23 April 2001

فلسطین تاریخی، پس منظر، صورت حال ص 89-88

۱۷۔ Bulletin 5 - September-Obtober 1991 ص 8-9-10

۱۸۔ Bulletin 6- November 1999 ص 11-12-13

فلسطین تاریخی۔ پس منظر۔ صورت حال 73-72

۱۹۔ Rasolution A/56/491, 22 October 2001 ص 48-49-50-51

۲۰۔ راہ اسلام شمارہ ۱۸۱ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱ء ص 72-71-70

Madrid July 2001 ص 4-5

۲۱۔ Rasolution A/56/491- 22 October 2001 ص 28-29-30-31

۲۲۔ فلسطین تاریخی پس منظر صورت حال ص 142-144

۲۳۔ التورہ ص1

البعث ص8

راہ اسلام خصوصی شمارہ۔ جنوری، فروری، مارچ ۲۰۰۱ء ص 106-107

۲۴۔ راہ اسلام خصوصی شمارہ ۔ جنوری، فروری، مارچ ۲۰۰۱ء ص 106-107

109 Bulletin Human Rights ص 10-11

۲۵۔ فلسطین تاریخی، پس منظر، صورت حال ص 163-164

راہ اسلام شمارہ:۱۸۱ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱ء ص 107-108

۲۶۔ فلسطین تاریخی، پس منظر، صورت حال ص 172-108

۲۷۔ فلسطین تاریخی، پس منظر، صورت حال ص 122-123-124

راہ اسلام۔ شمارہ ۱۸۱۔ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱ء ص 50-51

❁❁❁

معراج

دیں گے گواہی میرے گناہوں کی شان سے
یہ ہاتھ پاؤں لگتے ہیں جو مہربان سے

معراج کو بھی دیکھو خلا کے مسافرو
ملتی نہیں بلندیاں اونچی اڑان سے

ممکن نہیں نبیؐ کی بلا فصل معرفت
ہٹ جائیں بوتراب اگر درمیان سے

انگلش نے قبضہ کرلیا ہندوستان پر
ہندی کی جنگ جاری ہے اردو زبان سے

پہچان ایک یہ بھی نادان دوست کی
آنکھوں سے بات سنتا ہے دیکھے گا کان سے

اسرا میں قربتِ نبویؐ لامکان سے
لگتا ہے مل رہی زمیں آسمان سے

آغاز شاندار ہے آخر کی شان سے
پہچانئے رسولؐ کو صاحب زمانؑ سے

پہلا سبق ہے مشق مساوات کے لئے
گھر پھوس کے نہ دیکھئے اونچے مکان سے

قرآں ہمیں سمجھنے کا، رٹنے کا شوق انھیں
ہم کو دیا نبیؐ نے وہ لائے دوکان سے

دن کٹ رہے ہیں جنگ میں راتیں نماز میں
ترسٹھ برس کی عمر میں بھی نوجوان سے

تیغ وطبر کا کام کیا گلشن کی سیر میں
رن میں رسول گھومتے پھرتے ہیں شان سے

"ماینطق" کے پہرے میں گذری تمام عمر
مرضی سے ایک لفظ نہ نکلا زبان سے

توبہ کرو ہے وقت ابھی چھوٹے بھائیو
واپس نہ تیر آئے گا چھٹ کر کمان سے

پتھر شکم پہ باندھ لیا اس رسولؐ نے
وابستہ جس کی بھوک ہے جنت کے خوان سے

بے سایہ عمر بھر رہا پیکر رسولؐ کا
گذری ہے روشنی بھی عجب امتحان سے

وابستہ انکساری نبیؐ سے رہو دبیر
رستہ ہے خلد کا اسی ٹوٹے مکان سے

دبیر سیتاپوری

از: ڈاکٹر اختر مہدی

عزاداری حسین مظلوم۔ ایک اجمالی تجزیہ

اسلامی کلنڈر کے بموجب محرم سال کا پہلا مہینہ ہے اور تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ طلوع اسلام سے قبل ہی نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے پہلے سے ہی ہر سال کے پہلے دن کا غیر معمولی مسرت و خوشحالی سے استقبال ہوتا رہا ہے اور اسلام سے قبل ایران میں رائج زردشتی مذہب کے لوگ اس دن کو عید نوروز کے نام سے یاد کرتے تھے چنانچہ سرزمین ایران میں اسلام کی آمد کے بعد بھی جشن نوروز کا سلسلہ جاری رہا اور موجودہ اسلامی جمہوری حکومت کے زمانہ میں بھی ایران میں جشن نوروز کا غیر معمولی اہتمام کیا جاتا ہے بس فرق یہ ہے کہ اسلام کی آمد کے بعد نوروز کے موقع پر جملہ روایتی رسومات کے ساتھ ہی ساتھ کچھ دعاؤں کا اضافہ کر دیا گیا ہے لیکن غیر مسلم ایرانی افراد اس جشن کو اپنی قدیم روایات کے مطابق مناتے ہیں۔ ملت اسلامیہ عالم بھی ۶۰ھ سے پہلے تک تو سال کے پہلے دن یعنی یکم محرم الحرام کو جشن مسرت کا اہتمام کیا کرتی تھی لیکن ۶۱ھ میں سرزمین کربلا میں نواسۂ رسول حسین مظلوم کی شہادت کے بعد پوری اسلامی دنیا غیر معمولی سوگ میں ڈوب گئی اور اس کے بعد سے لیکر آج تک یعنی گذشتہ چودہ سو سال کے دوران محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی پوری امت اسلامیہ ایک سوگوار جماعت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور دنیا کے ہر گوشہ میں نواسۂ رسول سے عشق و محبت رکھنے والا ہر مسلمان سوگوار نظر آنے لگتا ہے اور روز عاشورہ تو تنہا مسلمانوں کو ہی نہیں غیر مسلموں کو بھی حسین کا عزادار بنا دیتا ہے۔ غور طلب بات ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے اور شہادت حسین کو یہ فضیلت اور ان کے غم کو یہ تازگی کیوں حاصل ہے؟ خود ماہ محرم کی عظمت و اہمیت کا راز کیا ہے اور کیا سبب ہے کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کے درمیان حسین مظلوم کا تذکرہ اور

ان کے غم میں سوگواری وعزاداری کا اہتمام کیا جاتا ہے؟ البتہ ہر فرقے میں سوگواری وعزاداری کا انداز جداگانہ ہے اور یزیدی جماعت کے علاوہ مسلمانوں کی ہر جماعت غم حسین میں سوگوار دکھائی دیتی ہے۔

امام حسینؑ کے عظیم الشان انقلاب اور ان کی دردانگیز شہادت اور تاریخ اسلام کی اس تابناک اور تاریخ ساز شخصیت کی عزاداری کے بارے میں اب تک بیشمار کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور مختلف مذاہب ومسالک کے نامور دانشمندوں نے اس موضوع پر جو کتابیں اور مضامین شائع کئے ہیں وہ آج ہمارے درمیان بطور یادگار موجود ہیں اور حق کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ لکھا جائے کیونکہ ایک طرف تو حسینؑ رسول خدا حضرت محمدؐ کے نواسے اور ان کی اکلوتی بیٹی حضرت زہرا کے نور چشم اور جملہ مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق اہل جنت کے سید وسردار ہیں اور دوسری طرف انھوں نے مکتب قرآن، دامن جد بزرگوار اور وحی پروردگار کے سایہ میں تربیتی منزلیں طے کی ہیں اس کے علاوہ رسول مقبول کی متعدد احادیث بھی موجود ہیں جس میں انھوں نے اہل بیت رسالت سے محبت اور مودت پر بڑی تاکید کی ہے اور اسے اجر رسالت قرار دیا ہے۔

لیکن پیغمبر اسلام اور صحابہ بزرگ اسلام کا دور ختم ہوئے ابھی زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا اور ابھی امت اسلامیہ کے درمیان ایسے محدثین بقید حیات تھے جنھوں نے حدیث ثقلین کو خود پیغمبر کی زبان سے سنا تھا اور اس حدیث کو لوگ سینہ بہ سینہ دوسرے لوگوں تک پہونچانے میں لگے ہوئے تھے کہ کتاب خدا اور اہل بیت نبوت خداوند عالم اور اس کے رسول کی جانب سے امت اسلامیہ کے لئے دو بڑی امانتیں ہیں اس کے باوجود منافق جماعت کے لوگوں نے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کو انحراف کا شکار بنانا شروع کر دیا تھا یہاں تک کہ وہ وقت بھی آگیا کہ اسلامی اقتدار وخلافت کی باگ ڈور یزید کے ہاتھ میں آگئی اور اس نے اسلامی احکام کی اعلانیہ خلاف ورزی کے ساتھ ہی ساتھ وارث رسول حسین مظلوم سے بیعت کا مطالبہ شروع کر دیا۔ درحقیقت بیعت کا مطالبہ فقط یزید کی جانب سے نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے وہ جماعت لگی ہوئی تھی جس کے آباء واجداد نے نصف صدی قبل اسلام کا اعلانیہ مقابلہ کیا تھا اور شرمناک شکست کی وجہ سے جس کے پاس اسلام قبول کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا چارۂ کار باقی نہ رہ گیا تھا لیکن گذشتہ ۶۰ سال کے دوران اس جماعت کی بھرپور کوشش یہی تھی

کہ اسلام جس نے ان کے خاندان کے بزرگوں کے ناجائزاقتدار کو ختم کردیا تھاوہ کسی طرح رو بہ زوال ہو جائے اور وہ پیغمبرؐ کی نسل سے اپنے بزرگوں کے خون کا بدلہ لے سکیں۔ در حقیقت حسینؑ مظلوم سے طلب بیعت کا اصل مقصد یہ تھا کہ اسلامی خلافت کو درباری خلافت وملوکیت میں بدل کر قیصر وکسریٰ کی طرح بنی امیہ کو امت اسلامیہ کے سر پر مسلط کردیں اور یزید کی کالی کرتوتوں کو اسلامی اعمال کی حیثیت سے دنیاوالوں کے سامنے پیش کردیا جائے لیکن امام حسینؑ نے مطالبۂ بیعت کو ٹھکرا کر اس منافق جماعت کے منصوبے پر پانی پھیر دیا لہٰذا ان لوگوں نے انھیں خلافت مسلمین کا باغی قرار دیتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ جیسے بھی ممکن ہو اسلام دشمن سازش کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے والے اور غاصب حکومت کے خلاف جدو جہد کرنے والے اس کوہ ہمالیہ کے مبارک وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں اور امت اسلامیہ اس عظیم شخصیت کی سرپرستی سے محروم ہو جائے۔

بہر حال ایسے منافقانہ اور زہر آلود ماحول میں حسینؑ مکہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ ایک ذمہ دار قائد ورہبر کی حیثیت سے وہ دیکھتے ہیں کہ اگر خاموش رہیں تو اسلام ایک حکومتی مذہب اور ملوکیت کی شکل اختیار کرلیتا ہے جس کے نتیجے میں اسلام محض ایک فوجی اور سیاسی طاقت کے علاوہ کچھ نہیں رہ جاتا وہ اس وقت دو ناممکن چیزوں کے درمیان گھرے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ خاموش بھی نہیں رہنا چاہتے کیونکہ وقت ہاتھ سے نکلا جارہا ہے اور اسلامی اصول وعقائد کی پامالی کا سلسلہ جاری ہے اور اسلام تنہائی ولاوارثی کے عالم میں ہے اور منافق جماعت موجودہ اختلافات سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے اپنے مفاد کے پیش نظر حقائق دین میں خاطر خواہ انحراف پیدا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہے اور پیغمبرؐ نے جن اغراض ومقاصد عالیہ الٰہی کی خاطر طرح طرح کی زحمتیں برداشت کی تھیں وہ بری طرح پامال کئے جارہے ہیں اور ایسی نازیبا حرکتوں کو عام رواج اور فروغ حاصل ہو رہا ہے جس کی اسلام نے سخت ممانعت کی تھی۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ فکر سرگرداں و پریشان ہے۔ شخصیتیں فروخت ہو چکی ہیں۔ وفادار ساتھیوں کی تعداد کم ہے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے اور اسلام کی جماعت میں کسی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں ہو رہی ہے۔ زبانیں قلم کی جاچکی ہیں حق کی حمایت کا اظہار کرنے والے لب خاموش ہیں۔ ظلم

وجود کے دھاگے سے ان ہونٹوں کو سی دیا گیا ہے جو حق کی حمایت میں آواز بلند کر سکتے تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ حقیقت کی چھاؤنی کو ویران کیا جا چکا ہے تاکہ اس کے سایہ میں کوئی حق پسند پناہ نہ لے سکے۔ ظاہر ہے ان حالات کو دیکھنے کے بعد حسینؑ کیسے خاموش رہ سکتے ہیں۔ ظلم و فساد کے خلاف جنگ و نبرد آزمائی ان کی ذمہ داری ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ جنگ کریں تو کیسے؟ ان کے پاس کوئی سامان جنگ بھی تو نہیں ہے مختصر یہ کہ وہ ایک ایسے طاقتور حاکم کے چنگل میں گرفتار ہیں کہ نہ فریاد کر سکتے ہیں اور نہ خاموش رہ سکتے ہیں۔ نہ سر تسلیم خم کر سکتے ہیں اور نہ حملہ کر سکتے ہیں۔ تنہا خالی ہاتھ کھڑے ہوئے ہیں مگر ان کے کندھے پر ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ موجود ہے اور فاطمہؑ کی آغوش کا پروردہ حسینؑ غور و فکر کے سمندر میں ڈبکیاں لے رہا ہے۔ موت کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا اسلحہ بھی نہیں ہے۔ لیکن اس کے چہرہ پر خوف و دہشت اور مایوسی و ناامیدی بالکل نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ یہ تنہا مجاہد دشمن کی اتنی بڑی فوج کے مقابلے میں اپنی کامیابی کے لئے پوری طرح مطمئن ہے۔

میدان کربلا میں شہادت کا عظیم و نامور معلم حسین اپنی مثالی قربانیوں کے ذریعہ ان لوگوں کو درس دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ہے جو جہاد کے لئے طاقت و توانائی اور فوج و اسلحہ کو لازمی سمجھتے ہیں اور دشمن پر غلبہ حاصل کرنے میں ہی کامیابی تصور کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو یہ درس دینا چاہتا ہے کہ شہادت کے میدان میں فتح و شکست کا معیار وہ نہیں ہے جو عام انتخابات میں ہوا کرتا ہے کہ بلکہ شہادت ایسا عظیم چناؤ ہے جس میں محراب عشق اور معبد آزادی کے آستانہ پر اپنی جان کی قربانی پیش کرنے والے مجاہد کو کامیاب سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے دنیا والوں کے سامنے یہ نمونہ بھی پیش کر دیا کہ باطل کی ننگی اور تیز دھار تلواروں پر حق و صداقت کا مقدس خون کس طرح کامیابی حاصل کرتا ہے۔ در حقیقت تحریک کربلا کے قائد عظیم الشان حسین مظلوم کی شیر دل خواہر ثانی زہرا حضرت زینب اور دیگر خواتین کی بے پردگی اور دربدری نے اموی حکمرانوں کو یہ موقع نہیں دیا کہ وہ تاریخ اسلام کو تیز رفتاری کے ساتھ منحرف کر سکیں اور اسلامی آئین و سنت و سیرت نبوی کو مسخ کرتے ہوئے اپنی غاصب اور ظالم حکومت کے ذریعہ اسلام محمدی کو پوری طرح نابود کر سکیں۔ یہ لوگ مسلمانوں کو دور جاہلیت کی طرف واپس لے جانا چاہتے تھے مگر عظیم شہادت اور حسینی انقلاب کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے۔

بہر حال کربلا کے ریگستان میں جنگ کا بازار گرم ہوا۔ اپنی اولاد اور اپنے اصحاب وانصار کی شہادت کے بعد حسینؑ مظلوم ایک بہادر مجاہد کی طرح "هیهات من الزلة" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے فوج دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور ایسا شیرانہ حملہ کرتے ہیں کہ لوگوں کو حضرت علیؑ کی جنگ یاد آجاتی ہے۔ وہ دشمنوں کی طرف بڑھتے ہوئے یہ کہتے ہیں "تم نے میرے اکبر کو مارا، تم نے میرے عباس کو شہید کیا، کہاں بھاگ رہے ہو آؤ تین دن کے بھوکے اور پیاسے کا مقابلہ تو کرو۔" کربلا کے میدان میں ہر طرف الامان اور الحفیظ کی آوازیں بلند ہو جاتی ہیں پھر فضا میں یہ آواز گونجنے لگتی ہے کہ اے نفس مطمئن اپنے رب کی بارگاہ میں پلٹ آ۔ اور اس آواز کو سنتے ہی حسینؑ اپنی تلوار نیام میں رکھ لیتے ہیں اور بارگاہ عالیہ الٰہی میں یہ عرض کرتے ہیں معبود تیری مرضی کے آگے سر تسلیم خم ہے۔ میری اس جنگ کا مقصد بھی تو محض تیرے پسندیدہ دین کی بقاو حفاظت ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔" ان کان دین محمد لم یستقم الابقتلی فیاسوف خزونی "یعنی اگر دین محمد کو میرے قتل کر بغیر بقا حاصل نہیں ہو سکتی تو اے تلوارو! آؤ میرے گلے لگ جاؤ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان فرزندان توحید کی شہادت ہر دور اور ہر جگہ کے لوگوں کے لئے یہ پیغام دیتی ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ عزت اور حیات جاوید کا باعث ہوا کرتی ہے۔ خدا کی راہ میں ظلم واستبداد کے خلاف بھرپور جہاد کرنا ہر صاحب ایمان کا بنیادی فریضہ ہے اور اگر موت کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ ٔ کار نہ ہو تو شہادت منطق کی انتہا اور فضیلت وحیات جاوید کی ضمانت بھی ہے۔ سرخ موت کو ایک حادثہ افسوسناک المیہ اور ہیرو کی مدت قرار دینے والے کلچر کی تردید کرتے ہوئے حسین مظلوم نے دنیا والوں کو یہ درس دیا کہ اسلامی تہذیب وتمدن کی نگاہ میں سرخ موت منزل کمال اور عظیم سربلندی کا نام ہے اور یہ بشریت کو معراج اور حیات جاوید عطا کرتی ہے اور گذشتہ صدی کے عظیم الشان شاعر علامہ اقبال کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اسلام کے دامن میں بس اس کے سوا کیا ہے
اک ضرب یداللٰہی یک سجدہ ٔ شبیری

☆☆☆☆

پروفیسر سید جعفر رضا

تصوف: احیائے دین کی روحانی تحریک
(سریال-۲)

تذکرۂ عارفین

صوفیہ کے روحانی سلاسل ومسالک کا ذکر گذشتہ صفحات (سریال-۱)[۱] میں کیا جا چکا۔ صوفیہ کے مطابق نظام عالم کی ایک مخصوص اساس ہے۔ طبقات رجال الغیب یعنی دنیا اس لیے قائم وباقی ہے کہ اولیاء اللہ کے ایک مستور و منظم روحانی سلسلہ کی شفاعت کی بدولت تمام آفات ارضی وسماوی ٹلتی رہتی ہیں۔ اگر یہ سلسلۂ شفاعت نہ ہو تو دنیا فنا ہو جائے۔ ولی کا تقرر منصوص من الولی ہوتا ہے۔ ایک ولی اپنی جگہ پر دوسرے ولی کو مقرر کرتا ہے۔ ایک ولی کی وفات پر دوسرا ولی اس کی جگہ لیتا ہے۔ اس میں کسی شوریٰ یا اجماع کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر زمانہ کے لیے اولیاء کی تعداد مقررہ ہے۔[۲] خواجہ سید علی ہجویری رقم طراز ہیں کہ حل و عقد مالک اور خدا کی بارگاہ کے سچے سپاہی تین سو کی تعداد میں ہیں جنھیں 'اخیار' کہتے ہیں اور چالیس دوسرے ہیں جنھیں 'ابدال' کہتے ہیں اور سات نور ہیں جنھیں 'ابرار' کہتے ہیں اور چار دیگر ہیں جنھیں 'اوتاد' کہتے ہیں اور تین دیگر ہیں جنھیں 'نقباء' کہتے ہیں۔[۳] اس مستور و منظم عالمی نظام کی تفصیل صوفی نساب و مورخ شجاع الملک کی زبانی سنیے:[۴] مراتب اولیاے دین کے چار ہیں — صغریٰ و کبریٰ و وسطیٰ و عظمیٰ اور ہر ایک کے واسطے ان میں سے ایک ابتدا اور ایک درمیان اور ایک انتہائی اور گروہ اولیاء کے ان مرتبوں میں مقام رکھتے ہیں۔ کسی وقت عالم میں تین سو چھپن تن سے کم نہیں ہوتے اور ہمیشہ عاجزوں کی کارسازی اور گنہگاروں کی شفاعت میں مشغول ہیں اور اہل تصوف کے بزرگ اس جماعت سے تین سو تن کو ابطال جانتے ہیں اور چالیس نفر کو ابدال کہتے اور سات نفر کو سیاح بولتے ہیں اور پانچ نفر کو اوتاد سمجھتے ہیں اور تین نفر کو قطب الاوتاد جانتے ہیں اور ایک نفر کو قطب الاقطاب تصور کرتے ہیں۔ پس جس وقت کہ ایک ان میں سے فوت ہووے، مرتبہ ماوون اس کی ایک بجائے اس کے لاتے ہیں۔ مثلاً اگر قطب الاقطاب مر جاوے، ایک قطب ثلثہ یعنی تینوں قطب سے بجائے اس کے مقام کریں اور اوتاد سے ایک کو ثلثہ اور ایک سیاح کو بجائے اوتاد اور تمام تین سو چھپن تن سے نو تن ارشاد کے لائق ہیں اور باقی بھی اگرچہ کسی مرتبہ میں مراتب ولایت سے مقام

رکھتے ہیں لیکن ارشاد کے سزاوار نہیں اور ان نوتن میں پانچ تن اوتاد ہیں اور تین اقطاب اور ایک قطب الاقطاب۔ قطب الاقطاب، ہی وہ مرکز ہے، جس کے گرد سارا نظام کائنات گردش کرتا ہے۔ یہی سلسلہ شفاعت ہے جس سے روحانی سلاسل بنتے ہیں۔

مذکورہ بالا مستور و منظم عالمی نظام کے مطالعہ میں اسلامی تکوینی تفہیم کی اساس پر نظر رکھنا ناگزیر ہے کہ جس طرح ساری مخلوقات خواہ بہ رضا و رغبت یا بہ جبر و اکراہ بہر صورت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے، اسی طرح اسلام بھی قانون قدرت کی جبری و پیروی کا پابند ہے۔ ہر شے حکم اللہ تعالیٰ کی پابند ہے۔ یہ اختیار کسی نبیؑ، پیغمبر کو حاصل نہیں ہے۔ البتہ کسی خاص ضرورت کے پیش نظر معجزہ کے طور پر کسی محدود مدت کے لیے اللہ تعالیٰ یہ اختیار کسی نبیؑ، پیغمبر کو تفویض کرسکتا ہے اور تفویض کیا بھی لیکن کسی نبیؑ، پیغمبر کو یہ اختیار کلیۃً حاصل نہیں ہے۔ قرآن الحکیم تاکید کرتا ہے: اللہ یحکم لامعقب لحکمہ (اللہ ہی حکم دیتا ہے۔ الرعد ۱۳/ ۴۱) الا لہ الخلق والامر (سب اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ الاعراف ۷/ ۱۱۷) افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی اسمٰو اتوالارض طوعاً والیہ یرجعون (کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کے علاوہ کچھ اور تلاش کر رہے ہیں جبکہ زمین و آسمان کی ساری مخلوقات بہ رضا و رغبت یا بہ جبر و اکراہ اس کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ آل عمران ۳/ ۸۳) صوفیہ کا عقیدہ کہ اقطاب کی بدولت دنیا قائم ہے۔ اقطاب کی بدولت تمام آفات ارضی و سماوی ٹلتی رہتی ہے، وہ منزل ہے کہ امام کیا، پیغمبر بھی فائز نہیں ہیں!

مستور و منظم عالمی نظام کا اہم پہلو ہے کہ صوفیہ ان روحانی سلاسل و مسالک کے شجرہ روحانی کی تلاش و تحقیق میں قران الحکیم کی رہنمائی کی جائے تو اس آیت مبارکہ سے روشنی ملتی ہے: اللہ نور السمٰوات و الارض مثل نورہ کمشکوٰۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجۃ الزجاجۃ کا نھا کوکب دری یو قد من الشجرہ مبرلۃ زیتونۃ لاشرقیۃ ولاغربیۃ یکاد زیتھا یضیء ولولم تمسسہ نار نور علیٰ نور یھدیٰ اللہ النورہ من یشاء ویضرب اللہ الامثل للناس و اللہ بکل شیءٍ علیم (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال اس طاق کی ہے، جس میں چراغ شیشہ کی قندیل میں ہو اور قندیل ایک جگمگاتے ستارے کے مانند ہو، جو زیتوں کے بابرکت شجر سے روشن کیا جائے جو نہ مشرقی ہو، نہ مغربی ہو اور قریب ہے کہ اس کا روغن بھڑک اُٹھے اسے آگ مس بھی نہ کرے۔ یہ نور بالائے نور ہے اور اللہ اپنے نور کے لیے جسے چاہتا ہے، ہدایت دیدیتا ہے اور اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے اور وہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔ النور ۲۴/ ۳۵)۔ مولانا حافظ سید فرمان علی مرحوم نے خواجہ حسن بصری اور شیخ ابوالحسن نازلی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مشکوٰہ سے مراد حضرت فاطمہ زہرا، مصباح سے حضرات حسنینؑ اور شجرہ مبارکہ سے حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ شرقی و غربی نہ ہونے سے ان کا یہودی و نصری نہ ہونا یکاد زیتھا سے کثرت علم او نور علیٰ نور سے ایک امام بعد دوسرے امام کے معبوث ہونے کا حوالہ ہے اور یھدیٰ اللہ النورہ سے محبت و مودتِ اہل بیت اطہار مراد ہے۔ ۵۔

مذکورہ بالا آیات کریمہ کی روشنی میں صوفیہ کے شجرۂ روحانی سے متعلق مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں، خاص طور پر سلسلۃ الذہب کے صوفیہ کے شجرۂ روحانی سے متعلق مسائل، جو اپنا شجرۂ روحانی سرکارِ ختمی مرتبتؐ کے بعد حضرت علی سے براہ راست قائم کرتے ہیں، اور دوازدہ ائمہ اہل بیت کو اکابر اولیاء اللہ میں شمار کرتے ہیں۔ سلسلۃ الذہب کو قرآنی اصطلاح میں زیتون کے بابرکت شجر کی معنویت سے وابستہ کر کے دیکھا جائے تو حقائق کو صحیح تناظر میں دیکھنے کی توفیق حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی نورانی سلسلہ میں اتحاد بین المسلمین کی اساس موجود ہے، جس سے مختلف اسلامی فرقے دوبارہ اتحاد و اتفاق کے رشتوں میں منسلک ہو سکتے ہیں، اپنے گوناگوں مسائل کی پیچیدگیوں کو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر حل کر سکتے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر بنی نوع انسان کی رہبری و رہنمائی میں اپنا تاریخی کردار پیش کر سکتے ہیں جس کی توقع و مطالبہ قرآن الحکیم ان سے کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے صدر اوّل کے متعلق ماہرین تصوف نے وضاحت کر دی ہے کہ اس وقت متقین کی جماعت (جماعت صوفیہ) اسلام کے دینی اقدار کی حفاظت کے لیے ہر حضرت علی کی رہنمائی میں ان کے گرد و پیش جمع ہو گئی تھی، وہی ابتدائی شیعیت بھی تھی اور ابتدائی تصوف بھی۔ اس تحریک احیائے دین کو اسلامی تاریخ کے اولین دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وقت کی پکار ہے، ملی و قومی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر بھی۔

صوفیہ کے تمام روحانی سلاسل سرکارِ ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شروع ہوتے ہیں پھر حضرت علی ابن ابی طالب سے جو روحانی شجرۂ مبارکہ کی اساس ہیں۔ اہل تشیع درود پڑھتے ہیں: اللھم صلی علی محمد و آل محمد (خدایا، رحمت کر محمدؐ اور ان کی اولاد پر)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سرکارِ ختمی مرتبت کے جد امجد ہیں۔ اہل تسنن مفصل درود پڑھتے ہیں، جس میں سرکارِ ختمی مرتبت، ان کی اولاد کے علاوہ ان کے جد اور ان کی اولاد پر بھی درود پڑھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سرکارِ ختمی مرتبت، ان کی اولاد پر دوبارہ درود پڑھتے ہیں:۔ اللھم صلی علی سیدنا و مولا محمد و آل محمد کماصلیت علی ابراہیم و علی آل ابراہیم انک حمیدٌ مجید اللھم صلی علی سیدنا و مولانا محمد و آل محمد کما بارکت علی ابراہیم انک حمیدٌ مجید۔ (خدایا، رحمت کر ہمارے سردار اور مولا محمدؐ اور ان کی اولاد پر جس طرح تو نے رحمت کی ابراہیمؑ اور ان کی اولاد پر اور خدایا، برکت کر ہمارے سردار اور مولا محمدؐ اور ان کی اولاد پر جس طرح تو نے رحمت کی ابراہیمؑ اور ان کی اولاد پر۔ یقیناً تو بہترین صفات کا حامل اور بزرگ ہے۔) اس طرح اہل تشیع اور اہل تسنن کے درود کی روح و منشاء ایک ہے یعنی سرکارِ ختمی مرتبتؐ، ان کی اولاد پر درود پڑھنا۔ اہل تشیع اور اہل تسنن دونوں میں درود جزو نماز ہے۔ روزانہ کم از کم سترہ بار پڑھنا لازمی ہے۔ اس میں صوفیہ کا تمام سلاسل بھی شامل ہیں۔ کسی مخصوص سلسلہ کی بات نہیں۔ روزانہ کم از کم سترہ بار دہرانے تاکید و تجدید عمل ثابت ہے۔ درود شریف میں جس روحانی شجرہ کی نشان دہی کی گئی ہے، وہ سرکارِ ختمی مرتبت کے بعد ان کی اولاد پر مشتمل ہے۔ قرآن الحکیم میں اولاد رسول کی صراحت کر دی گئی ہے: انا اعطینك الکوثر (بیشک ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا ہے۔ الکوثر ۱۰۸/۱) اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ کفار عرب سرکارِ ختمی مرتبتؐ کے بیٹا

نہ ہونے کا طعنہ دیا کرتے تھے، جواب میں آیت نے بتادیا کہ حسنینؑ رسول کے فرزند ہیں، جن کی اولاد میں کثرت ہوگی۔ ۲

سلسلۃ الذھب کو خصوصیت حاصل ہے کہ ان سلاسل میں رشد و ہدایت کے لیے فرزندان رسول کی تائید اور درود شریف کی پیروی حاصل ہو جاتی ہے۔ حدیث رسول سے مزید روشنی ملتی ہے: قال رسول اللہ لکل نبي وصی ووارث و ان علیاً وصی ووا رثی (رسول اللہ نے فرمایا کہ ہر اپیغمبر کا ایک وصی اور وارث ہوتا ہے اور علیؑ میرا وصی اور وارث ہے۔ ۷ سلسلۃ الذھب میں سرکارِ ختمی مرتبتؐ کے بعد حضرت علی کو پیر و مرشد مانتے ہیں، جن کو عقیدۂ صوفیہ کے مطابق سرکارِ ختمی مرتبتؐ نے اپنا خرقہ روحانی خلافت راشدہ کے اولین تینوں خلفائے عظام کی استدعاؤں کو رد کرتے ہوئے مرحمت کیا تھا۔ ۸ اس سلسلہ میں امام حسنؑ و امام حسینؑ کے علاوہ خواجہ حسن بصری، خواجہ کمیل ابن زیاد اور حضرت اویس قرنی اہم ہیں۔ امام جعفر صادقؑ سے سلسلہ طیفوریہ قائم ہوتا ہے۔ خواجہ معروف کرخی امام رضاؑ کے ملازمین میں تھے، جن سے سلسلہ جنیدیہ شروع ہوا۔ سی میں شیخ عبدالقادر جیلانی کا سلسلہ قادریہ بھی شامل ہے۔ اس کو ام السلاسل بھی کہتے ہیں کیونکہ اس سلسلہ سے دیگر سلاسل بھی کسی نہ کسی منزل پر وابستہ ہوتے رہتے ہیں۔ خواجہ معروف کرخی کا سلسلہ خواجہ حسن بصری سے بھی ہے۔ ان میں جنیدیہ بھی شامل ہیں اور سلسلہ چشتیہ بھی قائم ہوتا ہے۔ ہندوستان کے اولین صوفی سید علی عثمان ہجویری داتا گنج بخش بھی اس سلسلہ میں شامل ہیں۔ چشتیہ کو حضرت کمیل ابن زیاد سے بھی نسبت ہے۔ ان سے سلسلہ خواجگان بھی اپنا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ خواجہ کمیل کے سلاسل میں ادھمیہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ حضرت اویس قرنی سے صوفیہ کا تمام سلاسل اپنی اپنی گم شدہ کڑیاں ملا دیتے ہیں، جس کی بنا پر سلسلۂ اویسیہ تقریباً تمام سلاسل میں ملتا ہے۔ طیفوریہ کو طریقت صدیقیہ بھی شامل کیا جاتا ہے۔ طیفوریہ سے متعدد سلاسل وجود میں آئے، جن میں خضریہ، رفاعیہ، قلندریہ، مداریہ، حامیہ وغیرہ کے علاوہ مشقیہ بہر جو جنیدیہ سے قادریہ بھی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ سلسلہ جنیدیہ وسیع ترین سلسلہ ہے، جس میں قادریہ، چشتیہ، نعمت اللٰہیہ، منعمیہ، مغربیہ، دسیر اویسہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان سلاسل سے انگنت سلسلے شروع ہوئے، جن کو شمار کرنا دشوار ہے۔ لیکن برصغیر ہند و پاک چشتیہ، قادریہ اور سہروردیہ کو زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ قلندریہ کو انفرادیت حاصل ہے اور مقبولیت میں دیگر سلاسل سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

طریقت صدیقیہ خلیفہ اول حضرت ابو بکر سے معنون ہے۔ یہ سلسلہ تین طرح سے شروع ہوتا ہے اولاً سرکار دو عالم کے بعد حضرت ابو بکر اور ثانیاً سرکارِ ختمی مرتبتؐ کے بعد حضرت سلمان فارسی اور ان سے حضرت ابو بکر۔ طریقت صدیقیہ کی دوسری شاخ امام علی الرضا کے وسیلے سے حضرت علی تک پہنچتی ہے اور سلسلۃ الذھب میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس طرح سلسلۃ الذھب کو طریقت صدیقیہ سے منسلک ہو جاتا ہے۔ اس سلسلۂ طریقت کی اساس نسبی ہے کہ امام محمد باقرؑ کی زوجہ حضرت جوریہ، حضرت ابو بکر کے بیٹے حضرت محمد کی پوتی اور دوسرے بیٹے حضرت عبدالرحمٰن کی نواسی تھیں جن سے امام جعفر صادقؑ کی ولادت ہوئی۔ اسی رشتہ کی بنا پر امام جعفر صادقؑ کا قول مشہور ہے کہ میں دو بار حضرت ابو بکرؓ سے پیدا ہوا ہوں۔ امام

جعفر صادق کا لقب صادق ان کے پرنانا حضرت ابوبکر کے لقب صدیق سے اہم معنی ہے۔ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق کی اہل تسنن اور ان میں خاص کر مسلک حنفی میں اساسی اہمیت ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ ان کے شاگرد تھے اور اس پر تفاخر کرتے تھے۔ اپنی عمر کے فقط ڈھائی سال امام جعفر صادق کی خدمت میں گذارے تھے۔ اس کے علاوہ اپنی باقی عمر کو عمر رائگاں قرار دیتے تھے۔ طریقت صدیقیہ میں امام محمد باقر اور امام جعفر صادق کو اولیائے کبار میں شامل کیا جاتا ہے، جن سے رشد و ہدایت حاصل کر کے خرقہ و بیعت کی روایت آگے بڑھی۔ طریقت صدیقیہ میں شیخ عبداللہ علمبردار اور خواجہ عباس الخضر کے سلسلہ کے علاوہ سلسلۂ خواجگان اہم ترین ہے۔ سلسلہ خواجگان سے سلسلہ نقش بندی اور پھر اس سے ابوالعلائیہ شروع ہوا۔ میں نقش بندیہ اور ابوالعلائیہ کو زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر سعید نفیسی نے سلسلۂ نقش بندیہ کے بانی خواجہ بہاء الدین نقش بند کے رسالۂ قدسیہ کے حوالے سے انھیں کا قول نقل کیا ہے کہ سلسلۂ خواجگان سلسلۂ ملامتیہ سے ماخوذ ہے۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ''مشائخ طریق نقش بندی کہ پیروان طریقۂ خواجگان بودہ۔ اند خود را از ملامتیان می دانستہ اند و پیش روان ایشان کہ مشائخ طریقۂ خواجگان باشند نیز ہمیں عقیدہ را داشتہ اند و از بیان آن بہ صراحت تمام خودداری نکردہ اند و ناچار برخی از وجوہ اشتراکی کہ درمیان ملامتیان از صوفیہ و جوان مردان و فتیان بودہ درین طریقہ نیز بودہ است۔ ''۹ یعنی سلسلۂ نقش بندیہ کے مشائخ طریقت خواجگان کے پیرو تھے۔ خود کو ملامتیوں میں شامل کرتے تھے اور ان کے پیش رواں میں مشائخ اس کا خیال رکھتے جس کا کھل کر اظہار کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ ان صوفیوں، جواں مردوں، فیتوں اور ملامتیوں کی مشترک چیزیں لازمی طور پر نقش بندیوں میں بھی موجود تھیں۔

اہل تشیع کے متعلق عام خیال ہے کہ تصوف سے ان کا تعلق تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) سے ختم ہو چکا ہے جو غیر صحیح ہے۔ اس مسئلہ پر اپنی جگہ تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے، البتہ اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ اہل تشیع میں تصوف کسی دور میں کلیتہً ترک نہیں ہوا، مگر اس مقبولیت میں ضرور کمی آئی۔ برصغیر کی ان خانقاہوں کے علاوہ جو بعد کے ادوار میں ترک مسلک کر کے شیعہ ہو گئیں، اہل تشیع میں سلسلۂ خرقہ و بیعت زیادہ تر باقی نہیں رہا، حالانکہ خانقاہ اوچہ کے صوفیہ کا دعوئی ہے کہ خواجہ جہانیاں جہاں گشت اور ان کے اجداد کا شیعہ ہونا کئی مصادر میں درج ہے۔ مثلاً ریاض الانساب کے بیان کا خلاصہ یہ ہے: "سید جلال ماضی (سید جلال سرخ پوش) عراق سے بخارا تشریف لے گئے۔ وہاں مردانیوں نے آپ کو بہت ستایا تو وہاں سے کابل (افغانستان) آ گئے، وہاں بھی سکون نہ ہوا تو ہندوستان چلے آئے۔ چونکہ یہاں کے باشندے عقائدِ حنفیہ کے پیرو تھے اور اہل بخارا بھی اسی عقیدہ کے متبع تھے، اس لیے تقیہ کو ترجیح دی اور سلاطین ہند نے آپ کی بڑی تعظیم و تکریم ملحوظ رکھی۔ اور ان کی اولاد ہندوستان کے اہل تسنن کی صحبت کی وجہ سے اپنا مذہب اور عقیدہ تقیہ کھو بیٹھی۔" ۱۰ مآثر الامراء میں خواجہ جہانیاں جہاں گشت کے متعلق درج ہے: "گویند مذہب سید و آبائے ایشاں امامیہ است" ۱۱ لیکن خواجہ جہانیاں جہاں گشت کی اپنی تصانیف سے ان کا شیعہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ تقیہ کرنے کی بنا پر ان کی تصانیف تقیہ کا مظہر ہو گئی ہوں۔ امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کا سلسلہ طریقت کشمیر

میں مقبول ہے، لیکن اہل تسنن میں ہے۔ان کو عام طور پر شافعی العقیدہ قرار دیا جاتا ہے لیکن اگر ان کی مشہور و معروف کتاب مودة القربیٰ ان کا شیعی ہونا ثابت کرتی ہے، جس میں انھوں نے متعدد ایسی احادیث رسول درج کی ہیں، جن میں تنہا شیعان علی کو ناجی قرار دیا گیا ہے۔۱۲ نوربخشیہ کے شیعی ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہوسکتا۔ کے متعلق کنز الانساب میں درج ہے: "اس مذہب کے لوگ حضرت مولا علی علیہ السلام کو مظہر ذات خدا تصور کرتے ہیں لیکن پیرو ائمہ اثنا عشری کے ہیں، شیعہ نوربخشیہ اثنا عشریہ صوفیہ کہلاتے ہیں۔" ۱۲
ترکی میں سلسلہ طریقتہ بکتاشی باقی ہے اوران کی خانقاہیں آباد ہیں۔ان صوفیوں کو عثمانی حکمرانوں کے دور میں خصوصی مقبولیت حاصل ہوئی۔سلسلۂ بکتاشی کے موسس حاجی بکتاش تھے۔ ان کو سب نے شیعی صوفیہ مانا ہے لیکن پروفیسر کبیر احمد جائسی سلسلۂ بکتاشی کو شیعہ نہیں مانتے، موصوف لکھتے ہیں: 'اس سلسلہ سے منسلک افراد قدرے آزاد خیال ہونے کے ساتھ ساتھ خلافت کے بجائے امامت کے قائل ہیں لیکن اس کے باوجود شیعہ نہیں ہیں۔اس سلسلے کے افراد کا دینی مسلک شیعوں اور سنیوں کے دینی مسلکوں کے بین بین ہے۔' ۱۳
لیکن مشہور ماہر بکتاشیات برج نے سلسلۂ بکتاشی کو شیعی صوفیہ میں شمار کیا ہے۔ ۱۴ اس سے موجن مومن نے بھی اتفاق کیا ہے۔۱۵ ایران میں شیعی صوفیہ کے چند سلاسل ہنوز قائم ہیں۔مذکورہ بالا شیعی سلاسل کے علاوہ طریقت کوثر علی شاہی طریقت گن آبادیہ طریقت صفی علی شاہی طریقت شمس العرفاء، طریقت ذوریاستین وغیرہ ہنوز قائم ہیں۔

صوفیہ کے دیگر سلاسل میں ایک مختصری جماعت رسول اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی الله علیه و آله و سلم کے بعد حضرت علی کی بجائے حضرت ابوبکر سے قائم کرتی ہے۔اس سلسلہ کے موسس حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر ہیں۔لیکن یہ روحانی سلسلہ بھی بعد میں امام جعفر صادق سے وابستہ ہوجاتا ہے گم شدہ سلاسل خواجہ اویس قرنی سیر زنۃ روحانی ائمہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں پہلی اہم ترین بات یہ ہے کہ زیادہ تر صوفیہ حضرت علی ابن ابی طالب سے روحانی سلسلہ قائم کرتے ہیں جس کے لیے 'چار پیر' کی اصطلاح رائج ہے۔'چار پیر' ہیں: امام حسن، امام حسین، خواجہ حسن بصری اور خواجہ کمیل بن زیاد۔صوفیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی ابن ابی طالب نے رسول اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی الله علیه و آله و سلم سے خرقۂ طریقت عطا ہونے کے بعد ستر افراد کو مریدی کا شرف بخشا اور 'چار پیر' یعنی امام حسن، امام حسین۔ خواجہ حسن بصری اور خواجہ کمیل بن زیاد کو خرقۂ خلافت سے سرفراز کیا۔عطائے خرقۂ طریقت معراج سے وابستہ ہے جو قبل ہجرت کا واقعہ ہے۔امام حسن، امام حسین دونوں بھائیوں کی ولادت بعد ہجرت مدینہ منورہ میں ہوئی، لہٰذا عطائے خرقۂ طریقت بعد کے ادوار میں ہی ممکن ہوسکتی ہے۔اس حقیقت پر بھی نظر رکھنا چاہئے کہ خواجہ حسن بصری حضرت علی سے براہ راست بیعت نہیں تھے بلکہ صحابی رسول عمران بن حصین الخزاعی (م۔۵۳ھ/۶۷۲ء) کے واسطے سے مرید تھے۔۱ بلکہ ابن الجوزی اور ذہبی کا اعتراض کیا ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب اور خواجہ حسن بصری کی ایک دوسرے سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ۵ خواجہ حسن بصری، امام حسن، امام حسین دونوں بھائیوں کے تربیت یافتہ تھے، اس لیے ان سے خرقۂ طریقت ممکن

ہے۔خواجہ کمیل بن زیاد امام علی الرضا کے ملازم تھے۔ان کے اور حضرت علی کے درمیان دو سو سال کا بُعد زمانی ہے۔اس لیے قوی امکان ہے کہ انھیں امام علی الرضا سے خرقۂ طریقت عطا کیا ہو۔امام علی الرضا سے وابستہ طریقت کو سلسلۃ الذہب کہا گیا۔اس طرح خواجہ کمیل بن زیاد کو خرقۂ طریقت قبل کے دیگر تمام ائمہ اہل بیت میں منتقل ہونے کے بعد امام علی الرضا سے عطا ہوا۔حضرت علی سے براہ راست خرقۂ طریقت عطا ہونا خارج از امکان ہے۔

دیگر مروجہ اصطلاح 'سات خانوادے' ہے۔'سات خانوادے' سے مراد سات سلاسل ہیں:

۱۔سلسلۂ سلمانیہ: معنون بہ خواجہ سلمان فارسی
۲۔سلسلۂ اویسیہ: معنون بہ خواجہ اویس قرنی
۳۔سلسلۂ بصریہ: معنون بہ خواجہ حسن بصری
۴۔سلسلۂ کمیلیہ: معنون بہ خواجہ کمیل بن زیاد
۵۔سلسلۂ یمینیہ: معنون بہ خواجہ یمین الدین شامی
۶۔سلسلۂ قلندریہ: معنون بہ خواجہ مدایونی قلندر (مدایوں مکہ معظمہ کا ایک محلہ ہے۔)
۷۔سلسلۂ نقشبندیہ: معنون بہ خواجہ قاسم بن محمد بن ابوبکر

صوفیہ کی ایک اور مروجہ اصطلاح 'چودہ خانوادے' ہے۔'چودہ خانوادے' سے مراد چودہ سلاسل ہیں جو خواجہ حسن بصری کے سلسلۂ بصریہ سے جاری ہوئے۔ان میں دو خلفائے طریقت کو خصوصی اہمیت حاصل ہوئی: خواجہ معروف کرخی اور خواجہ عبدالواحد بن زید۔ان میں اولاً نو سلاسل خواجہ معروف کرخی سے اور باقی پانچ سلاسل خواجہ عبدالواحد بن زید سے جاری ہوئے:

۱۔سلسلۂ کرخیہ: معنون بہ خواجہ معروف کرخی
۲۔سلسلۂ جنیدیہ: معنون بہ خواجہ جنید بغدادی
۳۔سلسلۂ طیفوریہ: معنون بہ خواجہ بایزید طیفور بسطامی
۴۔سلسلۂ سقطیہ: معنون بہ خواجہ حسن سرّی سقطی
۵۔سلسلۂ حبیبیہ: معنون بہ خواجہ حبیب اعجمی
۶۔سلسلۂ گازرونیہ: معنون بہ خواجہ ابواسحٰق گازرونی
۷۔سلسلۂ طوسیہ: معنون بہ خواجہ ابوالفرح طرطوسی
۸۔سلسلۂ کبرویہ: معنون بہ خواجہ نجم الدین ولی تراش
۹۔سلسلۂ سہروردیہ: معنون بہ خواجہ شہاب الدین سہروردی زنجانی
۱۰۔سلسلۂ زیدیہ: معنون بہ خواجہ عبدالواحد بن زید
۱۱۔سلسلۂ عیاضیہ: معنون بہ خواجہ فضیل بن عیاض
۱۲۔سلسلۂ ادہمیہ: معنون بہ خواجہ ابراہیم بن ادہم

۱۳۔ سلسلۂ ہبیریہ: معنون بہ خواجہ ہبیرۃ البصری
۱۴۔ سلسلۂ چشتیہ: معنون بہ خواجہ ابواسحٰق چشتی

سلسلۂ چشتیہ کو خواجہ معین الدین چشتی سجزی سے ایسی تقویت حاصل ہوئی کہ ان کے نام نامی کا متبادل ہوگیا۔ خانوادۂ چشتیہ میں چودہ سلاسل قائم ہوئے: چشتیہ، کرمانیہ، کریمیہ، نظامیہ، صابریہ، مخدومیہ، حسامیہ، قلندریہ، فخریہ، جلیلیہ، نظام شاہی، حمزہ شاہی، قلندر شاہی اور چاکھا شاہی۔ خانوادۂ طیفوریہ میں چھاسٹھ سلاسل قائم ہوئے جن میں طبقاطیہ اور شطاریہ زیادہ مشہور ہوئے۔ فقط طبقاطیہ کے ہینسٹھ سلاسل ہوئے جن میں سات عاشقان، چار خادمان، دو طالبان اور باون دیوانگان کہے گئے۔ خاوادۂ جنیدیہ کے سلاسل میں انصاریہ، رفیعہ اور بسویہ کو شہرت حاصل ہوئی۔ خواجہ ابراہیم بن ادہم کے سلسلۂ طریقت میں سلسلۂ خضریہ کو مقبولیت ملی۔ خانوادۂ سقطیہ میں نوریہ مشہور ہوئے۔ خانوادۂ گازرونیہ میں زاویہ اور اولیا مقبول ہوئے۔ خانوادۂ کبرویہ میں فردوسیہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہوئی، خانوادۂ طوسیہ سے اکیس سلاسل جاری ہوئے: قادریہ، رزاقیہ، وہابیہ، قمیشیہ، خلیلیہ، جیاریہ، قمیصیہ، جلیلیہ، حسین شاہی، محمد شاہی، نعمت اللہ شاہی، سید شاہی وغیرہ۔ خانوادۂ سہروردیہ سے سترہ سلاسل جاری ہوئے: جلالیہ، لعل شہبازیہ، مخدومیہ، کرم علی جھلی اور موسیٰ شاہی جوسدا سہاگ مشہور ہیں، رسول شاہی، اسمٰعیل شاہی، عبدوسیہ، قاسم شاہی، رزاق شاہی، دولھا شاہی، سید شاہی، مرتضیٰ شاہی، اناتہ شاہی وغیرہ۔ مزید تفصیل کی گنجائش نہیں۔[۱۶]

ہندوستان میں صوفیہ کے روحانی سلاسل کی تعداد میں اختلاف ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ صوفیہ بیک وقت کئی روحانی سلاسل کے حامل ہوتے ہیں۔ صوفیہ کی روایت رہی ہے کہ بیک وقت کئی سلاسل سے بیعت میں رہتے ہیں۔ اہل فقہ اصرار کرتے ہیں کہ کوئی مسلمان بس ایک فقہ کا پابند ہوسکتا ہے۔ اگر حنفی ہے تو بس فقہ امام ابوحنیفہؒ کا پابند رہے گا، کسی مسئلہ میں دیگر فقہوں سے استنباط نہیں کرسکتا اور یہی صورت حال دیگر فقہوں کے لیے بھی ہے۔ لیکن صوفیہ بعض مباحث میں ایک سلسلہ کے پابند ہیں تو دوسرے مباحث میں کسی دوسرے سلسلے کے۔ اس لیے ان کو کسی ایک سلسلہ کی بجائے کئی کئی سلسلوں میں شمار کرلیا جاتا ہے۔ مزید براں اگر کوئی صوفی کسی بنا پر ممتاز ہوجاتا ہے تو اس کے نام سے نیا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ ابوالفضل نے صوفیہ کے چودہ سلاسل کا ذکر کیا ہے جو اس وقت کے ہندوستان میں رائج تھے۔ ان چودہ سلاسل میں قادریہ ونقشبندیہ دو الگ الگ سلسلے نہیں ہیں۔ البتہ شہزادہ داراشکوہ نے ان کی تعداد محض چھ قرار دی ہے— قادریہ، خواجگان، چشتیہ، کبرویہ، سہروردیہ اور متفرقہ۔ لیکن پروفیسر خلیق احمد نظامی کا خیال ہے کہ ہندوستان میں صرف مندرجہ ذیل چھ سلاسل نے کارنامے انجام دئے اور وہ ہیں— چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، شطاریہ، نقش بندیہ اور فردوسیہ۔ ہمارے نزدیک یہ بیان درست نہیں ہوسکتا۔ سلسلہ فردوسیہ بھی سلسلہ ہمدانیہ کی طرح سلسلۂ کبرویہ کی شاخ ہے۔ اگر فردوسیہ کی بجائے وہ سلسلہ کبرویہ کہتے تو مضائقہ نہ تھا لیکن اگر فردوسیہ کا ذکر ہوگا تو ہمدانیہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح سلسلۂ جنیدیہ کے ذیل میں فقط سلسلہ قادریہ کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ شیخ ابوالخیر طاؤسی کا سلسلۂ طاؤسیہ، شیخ احمد کبیر رفاعی کا سلسلۂ رفاعیہ اور شیخ ابوالفضل بن عبدالمنعم کا سلسلۂ منعمیہ

بھی ترک ہوگیا ہے۔ شیخ عبداللہ برکی کے سلسلہ کے بیان میں مداریہ اور قلندریہ کا ذکر بھی نہیں کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ سلسلہ اویسیہ کا ذکر بھی شامل نہیں ہے جس کی شمولیت کے بغیر صوفیہ کا کوئی روحانی سلسلہ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ سلسلۂ اویسیہ کے شیخ ابو اسحٰق کازرونی کی خانقاہیں ہندوستان سے چین تک پھیلی ہوئی ہیں۔ حیرت ہے کہ پروفیسر موصوف کو کہیں نظر نہ آئیں! عصر حاضر میں ہندوستان میں صوفیہ کے چودہ سلاسل زیادہ مروج ہیں جن کے نام ہیں: چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ، شطاریہ، فردوسیہ، ہمدانیہ، مداریہ، نعمت الٰہیہ، قلندریہ، طاوسیہ، رفاعیہ، منعمیہ اور اویسیہ۔ اوّل الذکر چاروں سلسلوں میں چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقشبندیہ کے کئی کئی ضمنی سلسلے ہیں، جن کی اپنی اپنی انفرادیت ہے۔

صوفیہ کی قدیم ترین اسناد کی حیثیت سے خلدی (م۔ ۳۴۸ھ/۹۵۹ء) کی الفہرست کو قبول کیا جاتا ہے۔ خلدیؒ نے بیان سلاسل میں سات واسطوں سے رسول اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا ذکر کیا ہے: خواجہ جنید، خواجہ سقطی، خواجہ معروف کرخی، خواجہ فرقد، خواجہ حسن بصری، خواجہ انس بن مالک اور حضرت علی ابن ابی طالب۔ دقاقی (م۔ ۴۰۶ھ/۱۰۱۵ء) نے بھی اپنے سلسلۂ صوفیہ کا ذکر کیا ہے، جو خلدی کے بیان کردہ ناموں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ انھوں نے خواجہ معروف کرخی سے قبل خواجہ داود طائی کے نام کو شامل لیا ہے۔ عصر حاضر میں العیون کو متفقہ اسناد کی حیثیت کا حامل ہے جس کو صوفیہ کے تمام بڑے سلسلے قبول کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے: حضرت علی ابن ابی طالب، خواجہ حسن بصری، خواجہ حبیب عجمی، خواجہ داود طائی خواجہ جز جانی، خواجہ مغربی، خواجہ ابوعلی کاتب یاز جانی، خواجہ روذباری اور خواجہ جنید بغدادی۔ ابن الجوزی اور ذہبی نے اس سلسلہ روحانی پر اعتراض کیا ہے کہ اولین چاروں ولیوں کی ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ بعضوں کے نزدیک خواجہ معروف کرخی کے روحانی سلسلہ کو خواجہ بکر بن خنیس، ثابت البنان کے واسطے سے خواجہ حسن بصری تک پہنچانا زیادہ درست ہے۔ ۱۷

* تاریخ عرفانیت کے نقوش :

اسلامی عرفانیت کی تاریخ حیاتِ رسالت مآب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے شروع ہوتی ہے، جن کی ذاتِ مقدسہ تمام عارفین کے لیے منبع علم دین و سرچشمۂ روحانیت ہے۔ انھیں کی سرپرستی میں اولین جماعتِ عارفین امام المتقین حضرت علی مرتضیٰ کے گرد وپیش نظر آئی۔ حضرت سلمان فارسی حضرت ابوذر غفاری، حضرت عمار یاسر اور حضرت مقداد کے الگ الگ روحانی مدارج کا ذکر ملتا ہے کہ سلمانؓ دس مدارج میں دسوں پر، ابوذرؓ نو پر، عمارؓ آٹھ پر اور مقدادؓ سات پر فائز تھے۔ ان کے ایک درجہ میں کمیت و کیفیت کے فرق کا اندازہ اس فقرہ سے کیا جاسکتا ہے جو بہت سی حدیثوں میں نقل ہوا ہے: لَوْعَلِمَ اَبُوْذَرَ مَا فِی قَلْبِ سَلْمان لَقَتَلَه' (اگر ابوذر کو سلمان کے دل کی بات معلوم ہو جاتی تو انھیں [کافر سمجھ کر] قتل کر

دیتے۔)[۱۸] دیگر اہم عارفین میں حضرت اویس قرنی ہیں جنھوں نے محبت ومودت نبوی کی نادیدہ ناشنیدہ مثال قائم کر دی۔ مگر اتنا یقینی ہے کہ پہلی صدی ہجری (پانچویں صدی عیسوی) میں صوفیہ کی کوئی مخصوص جماعت نہیں تھی۔ البتہ نیک سیرت صحابۂ کبار اپنے اپنے زہد وتقویٰ اور عبادات الٰہی میں ممتاز ومنفرد تھے۔ اسلامی تعلیمات اور اسوۂ حسنۂ رسالت مآب اور اہل بیت اطہار کی عملی زندگی میں ایسے عوامل موجود تھے جو نظری اعتبار سے عمیق ولطیف عرفانیت کی اساس اور عملی طور پر روحانی ومعنوی مسرت کا سرچشمہ بن سکیں۔ نتیجہ میں بعد کے ادوار میں عرفانیت سے روحانی ومعنوی مسرت کے چشمے جاری ہو گئے کہ اصطلاحی طور پر صوفیہ کا ذکر ملنے لگا۔ الکافی کی روایت ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے دو(۷۱۱۔۹۴ھ/۳۵۔۱۲۷ء) میں کچھ افراد (سفیان ثوری اور ان کے ہمنوا) اس نام سے پہچانے جاتے تھے۔[۱۹] شیخ ابو نصر سراج طوسی (م: ۳۷۸ھ/۹۸۸ء))، ابوالقاسم قشیری (م: ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) نکلسن ور دیگر ماہرین بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ یہ اصطلاح دوسرے صدی ہجری کے اواخر میں جاری ہوئی۔

صوفی لقب سب سے پہلے ابو ہاشم بن شریک (م: ۱۵۰ھ/۷۶۷ء) اور جابر بن حیان (م: حدود ۱۶۰ھ/۷۷۶ء)) کے ناموں کا جزو بنا۔ یہ دونوں کوفی الاصل ہیں۔ انھیں اولین صوفی بھی قرار دیا جاتا ہے جو غیر صحیح ہے کیونکہ زمانی تقدم کے اعتبار سے خواجہ حسن بصری (م: ۱۱۰ھ/۷۲۸ء) کو اولیت حاصل ہے۔ ہمارے نزدیک خواجہ حسن بصری کو اولین صوفی قرار دینا درست ہوگا۔ ان سے دوسری صدی ہجری میں تاریخ تصوف کا آغاز ہوتا ہے۔ خواجہ حسن بصری نے ۸۸ سال کی عمر پائی۔ گویا اپنی زندگی کی تو دہائیاں پہلی صدی ہجری میں گذاریں، فقط ایک دہائی دوسرے صدی ہجری میں گذری۔ انھیں نے تصوف کی پہلی کتاب رعایة حقوق الله لکھی، جس کا واحد نسخہ آکسفوڈ میں محفوظ ہے۔ اس میں متعدد اقوال نہج البلاغۃ سے ماخوذ ہیں۔ ابو ہاشم کوفی کو اولین صوفی ماننے کا سبب یہ تھا کہ پہلے ان کی تاریخ وفات معلوم نہیں تھی، جو موجودہ تحقیق کے اعتبار سے ۱۵۰ھ/۷۶۷ء ہے۔[۲۰] پہلے ان کے زمانہ کا تعین مشہور فقیہ امام سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ/۷۷۷ء) کے استاد ہونے کی بنیاد پر قیاساً کیا جاتا تھا، جو امام جعفر صادق کے شاگرد تھے۔ لیکن ابو ہاشم کوفیؒ کے دیگر امتیازات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً انھوں نے سب سے پہلے رملہ فلسطین میں عابدوں، زاہدوں اور متقیوں کے لیے ایک خانقاہ بنائی تھی جس سے صوفیہ میں خانقاہیت کی داغ بیل پڑی۔[۲۱] جابر بن حیان کو اسلامی حکمت کی تاریخ میں ماہرِ کیمیا کی حیثیت سے امتیاز حاصل ہے۔

دوسری صدی کے صوفیہ میں زبیر بن مخزومی مکیؒ (م: ۱۰۴ھ/۷۲۱) امام المتقین حضرت علیؑ کے شاگرد حضرت عبداللہ بن عباس کے شاگردِ رشید تھے، جنھوں نے اپنے استاد کی تفسیر قرآن کی تدوین کی تھی۔ مالک بن دینار (م: ۱۳۵ھ/۷۵۲ء) کو زہد وترکِ لذت میں شدت کرنے کی بنا پر امتیاز حاصل ہوا۔ دیگر اہم ترین صوفیہ میں عبداللہ بن خثیم کوفی (م: ۱۶۷ھ/۷۸۴ء)، ثابت البنانی (م: ۱۲۷ھ/۷۴۴ء) خواجہ حبیب عجمی (م: ۱۵۶ھ/۷۷۲ء) خواجہ ابو اسحٰق ابراہیم ادھم (م: ۱۶۱ھ/۷۷۷ء) وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کے متبعین کا اپنا اپنا حلقہ تھا۔ خواجہ ابراہیم ادھم کا شاہِ بلخ ہونا اکثر مورخین غیر صحیح قرار دیتے ہیں لیکن صوفیہ انھیں مہاتما بدھ کے مماثل بزرگ مانتے ہیں جنھوں نے تخت وتاج ترک کر کے درویشی اختیار کی۔ ان کے بیٹے اور

خلیفہ شقیق بلخی (م:۱۹۴ھ/۸۰۹ء) بھی اہم صوفیہ میں ہیں۔ انھوں نے امام موسیٰ کاظم سے سفر مکہ معظمہ کے دوران ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا جن کے متعدد کرامات بیان کرتے تھے۔ خواجہ معروف کرخی (م:۲۰۰ھ/۸۱۵ء) اہم ترین صوفیہ میں ہیں۔ ان سے متعدد روحانی سلاسل قائم ہوئے جن کو سلسلۃ الذھب کہا جاتا ہے۔ ان کے والدین عیسائی تھے۔ انھوں نے امام رضا کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا تھا۔ انھیں کی غلامی پر افتخار کرتے تھے۔ شیخ فضیل بن عیاض (م:۱۸۷ھ/۸۰۳ء) پہلے ڈاکو تھے۔ ایک رات ڈاکہ ڈالنے نکلے، کسی شب زندہ دار کی تلاوت قرآن کانوں میں پڑی۔ دنیا ہی بدل گئی۔ تائب ہوگئے۔ امام جعفر صادق سے درس حاصل کیے۔ مصباح الشریعت لکھی جو ہنوز تصوف کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ دوسری صدی کی صوفیہ میں رابعہ عدویہ کو بحیثیت روزگار خاتون کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔ خواجہ عبدالماجد زید بصری (م:۱۷۷ھ/۷۹۳ء) بھی اسی صدی کے معروف صوفیہ میں تھے جن کے خوارق و کرامات کا بیان ملتا ہے۔

تیسری صدی ہجری کے صوفیہ میں خواجہ بایزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی (م:۲۶۱ھ/۸۷۴ء) کو اساسی اہمیت حاصل ہے جن سے متعدد روحانی سلاسل قائم ہوئے۔ مشہور ہے کہ امام جعفر صادق کے گھر میں سقا تھے لیکن تاریخ سے اس دعویٰ کی تصدیق نہیں ہوتی۔ شیخ بشر حافی (۲۶۲ھ/۸۴۰ء) پہلے فسق و فجور کے رسیا تھے۔ ان کے 'حافی' کہلانے کا سبب یہ ہے کہ جب وہ توبہ کرنے کے لیے امام موسیٰ کاظم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ننگے پاؤں (حافی) تھے، بس اسی دن سے 'حافی' لقب ہوگیا۔ ان کو بہت سی حدیثیں یاد تھیں لیکن روایت نہیں کرتے تھے۔ ان کے احباب میں شیخ سرّی سقطی (م:۲۵۱ھ/۸۶۵ء) نے ۹۸ سال کی عمر پائی۔ ہروقت الحمد اللہ سے توبہ کرتے رہتے تھے۔ سبب دلچسپ ہے کہ ایک بار بازار میں آگ لگی جس میں ان کی دکان بھی تھی۔ کسی سے اپنی دکان کی خیریت دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ آپ کی دکان بچ گئی۔ زبان سے بے ساختہ الحمد اللہ نکل گیا۔ بعد میں احساس ہوا کہ یہ میں نے کیا کیا۔ اس لیے ہروقت الحمد اللہ سے استغفار کرتے رہتے تھے۔ شیخ سری خواجہ معروف کرخی کے شاگرد و مرید اور خواجہ جنید بغدادی کے استاد اور ماموں تھے۔

خواجہ ابوالقاسم جنید بغدادی قواریری زجاج خراج (م:۲۹۷ھ/۹۰۹ء) نوے سال کی عمر پائی۔ نہاوند کے باشندہ تھے۔ جس طرح فقہاء کی جماعت شیخ طوسی کو شیخ الطائفہ کہتی ہے، اسی طرح صوفیہ انھیں سید الطائفہ کہتے ہیں۔ انھوں نے طریقت میں شریعت کا دامن نہ چھوٹنے دیا۔ اس لیے بعض شطحیات، جو دیگر صوفیوں کی زبان پر جاری ہوئے، ان کی زبان پر نہ آسکے۔ صوفیہ کا مخصوص لباس بھی نہیں پہنتے تھے بلکہ علماء و فقہاء کی طرح رہتے تھے۔ کسی نے کہا، کبھی کبھار یہی خرقہ پہن لیا کریں۔ جواب دیا، اگر لباس سے بن پڑتا تو میں لوہے کا لباس پہنتا۔ ۲۲ ان کے شاگردوں میں شیخ ممشاد دینوری (م:۲۹۹ھ/۹۱۱ء) کو قبول عام حاصل ہوا اور سلسلۂ چشتیہ کی بدولت شہرت دوام حاصل ہوئی۔ علوم ظاہر و باطنی سے آراستہ تھے۔ شیخ حارث محاسبی (م:۲۴۳ھ/۸۵۵ء) کے احباب میں تھے جو خواجہ جنید کے مصاحبوں میں تھے۔ ان کے 'مصاحبی' کہلانے کا سبب یہ تھا کہ مراقبہ کے انتہائی پابند تھے۔ ان کی امام حنبل (م:۲۴۱ھ/۸۵۹ء) سے پہلے دوستی رہی لیکن چونکہ امام حنبل علم کلام کے دشمن تھے اور شیخ حارث کو علم کلام سے رغبت تھی، اس لیے دوری

پیدا ہوگئی شیخ ذوالنون مصری (م:۲۴۵ھ/۸۵۹ء) کا نام ثوبان اور لقب ابوالفضل تھا۔امام مالک (م:۱۷۹ھ/۷۹۵ء) کے شاگرد تھے۔ابتداً عیسائی راہب تھے۔انھوں نے رمزیہ زبان واصطلاحات پر زور دیا جو بعد کے ادوار میں صوفیہ کی روش بن گئی۔ان پر زندیق ہونے کا الزام لگا۔ان کے اکثر شطحیات فقہاء کے نشانہ پر تھے لیکن سزا سے بچ گئے۔انھوں نے جدید افلاطونی فلسفہ کے متعدد مباحث تصوف میں داخل کیے۔۳۰ شیخ سہل بن عبداللہ تستری (م:۲۹۳ھ/۹۰۵ء) بھی ذوالنون مصری کے شاگردوں میں تھے۔ان سے سلسلۂ سہلیہ شروع ہوا، جو مجاہدۂ نفس پر زور دیتا تھا۔اسی صدی کے اہم صوفیہ میں شیخ منصور حلاج ہیں جن کا تفصیلی ذکر تصور اتحاد وحلول کے بیان میں ہو چکا ہے۔شیخ علی بن محمد بن احمد علوی (م:۲۷۰ھ/۸۸۳ء) کو صاحب الزنج کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے جس کے پیرو اصحاب الزنج کہے جاتے ہیں۔شیخ احمد بن خضروی (م:۲۴۰ھ/۸۵۴ء) مسلک ملامتیہ کے صوفی ہیں، جو شیخ حاتم اصم کے مرید وشاگرد تھے۔شیخ ابوصالح حمدون قصار نیشاپوری (م:۲۷۱ھ/۸۸۴ء) بھی سلسلہ ملامتیہ کے صوفی تھے، جن کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں۔شیخ ابوحفص حداد نیشاپوری (م:۲۶۷ھ/۸۸۰ء) اور شیخ ابوسعید خراز (م:۲۸۷ھ/۹۰۰ء) بھی خوارق کے لیے مشہور ہیں۔شیخ خراز سے سلسلہ خرازیہ شروع ہوا۔شیخ یحییٰ بن معاذ رازی (م:۲۵۸ھ/۸۷۱ء) رے کے باشندہ تھے۔ان صوفیوں میں تھے، جنھوں نے وعظ ونصیحت پر زور دیا۔

چوتھی صدی ہجری کے صوفیہ میں شیخ ابوبکر شبلی (م:۳۳۴ھ/۹۴۵ء) خواجہ جنید بغدادی کے شاگرد ومرید تھے۔خراسان کے باشندہ تھے۔انھوں نے رمزیہ زبان واصطلاحات کو خصوصی اہمیت دی اور اسے منبر تک پہنچادیا۔شیخ ابوعلی رودباری (م:۳۰۲ھ/۹۱۴ء) ساسان النسل تھے، جن کا سلسلۂ نسب نوشیرواں عادل تک پہنچتا ہے۔خواجہ جنید کے شاگرد ومرید تھے۔انھیں شریعت، طریقت اور حقیقت کا جامع کہا گیا۔شیخ ابونصر سراج طوسی (م:۳۷۸ھ/۹۸۸ء) کو ان کی کتاب اللمع کی بنا پر شہرت حاصل ہوئی، متعدد مشائخ براہ راست یا بالواسطہ ان کے شاگرد ہوئے۔ان کے مشہور شاگرد ومرید شیخ ابوالفضل سرخسی (م:۴۰۰ھ/ ہیں۔شیخ ابوطالب مکی (م:۳۸۵ھ/۹۹۵ء) کو ان کی کتاب قوۃ القلوب کی بنا پر زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔اسی طرح شیخ ابوبکر محمد بن اسحٰق کلاباذی (م:۳۸۰ھ/۹۱۹ء) کو اپنی کتاب التعرف کی بنا پر شہرت حاصل کی۔شیخ ابوعبداللہ محمد بن خفیف (م:۳۷۱ھ/۹۸۱ء) شافعی المسلک تھے۔اپنے دور کے اکابر صوفیہ میں شمار ہوتے تھے۔

پانچویں صدی ہجری کے صوفیہ میں شیخ ابوالحسن خرقانی (م:۴۲۵ھ/۱۰۳۳ء) کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ان کے بارے میں محیر العقول باتیں مشہور ہیں۔مولانا روم ان کے معتقدین میں تھے۔انھوں نے لکھا ہے کہ شیخ خرقانی شیخ بسطامی کی قبر پر جا کر ان کی روح سے رابطہ قائم کرتے اور ان سے اپنے مسائلِ تصوف کا حل حاصل کرتے تھے:

بوالحسن بعد از وفات بایزید — از پس آن سالہا آمد بدید
گاہ و بیگہ نیز رفتی بی فتور — بر سر گورش نشستی باحضور
تامثال شیخ پیشش آمدی — تا کہ بی گفتی شکالش حل شدی

شیخ ابوسعید ابوالخیر (م:۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء) شیخ سرخسی کے شاگرد ومرید تھے۔فارسی رباعی گویوں

میں خصوصی شہرت کے حامل ہیں۔ان کے نزدیک صوفی کی خصوصیت ہونا چاہئے کہ جو کچھ اس کے سر میں ہے،اسے نکال دے۔جو کچھ ہاتھ میں ہے اسے دیدے اور جو کچھ نازل ہوا ہو،اسے گذار دے۔ان کے وعظ میں بوعلی سینا (م:۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء) بھی شرکت کرتے تھے۔شیخ ابوعلی دقاق نیشاپوری (م:۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء) مناجات میں شدید گریہ کرنے کی بناپر 'شیخ نوحہ گر' کہتے جاتے تھے۔جامع شریعت وطریقت قرار دیئے جاتے ھے۔شیخ ابوعبدالرحمٰن سلمٰی نیشاپوری (م:۴۱۴ھ/ ۱۰۲۳ء) کا شمار اکابر صوفیہ میں ہوتا ہے۔ان کی تصنیف طبقات الصوفیہ مشہور ہے۔شیخ ناصح الدین ابومحمد چشتی (م:۴۱۱ھ/۱۰۲۰ء) نے ستر سال کی عمر میں محمود غزنوی کے ہمراہ فتح سومناتھ میں حصہ لیا تھا۔خواجہ سید ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری (م:۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء) بھی پانچویں صدی ہجری کے اہم صوفیہ میں ہیں جن کا ذکر ہندوستانی صوفیہ میں کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔اس صدی کے اہم صوفیوں میں خواجہ عبداللہ انصاری تھے جو جلیل القدر صحابی حضرت ایوب انصاری کی اولاد میں تھے۔ہرات کے باشندہ تھے۔'پیر ہرات' مشہور ہیں۔ان کے بعض کلمے سکۂ رائج الوقت ہیں---- بچپن میں پستی،جوانی میں مستی،بڑھاپے میں سستی،پھر خدا پرستی کب؟ برائی کے بدلہ میں برائی کرنا،کتوں کی روش (سگ ساری) اچھائی بدلہ میں اچھائی کرنا،گدھوں کا کام (خرخاری) اور برائی کے جواب میں بھلائی کرنا،خواجہ عبداللہ انصاری کا شیوہ ہے!امام ابوحامد محمد غزالی (م:۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) مشہور ترین اسلامی حکماء میں ہیں۔ان کی کتاب احیاء علوم اسلامی کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔

چھٹی صدی ہجری کے صوفیہ میں سب سے اہم شخصیت شیخ عبدالقادر جیلانی (م:۵۶۱ھ/ ۱۱۶۵ء) ہیں،جو ہندوستان میں 'بڑے پیر صاحب' کہے جاتے ہیں،گیلان کے باشندہ تھے،جس کا معرب 'جیلان' ہے۔ان سے سلسلۂ قادریہ شروع ہوا۔علوم ظاہری وباطنی سے بہرہ ور تھے ان کی تصانیف میں فتوح الغیب، بشائر الخیرات اور طریق الحق زیادہ مشہور ہیں۔ایک دیوان بھی منسوب ہے۔دیگر اہم صوفیہ میں شیخ عین القضاۃ ہمدانی (م:۵۳۳ھ/۱۱۳۸ء) پرجوش صوفی تھے۔امام غزالی کے چھوٹے بھائی شیخ احمد غزالی کے شاگرد تھے،جو خود بھی جید صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں۔شیخ عین القضاۃ کو شطحات کے الزام میں کافر قرار دیا گیا۔قتل کر کے لاش جلا کر راکھ بنائی گئی و رہوا میں بکھیر دی گئی۔شیخ روزبہان بقلی شیرازی (م:۶۰۶ھ/۱۲۰۹ء) کے بیانات بھی شطحیات سے لبریز ہوتے تھے،حتیٰ کہ 'شیخ شطاح' لقب ہوگیا،لیکن مفتیوں کے عتاب سے محفوظ رہے۔شیخ ضیاء الدین ابونجش عبدالقادر (م:۵۶۳ھ/۱۱۶۷ء) بھی شیخ احمد غزالی کے مرید وشاگرد تھے۔ان کے واعد شیخ عبداللہ عمویہ بھی صوفی بزرگ تھے۔فارسی شعرا میں حکیم سنائی غزنوی (م:۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء) اور احمد جامی (م:۵۳۶ھ/۱۱۴۱ء) کو تاریخ تصوف میں اہمیت حاصل ہے۔جامی کو 'ژندہ پیل' بھی کہا جاتا ہے۔

ساتویں صدی ہجری کے صوفیہ میں شیخ نجم الدین کبریٰ (م:۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء) شیخ روزبہان بقلی کے شاگرد مرید اور داماد تھے۔انھوں نے بہت سے شاگردوں کی تعلیم وتربیت کی جن میں مولانا رومی کے والد شیخ بہاالدین اور شیخ سعدالدین حمویہ (م:۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء) شامل ہیں۔ان سے سلسلہ کبرویہ جاری ہو۔ان کی رہائش خوارزم میں تھی۔خوارزم مغلوں کے حملوں کا نشانہ بنا تو شیخ نجم الدین کبریٰ کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنے

مریدین کے ہمراہ شہر کے باہر آجائیں تا کہ انھیں کوئی گزند نہ پہنچے۔ شیخ موصوف نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم نے آرام وسکون کا دور اہل خوارزم کے ہمراہ گذرا، مصیبت و آزمائش کے وقت میں ان کا ساتھ ترک نہیں کرسکتا۔ خود شیخ نے بھی مغلوں کے مقابلہ میں اسلحہ اٹھایا اور اپنی جان قربان کر دی۔ شیخ شہاب الدین سہروردی زنجانی (م:۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء) شیخ الاشراق شیخ شہاب الدین سہروردی (م:۵۹۰ھ/۱۱۹۳ء) کے ہم نام ہونے کی بنا پر اکثر تسامح میں ایک ہی شخصیت قرار دیدیا جاتا ہے، حالانکہ دونوں کے سنین وفات میں ۴۲ سال کا فرق ہے۔ شیخ زنجانی کو اپنی تصنیف اعوارف المعارف سے شہرت حاصل ہے۔ شیخ الاکبر شیخ محی الدین ابن عربی کا ذکر وحدت الوجود کے سلسلہ میں کیا جاچکا ہے۔ ان کے شاگرد مرید اور سوتیلے بیٹے شیخ صدرالدین محمد قونیوی (م:۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) تھے، جوان کے افکار وخیالات کے بہترین مفسر تھے۔ ان کی اہم تصانیف میں النوح فی تحقیق الطور المخصوص، اللمعته النورانیه فی مشکلات الشجرة النعمانیه اور اعجاز البیان اہم ہیں۔ عربی شاعر ابن الفارض (م:۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء) اور فارسی شعرا میں مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی (م:۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) کی مثنوی کو زبان پہلوی میں قران سے نسبت دی گئی ہے۔ ان کے صوفیانہ تصورات ہر دور میں مقبول رہے ہیں۔ علامہ اقبال انھیں اپنا پیرومرشد مانتے تھے۔ شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری (م:۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء) اپنی صوفیانہ مثنویوں منطق الطیر، اسرار نامہ، الہیٰ نامہ، مصیبت نامہ اور تذکرة الاولیا کے لیے مشہور ہیں۔ شیخ فخرالدین (م:۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء) کا تخلص عراقی تھا، ہمدان میں پیدا ہوئے اور ملتان چلے آئے۔ شیخ بہاء الدین زکریا (م:۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء) اور شیخ قونیوی کے شاگرد تھے۔"

آٹھویں صدی ہجری کے صوفیہ میں شیخ علاء الدولہ سمنانی کا ذکر وحدت الشہود کے تعلق سے ہو چکا ہے۔ دیگر صوفیوں میں سید حیدر آملی کی تصانیف میں جامع الاسرار اور نص النصوص اہم ہیں۔ شیخ محمود شبستری (م:۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء) کی نظم گلشن راز، تصوف کے رموز بیان کرتی ہے۔ سلسلۂ نقشبندیہ کے موسس شیخ بہاء الدین نقشبند (م:۷۹۱ھ/۱۳۸۸ء) کی تصانیف حیات نامہ اور دلیل العاشقین مشہور ہیں۔ آٹھویں صدی کے اہم ترین فارسی شاعر خواجہ حافظ شیرازی (م:۷۹۱ھ/۱۵۸۳ء) کے حالات زندگی کی تفصیل نہیں ملتی لیکن ان کے عہد آفرین شاعر ہونے کے علاوہ صوفی، حافظ عالم اور مفسر قرآن ہونے میں کلام نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے اپنے ان صفات کی جانب بار بار اشارہ کیا ہے:

ندیدیم خوشتر از شعر تو حافظ — بہ قرآنی کہ اندر سینہ داری
عشقت رسد بہ فریاد گر خود بسان حافظ — قرآن زبر بخوانی باچاردہ روایت
زحافظاں جہاں کس چو بندہ جمع نکرد — لطائف حکمی با نکات قرآنی

حافظؒ کے صوفیانہ تصورات کی متعدد بار وضاحت کی گئی ہے۔ محقق جلال الدین دوانی نے حافظ کے اس شعر کے صوفیانہ تصورات کی وضاحت میں ایک رسالہ لکھا ہے:

پیر ما گفت خطا بر قلم صنع نرفت — آفریں برنظر پاک خطاپوشش باد

نویں صدی ہجری کے صوفیہ میں شاہ نعمت اللہ ولیؒ (م:۸۳۵ھ/۱۴۳۰ء) کو اولیت حاصل ہے۔

انھوں نے ۹۵ سال کی عمر پائی، جس کا بیشتر حصہ آٹھویں صدی میں گذرا۔ کرمان کے قصبہ ماہان میں ان کا مزار زیارت گاہ و مرجع عام و خاص ہے۔ اسی طرح کے دوسرے صوفی بزرگ شیخ شمس الدین محمد لاہیجی نور بخشی اور امیر کبیر سید علی ہمدانی ہیں۔ ان تینوں روحانی سلسلوں میں اہل تشیع اور اہل تسنن دونوں ہیں۔ شیخ نور بخشی اور شاہ ہمدانی کے ذکر ہندوستان میں صوفیہ کے تذکرہ میں کیے جائیں گے۔ شیخ صائن الدین علی ترکہ اصفہانی کو محقق صوفیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی تصنیف تمہید القواعد تبحر و مہارت کی دلیل ہے۔ شیخ محمد بن حمزہ فناری رومی عثمانی مملکت کے علماء میں تھے۔ لیکن تصوف میں شہرت کا سبب ان کی تصنیف مصباح الانس ہے شیخ عبدالکریم جیلی (م:۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء) کی شہرت ان کی کتاب الانسان الکامل سے قائم ہے۔ شیخ عبدالرحمٰن جامی (م:۸۹۸ھ/۱۴۰۲ء) نے اکاسی سال کی عمر پائی جو صوفیہ میں اپنے مرشد شیخ بہاء الدین نقشبند سے بھی زیادہ اعلیٰ و ارفع قرار دیے گئے۔

* ہندوستان میں اکابر صوفیہ :

گذشتہ صفحات میں ان اکابر صوفیہ کا ذکر آچکا ہے جن کے بارے میں تفصیل سے جاننے کی خواہش ہوتی ہے لیکن تنگیٔ داماں کی مجبوری کی بنا پر یہاں چند اہم ترین اکابر صوفیہ کا ذکر ہی کیا جاسکے گا جنھوں نے ملکی دینی و روحانی زندگی میں انقلاب برپا کردیا۔ ان صوفیہ کے تعلق سے پہلی اہم بات یہ ہے کہ ان میں بیشتر کی آمد ایران، جزیرہ اور ماوراالنہر سے ہوئی تھی یعنی نظریاتی اعتبار سے یہ صوفیہ آریائی تصورات کے حامل تھے، محض چند صوفیہ ان علاقوں سے آئے جہاں سامی تصورات تھے۔ ہندوستانی عوام و خواص نے صوفیہ کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ صوفیہ کے زہد و تقویٰ نے دلوں کو مسخر کرلیا۔ ان کی کشادہ دلی نے سنگلاخ بنیاد پرستی کے حدود توڑ دیئے۔ اہل طریقت نے اہل شریعت کی متعدد پابندیاں ختم کردیں۔ ہندو عوام میں گھل مل گئے۔ ان سے انھیں کے انداز میں گفتگو کی۔ موسیقی سے سماع کی محفلیں آراستہ کیں۔ تصوف کا ایرانی و عربی پودا ہندوستانی سرزمین میں خوب خوب برگ و بار لایا۔ صوفیہ نے خلوص و یگانگت کے آبشار سے اس طرح سیراب کیا کہ تصوف کا ایرانی و عربی نوخیز پودا ہندوستان کی زرخیز زمین میں تناور چھتنار درخت بن گیا، جس کے فیوض و برکات کی ٹھنڈی چھاؤں میں تلاشِ حق کے مسافروں کو جائے امان حاصل ہوگیا۔ محبت و عقیدت کے تعطر سے چمن ہند مہک اٹھا اور مہک رہا ہے۔ صوفیہ سے عقیدت مندی میں ہندو عوام مسلم عوام سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ ان کے مواعظ میں اخلاص و احترام سے شریک ہوتے۔ ان سے متاثر ہو کر ہزارہا افراد نے اسلام اختیار کیا، لاکھوں نے اپنے آبائی مذہب و عقیدہ پر قائم رہتے ہوئے صوفیہ سے اکتساب فیض روحانی کیا۔

صوفیائے کرام میں اہل تشیع کی طرح تقیہ کا عام رواج تھا تا کہ بعض سلاطین کے شدائد کا نشانہ بننے سے بچ سکیں۔ مزید برآں اپنا مافی الضمیر واضح الفاظ میں بیان کرنے کی بجائے رمز و کنایہ اور اصطلاحات کے پیرایے میں گفتگو کرتے تا کہ ان سے وابستہ لوگوں کے علاوہ کوئی غیر شخص ان کے اصل عندیہ تک نہ پہنچ سکے۔ سید علی ہجویری نے لکھا ہے کہ رمز و کنایہ اور اصطلاحات کے پیرایے میں گفتگو کرنے کا مقصد اپنی باتوں کو

غیروں سے مخفی رکھنا ہوتا تھا تاکہ اپنی بات کو اپنے دائرے کے اندر محدود رکھا جاسکے۔ ان کا یہ طرزِ عمل انسانی فطرت کے مطابق تھا کیونکہ ہر شخص کی استعداد یکساں نہیں ہوتی، ہر شخص ہر بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ قرآن کا ارشاد ہے: وَ فَوقَ کُلِ ذِیٔ عِلمٍ عَلِیمِ (اور ایک سے بڑھ کر ایک دانا ہے: یوسف ۱۲/۷۶) ایسی تعلیمات کی جانب حضرت علی نے بھی اشارہ کیا ہے کہ لوگوں کو ان کے فہم کے مطابق احادیث سنایا کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ وہ اللہ اور رسول کی تکذیب کریں: بخاری، باب العلم، ۴۹) لیکن ہندوستانی صوفیہ میں تقیہ کی مخالفت بھی ہوئی۔ سہروردیہ سلسلہ کے بانی سید جلال اعظم سرخ پوش (م:۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء) کے پوتے سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت (م:۷۸۵ھ/۱۳۸۳ء) کے سگے چھوٹے بھائی سید صدرالدین راجو قتال (م:۸۴۸ھ/۱۴۴۴ء) نے پہلی بار تقیہ کے خلاف تحریک چلائی کیونکہ ان کے خیال میں تقیہ کرنے کی بنا پر شیعوں کی اولاد اپنے آبائی مذہب سے محروم ہو کر عقیدہ اہل سنت قبول کر لیتی تھی۔ لیکن بعض مصلحتوں کے پیش نظر تقیہ کا رواج باقی رہا۔ حتیٰ کہ ۱۸ویں صدی کے اواخر تک اوچ کی خانقاہ نے اپنی شیعیت کا اعلان کر دیا۔[۲۴]

صوفیہ نے اہل بیت رسول کی مودت و محبت میں سرشار ہو کر مواعظ کہے، ملفوظات تحریر کیے، اشعار نظم کیے، ہر ممکن طریقہ سے اسلامی تبلیغ و اشاعت کرتے رہے لیکن ان کے پیغامات سب سے زیادہ محفل سماع کی بدولت عوام تک پہنچے۔ ان محفلوں میں ہر شخص کو اپنے ذوق و شوق اور مزاج و کیفیت کا سامان مہیا تھا۔ صوفیہ محفل سماع میں وجدانی کیفیتوں سے دوچار ہوتے تھے۔ لیکن کسی کو اگر محفل سماع سے بھی بڑھ کر حب اہل بیت میں سرشاری کی جستجو کرنا ہو تو صوفی قلندروں میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ یہ قلندر موسیقی اور نغمہ کے رسیا تھے۔ انھوں نے حضرت علی اور اہل بیت رسول کی مدح و منقبت کے نغمے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ میں گانا شروع کر دیئے۔ شیخ لال شہباز قلندر کی خانقاہ، سہوان سندھ (پاکستان) میں حضرت علی کی فضیلت کے نغمے بڑے شد و مد سے گائے جاتے ہیں۔ دمادم مست قلندر، علی دا پہلا نمبر! تفصیلات سے قطع نظر روحانی و عرفانی حکایتِ دل پذیر مختصراً اس طرح بیان کی جاسکتی ہے:

ہندوستان میں صوفیہ کی اولین آمد خواجہ حسن بصری (م: ۱۱۶ھ/۷۳۴ء) کے نام نامی سے معنون ہے۔ حالانکہ اس کے تاریخی شواہد مفقود ہیں لیکن قرائن سے انکار نہیں کیا سکتا کیونکہ حیاتِ رسالت مآب سے ہی اہل ایمان کا تبلیغ دین کے تعلق سے دیارِ ہند میں آنا شروع ہو گیا تھا، جن میں کئی بزرگانِ دین خاکِ پاکِ ہند میں آسودہ ہیں۔ ان میں ابوتمیم انصاری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بعد وفات رسول ہندوستان آگئے تھے۔ چنئی (تمل ناڈ) سے ۵۰ ک م فاصلہ پر ملیاپورم (تمیم نگر) میں ساحل سمندر پر ان کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ دیگر صحابی شیخ عبداللہ مکی اصحاب صفہ میں تھے، آسودہ خاکِ پاکِ ہند ہیں۔ عقیدت مندوں میں دادا حیات میر قلندر کے نام سے معروف ہیں۔ ان کا مزار چک منگلور (کرناٹک) میں مختلف اہل مذاہب کے درمیان یکساں طور پر مقبول ہے۔ ان دنوں ہندو انتہا پسندوں نے ان کو ہندو ریشی قرار دے کر مزار پر قبضہ کرنے کی مہم چلا رکھی ہے۔ دیگر اہم صوفیہ میں عبدالرحمٰن اصطخری، ابوموسیٰ سندھی، محمد بن زیاد سندھی، ربیع بن صبیح، مکحول سندھی وغیرہ کے مزارات ہیں۔ لیکن صوفیہ کی آمد کا تسلسل تاریخی اعتبار سے سلطان محمود غزنوی کے فتح ملتان

(۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء) کے بعد سے ملتا ہے۔ ہندوستان میں اولین صوفی شیخ صفی الدین گاذرونی (م: ۳۹۸ھ/ ۱۰۰۷ء) ہیں جو وادی اوچہ (سندھ) میں وارد ہوئے۔ وہاں انھوں نے پہلی بار اسلامی دارالعلوم قائم کیا، جس میں تقریباً ڈھائی ہزار طلبہ تعلیم پاتے تھے۔ ان کی تشریف آوری سے متعلق حکایت ہے کہ ان کے چچا شیخ ابواسحق قزوینی (م: ۴۲۷ھ/۱۰۳۵ء) نے اپنا خلیفہ نامزد کرنے کے بعد ان کا سامان ایک اونٹ پر سامان بار کر کے روانہ کر دیا کہ جس جگہ اونٹ رک جائے، وہی تمھارا مستقر ہے۔ وہ اونٹ وادی اوچہ (ملتان، پاکستان) میں رکا۔ یہ آمد ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء کے قریب ہوئی۔[۲۵] اس واقعہ میں یہ مماثلت اہم ہے کہ اسی طرح رسول اللہ بھی مدینہ منورہ تشریف لائے تھے۔ جس جگہ اونٹ رکا، وہی مستقر قرار پایا۔ یہ سنت رسول کی پیروی ہو سکتی ہے، جس کی صوفی سے زیادہ توقع کی جا سکتی ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ سندھ پر مسلمانوں کی حکمرانی دور محمد بن قاسم (۹۶-۹۳ھ/۱۲-۷۱۱ء) سے قائم ہو چکی تھی۔ ابتدا میں بعض علماء و صلحا بھی وارد ہند ہوئے لیکن بعد کے ادوار میں پھر صوفیہ کی آمد تقریباً تین صدی تک کیوں نہ ہو سکی۔ اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ محمد بن قاسم کا دور ہنگامی و عبوری تھا جس کے بعد زیدیوں اور اسماعیلیوں کی حکومت شروع ہوگئی۔ حالانکہ زیدیہ و اسماعیلیہ بھی شیعی فرقے تھے۔ ان کے اور صوفیہ کے درمیان اثناعشری شیعوں کے برعکس ہم آہنگی نہیں تھی۔

سلطان التمش کے دور حکومت (۳۶-۱۲۱۱ء) میں نہ صرف یہ کہ صوفیہ کی آمد تیز ہوئی بلکہ ان کے پاؤں سرزمین ہند پر قائم ہو گئے کہ ان کو ارباب حکومت کے سفید و سیاہ میں دخل حاصل ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ سلطان محمد غوری کے نائب ناصر الدین قباچہ کے خلاف شیخ بہاؤ الدین زکریا (م ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء) کی شکایت پر التمش نے قباچہ حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ سلطان التمش کو مشائخ و صلحاء سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ ان سے انتہائی تعظیم و تکریم سے پیش آتا تھا۔ شیخ جلال الدین تبریزی دہلی تشریف لائے تو التمش نے علماء و مشائخ کے ہمراہ بیرون شہر جا کر استقبال کیا۔ ان کو دیکھتے ہی گھوڑے سے اتر آیا، انھیں آگے کر کے خود پیچھے پیچھے چلا۔ قاضی قطب الدین کاشانی کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ گیا، سلام کیا اور اپنے پاس بٹھایا۔ قاضی حمید الدین ناگوری سے جماعت مفتیان خفا تھی۔ ان سے التمش نے وعدہ کیا تھا کہ ان کی تعظیم و تکریم نہیں کرے گا۔ لیکن ان کو دیکھتے ہی مفتیوں سے کیا گیا اپنا وعدہ بھول گیا۔ اپنے تخت سے نیچے اتر آیا اور لپک کر ہاتھوں کو بوسہ دینے لگا۔ سلطان غیاث الدین بلبن (۸۷-۱۲۶۶ء) بھی اہل حال کا انتہائی عقیدت مند تھا۔ شیخ علی نے دہلی سے چشت واپس جانے کا ارادہ کیا تو بلبن نے ان کے قدموں پر گر کے قسم کھائی کہ اگر آپ چشت تشریف لے گئے تو میں اپنی سلطنت ترک کر کے آپ کے رکاب میں چلوں گا۔ بلبن خواجہ فریدالدین گنج شکر اور شیخ فرید الدین ترک پانی پتی کی خدمت میں حاضر ہوتا تو دست بستہ ایستادہ رہتا۔ سلطان علاء الدین خلجی (۱۳۱۶-۱۲۹۲ء) کو خواجہ نظام الدین اولیا، سے ایسی بے پناہ عقیدت تھی کہ اپنے دو بیٹوں خضر خاں اور شادی خاں کو حلقۂ ارادت میں دے دیا تھا۔ ان کی محفل سماع کے اشعار سن کر اپنا سر دھنتا اور کہتا ____ سر سے پاؤں تک آلودۂ گناہ کو اس پاک نفس سے ملاقات کرنے میں شرم آتی ہے! سلطان فیروز شاہ (۸۸-۱۳۵۱ء) بھی صوفیہ کا انتہائی معتقد تھا۔ خواجہ جہانیاں جہاں گشت ہر دوسرے تیسرے سال دہلی آتے۔ سلطان شہر کے باہر سے استقبال کرتا۔ محل میں ملاقات کے لیے آتے تو سلطان تخت پر کھڑا ہو جاتا، اپنے ساتھ بیٹھاتا، رخصت

ہوتے تو محل کے باہر تک آ کر رخصت کرتا۔ جب تک نظروں سے اوجھل نہ ہوتے وہیں کھڑا رہتا۔ ایک بار سلطان حاضر خدمت ہوا، خواجہ عبادت میں مصروف تھے۔ سلطان دیر تک خاموش کھڑا رہا کہ خواجہ نماز سے فارغ ہو جائیں۔

ہندوستان میں صوفیہ کے روحانی فیضان کا تسلسل اس وقت قائم ہوا، جب مسلک جنیدیہ کے صوفی بزرگ شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلی نے اپنے شاگرد شیخ حسین زنجانی (م: ۴۲۷ھ/۱۰۳۵ء) کو لاہور میں خدمت دین پر مامور کیا، پھر اپنے نوجوان شاگرد سید ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری کو شیخ زنجانی کی معاونت پر مامور کیا۔ سید علی ہجویری نے عذر کیا کہ وہاں ایک بزرگ پہلے سے موجود ہیں لیکن شیخ ختلی اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔ سید علی ہجویری لاہور آئے۔ رات میں شہر میں داخل ہوئے۔ اسی رات شیخ حسین زنجانی کا انتقال ہو گیا۔ لاہور کے نواح 'چاہ میراں' میں مدفون ہیں۔ دوسری روایت مختلف ہے، جس کے مطابق شیخ زنجانی سید علی ہجویری کی وفات کے بعد تک حیات رہے۔ حتیٰ کہ خواجہ معین الدین چشتی نے لاہور میں ان کے ساتھ قیام کیا۔[۲۷]

خواجہ سید علی محمد ہجویری (م: ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) کی کنیت ابوالحسن تھی۔ غزنی کے دو گاؤں 'ہجویر' اور 'جلاب' میں ابتداً سکونت کرنے کی بنا پر 'ہجویری' یا 'جلبی' کہلائے۔ چونتیس برسوں تک لاہور میں رہ کر علمِ ظاہری و باطنی کی اشاعت کرتے رہے، لہٰذا لاہوری بھی کہے گئے۔ ان کے والد عثمان بن ابوعلی جلابی درویشِ کامل، عالمِ متبحر اور مصنف تھے۔ ساداتِ کبار میں تھے۔ خواجہ سید علی محمد ہجویری کو تاریخ صوفیہ میں متعدد پہلوؤں سے اہمیت حاصل ہے۔ حالانکہ ان کی متعدد تصانیف تھیں لیکن ان میں 'کشف المحجوب' ہی دستِ بردِ زمانہ سے محفوظ رہ سکی ہے۔ یہی تنہا کتاب ان کے بقائے دوام کی ضامن ہے۔ اس کو تصوف کے آئین کی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے مختلف ادوار کے صوفیہ اکتساب فیض کرتے رہے ہیں۔۔ خواجہ معین الدین چشتی نے کسب فیض کے لیے ان کے مزار پر چلہ کشی کی اور رخصت کے وقت یہ شعر نذر کیا تھا:

گنج بخشِ فیضِ عالم، مظہرِ نورِ خدا　　ناقصان را پیر کامل، کاملان را رہنما

اس کے بعد سے کو داتا گنج بخش کا لقب سید علی ہجویری کے نام کا جزو بن گیا۔ خواجہ فریدالدین گنج شکر نے بھی آپ کے مزار پر چلہ معکوس کیا تھا۔[۲۸] لاہور میں ان کا روضہ سلطان ناصرالدین محمود غزنی (۱۰۳۰-۴۰ء) کے بیٹے ظہیرالدولہ نے تعمیر کرایا اور اکبر اعظم (۱۶۰۵-۱۵۵۵ء) نے خانقاہ اور ڈیوڑھی بنوائی۔ ہنوز مرجع خاص و عام ہے۔ شہزادہ دارا شکوہ اپنے زمانہ کا حال لکھا: 'خلقی انبوہ بر شب جمعہ بزیارت آں روضہِ منورہ مشرف می گردید و مشہور است کہ ہر کہ چہل شب جمعہ یا چہل روز پیہم طواف روضہِ شریف ایشاں بکند، ہر حاجتے کہ داشتہ باشد حصول می انجامد۔' علامہ اقبال بھی مدح سرا ہیں:

سید ہجویر مخدومِ امم　　مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم
بندہائے کوہسار آساں گسیخت　　در زمینِ ہند تخمِ سجدہ ریخت
پاسبانِ عزتِ ام الکتاب　　از نگاہش خانۂ باطل خراب

ہندوستان میں تصوف کو صوفیائے چشتیہ کی بدولت قبول عام حاصل ہے۔ تصوف اور صوفیائے

چشتیہ معانی و مفاہیم میں لازم و ملزوم بن گئے۔ ہندوستان میں تصوف کی تاریخ صوفیائے چشتیہ کے گراں قدر کارناموں کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندوستان میں تصوف کی تاریخ ہی صوفیائے چشتیہ کی تاریخ ہے۔ ان کے روحانی مراکز برصغیر کے تینوں ممالک، بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش پر محیط ہیں۔ یہ طریقت علویہ کا روحانی سلسلہ خواجہ ممشاد دینوری (م:۲۹۹ھ/۹۱۱ء) کے وسیلہ سے صوفیہ کے ممتاز ترین سلسلۃ الذھب میں شامل ہے۔۲۹؎ حالانکہ اس کے موسس خواجہ الحق شامی (م: ۳۲۹ھ/۹۴۰ء) ہیں لیکن لقب چشتیہ خواجہ ابو احمد ابدال چشتی (۳۵۶ھ/۹۶۶ء) کی نسبت سے ہوا۔ یہ سلسلہ روحانی چشت میں مقبول نہ ہو سکا اور خواجہ مودود چشتی (م:۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء) کے خلفاء میں خواجہ احمد، خواجہ رکن الدین اور خواجہ حاجی شریف کے ساتھ اختتام پذیر ہو گیا۔ البتہ خواجہ حاجی شریف کے خلیفہ خواجہ عثمان ہردانی نے نیشاپور میں سکونت اختیار کر لی۔ باقی چشتیہ صوفیہ نے خانہ بدوش درویشوں کی زندگیا ختیار کر لی۔ چشت کا روحانی مرکز بھی ترک قبائل کے جنگ و جدل کا مرکز بن گیا۔ اس علاقہ میں امن و امان اس وقت بحال ہوا جب سلطان غیاث الدین محمد (۱۲۰۳-۱۱۲۳ء) سلطنت غور کا حکمران ہوا۔ اس کا دارالسلطنت فیروزکوہ تھا جہاں علماء و فقہا، شعرا و ادباء وغیرہ کھنچ کر آ گئے۔ اس نے فیروزکوہ میں مسجد بنائی اور ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ لیکن فیروزکوہ کی فضا صوفیہ سے ہم آہنگ نہ تھی۔ اس کے بھائی سلطان شہاب الدین معز الدین سام معروف بہ محمد غوری نے ۶۰۰ھ/۱۲۰۳ء میں اپنے جاں نثار غلام سپہ سالار قطب الدین ایبک کو نائب السلطنت بنا کر ہندوستان میں شنسبانی حکمرانی کی بنیاد ڈالی۔ سلطان محمد غوری کے امیر فوج مقتدر صوفی بزرگ میراں سید حسین خنگ سوار (م:۵۹۸ھ/۱۲۰۱ء) تھے۔ ایبک نے انھیں سلطنت غوری کی سرحد کے قریب اجمیر کا قلعہ دار بنایا۔ نسبی افتخار، علم و فضل اور اعلیٰ عہدہ سے زیادہ زہد و تقویٰ اور اپنے روحانی کشف کی بنا پر مقبول تھے۔ ان کا مزار تارا گڈھ (اجمیر) میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ ان کے بھتیجے سید حسن مشہدی کی صاحبزادی عصمۃ اللہ کا عقد خواجہ معین الدین چشتی سے ہوا تھا۔

دہلی میں اولاً شیخ ابو بکر طوسی کی خانقاہ کا ذکر ملتا ہے جو قلعۂ کہنہ کے قریب ٹیلہ پر واقع تھا۔ شیخ نورالدین مَلک یارپرّاں (م:۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء) جو شیخ دانیال جُجی کے مرید تھے، لاہور سے آئے اور وہیں قیام پذیر ہوئے تو شیخ ابوبکر نے منع کیا۔ انھوں نے اپنے مرشد کا نوشتہ دکھلایا۔ شیخ ابوبکر نے کہا، طغرائے شاہی بھی لا کر دکھاؤ۔ شیخ نورالدین نے ۱۳۰ میل کا سفر طے کر کے سلطان بلبن کا فرمان پیش کر دیا۔ اسی دن سے 'مَلک یارپرّاں' لقب ہو گیا۔ تمام عمر وہیں رہ کر رشد و ہدایت کرتے رہے اور اسی ٹیلہ پر مدفون ہوئے۔ شیخ ابوبکر طوسی کی خانقاہ دہلی کی مقبول خانقاہوں میں تھی جس کی محفل سماع میں اکابر صوفیہ شریک ہوتے تھے۔ سلطان غازی کے نام سے مشہور سلطان ناصرالدین محمود (م:۶۶۹ھ/۱۲۹۹ء) کا شمار بھی صوفیہ میں ہوتا ہے۔ شاہ ترکان (م:۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) ہر وقت عالم استغراق میں رہتے تھے، ان کے مزار کی نسبت سے ترکمان دروازہ ہنوز مشہور ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی سجزی (م: ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء) کی ہندوستان میں تشریف آوری اور پھر سرزمین ہند میں ہی سکونت اختیار کرنا تاریخ صوفیہ میں ہی نہیں۔ ہندوستانی روحانی تاریخ کا باعث افتخار باب

ہے بقول مولانا غلام علی آزاد: "ہندوستان بہ یمن قدم میمنت لزومش طریقہ اسلام ظاہر گشت وسیاہی کفر وشرک از عرصہ روزگار بزددنی" ہندوستان میں اجمیر موصوف کی نسبت سے 'اجمیر شریف' ہوگیا، ان کے مولد قصبہ چشت (خشت) کو رتبہ ملا کہ اس کی نسبت سے 'خواجہ چشت' کہلائے۔ ورنہ چشت ہرات سے قریب ہری رود کے ساحل پر واقع ایک قریہ ہے اور کیا! جس پر غوری حکومت کے قیام سے قبل مختلف خراسانی گورنر حملہ آور ہوتے رہتے تھے۔ چشت کے قدیم باشندے بدھ مت کے پیرو تھے، جن کو یہودیوں نے نکال باہر کیا اور ان کے مال واملاک پر قابض ہوگئے۔ یہودیوں کو مانیوں نے مار بھگایا اور بالآخر مسلمانوں نے مانیوں کو مشرف بہ اسلام کر لیا لیکن ان میں بعضوں نے ترک وطن کو ترجیح دی۔ مجموعی طور پر علاقہ چشت میں مسلمانوں کی آبادیاں ہوگئیں۔ اسی بنا پر چشتی صوفیہ کی تعلیمات میں سامی تصورات اور آریائی تصورات کی آمیزش نظر آتی ہے، جو مختلف النوع ہیں۔ اسی آمیزش کی بدولت وسیع النظری، کشادہ قلبی اور انسان دوستی کو چشتی صوفیہ نے تصوف کے بنیادی تصورات میں شامل کیا جو سلسلہ چشتیہ کی بے پناہ مقبولیت کا سبب بنا۔ ۳۲

خواجہ معین الدین کی ولادت میں بجستان (سیستان) میں اور پرورش و پرداخت خراسان میں ہوئی ہے۔ ان کے والد سید غیاث الدین حسن متقی وخداترس بزرگ تھے۔ بیٹے کی عمر پندرہ سال کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ نوجوان معین الدین نے کسی مجذوب صوفی سے متاثر ہوکر آبائی جائیداد فروخت کرکے غربا ومساکین میں تقسیم کردی۔ کئی برسوں تک قرآن واحادیث اور معقولات ومنقولات کا مطالعہ کرتے رہے۔ وہاں سے نیشاپور کے نواح میں ہروان گئے، خواجہ شیخ عثمان ہروانی کی نگرانی میں ڈھائی سال تک راہ سلوک طے کرتے رہے۔ شیخ عثمان اس نوجوان صوفی سے بیحد متاثر ہوئے۔ اپنے خرقہ وخلافت سے سرفراز کیا۔ خواجہ بغداد کے سفر پر روانہ ہوئے اور سنجان میں سلسلہ کبرویہ کے موسس شیخ نجم الدین کبریٰ سے ملاقات کی۔ تھوڑے عرصہ تک ان کے ساتھ قیام کیا، پھر وہاں سے جل (گل) آئے اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے ہمراہ آٹھ ہفتوں تک قیام کیا۔ وہاں سے بغداد کے لیے روانہ ہوئے۔ اس بار ان کے ہم سفر سلسلہ سہروردیہ کے موسس شیخ شہاب الدین سہروردی، ان کے عم واستاد شیخ ضیاء الدین اور شیخ اوحادالدین تھے بغداد سے ہمدان آئے اور شیخ یوسف ہمدانی سے ملاقات کی۔ وہاں سے تبریز جاکر شیخ ابوسعید تبریزی سے ملاقات کی۔ پھر میہان اور خرقان گئے تاکہ شیخ ابوسعید بن ابی الخیر خرقانی کے مزار کی زیارت کرسکیں۔ وہاں سے استرآباد آئے اور شیخ نصیر الدین استرآبادی کے مزار پر حاضری دی۔ استرآباد سے ہرات گئے اور خواجہ عبداللہ کے روضہ کے قریب قیام کیا۔ کسی ایک جگہ مستقل قیام کی بجائے ہرات کے گرد ونواح میں گشت کرتے رہے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم ساتھ ہوگیا۔ خواجہ نے سب کو چھوڑا اور سبزوار آگئے۔ سبزوار کا شیعی امیر محمد یادگار حلقہ ادارت میں شامل ہوگیا۔ وہاں سے حصار شادمان آئے۔ محمد یادگار کو وہیں چھوڑا۔ اس دور کے نامو متکلم مولانا ضیاء الدین حکیم کو علم تصوف کا قائل کیا۔ وہاں سے بلخ آئے۔ پھر غزنی گئے، شمش العارفین شیخ عبدالواحد سے ملاقات کی جو شیخ نظام الدین ابوالمجید کے استاد ومرشد تھے۔ وہاں سے لاہور آئے اور شیخ علی ہجویری کے مزار پر چلہ کش ہوئے۔ پھر دہلی اور آخرش اجمیر میں اقامت گزیں ہوگئے۔

مذکورہ بالا کوائف سفر پر نظر ڈالی جائے۔ جن کی تفصیلات نہیں ملتی، تو خواجہ معین الدین چشتی کی

روحانی شخصیت کے اہم پہلوؤں کا تعارف ہوتا ہے۔ مثلاً انھوں نے اپنے دور کے بزرگ ترین صوفیہ سے ملاقاتیں کی تھیں۔ یہ ملاقاتیں محض رسمی نہیں ہو سکتیں۔ مقتدر ترین صوفیہ کی باہمی ملاقاتیں روحانی کسب واکتساب سے بڑھ کر مسائل ومباحث پر تبادلہ خیالات پر مبنی ہوتی ہوں گی۔ اتنے عرصے تک مسلسل سفر کرنے سے مختلف ومتضاد لوگوں سے سابقہ ہوا ہوگا، جس سے روحانی فکر نے کئی جہتیں حاصل کی ہوں گی۔ وسیع المشربی، انسانیت نوازی اور حق پرستی کے جدید معانی ومفاہیم سے ہم آہنگی ہوئی ہوگی لیکن افسوس ہے کہ ہمارے سوانح نگار کو شخصیت کے ان پہلوؤں سے دلچسپی نہیں ہوتی، بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کا غلبہ پیش کرنے کی دھن میں صوفیہ کو 'غازی میاں' بنادیتا ہے۔ حکمراں طبقہ تحصیل ووصول اور فتوحات کے نشہ میں سرشار نظر آتا ہے تو سوانح نگار اپنے جذبۂ تبلیغ کو صوفیہ پر مسلط کرکے ان کے پیغام ایمان وایقان کو جبریہ تبدیلی مذہب کی جدوجہد بنادیتا ہے، حالانکہ علماء اور صوفیہ کے تبلیغ دین میں بنیادی فرق یہی ہے کہ علماء وفقہاء دلائل سے قائل کرکے شرف بہ اسلام کرتے ہیں ان لوگوں کو جو تبدیلی مذہب نہیں کرتے صوفیہ ان کو بھی راہ سلوک میں ساتھ لے کر چلتے تھے تاکہ اس کے قلب وروح میں شمع ایمان روشن ہوسکے۔ خواجہ معین الدین چشتی کا طریقہ کار بھی یہی تھا کہ اپنے اعلیٰ ترین روحانی کردار سے قلب وروح کی گہرائیوں میں اترتے تھے۔ قیام اجمیر کے قلعہ کے دوران لوگ ان کے حسن کردار سے متاثر ہوکر سچے مسلمان ہوگئے۔ ایک بار کسی درویش ان سے سوال کیا، صحیح تقویٰ کی کیا شناخت ہے؟ خواجہ نے جواب دیا کہ شرعی امرونہی کا پابند ہونا۔ حکم خدا کی پابندی کرینا۔ ان باتوں سے پرہیز کرنا جن کی ممانعت ہے۔ طریقت کے نو اصول بیان کیے۔ اپنے شاگرد شیخ حمید الدین ناگوری کو حکم دیا کہ ان شرطوں پر قلم بند کردو تاکہ مسلمانوں کا وسیع حلقہ واقف ہوسکے۔ طریقت کے درج ذیل نو اصول ہیں، صلاً نورتن ہیں:

(۱) مال ودولت نہیں کمانا چاہئے۔

(۲) دوسروں سے قرض نہیں لینا چاہئے۔

(۳) دست سوال نہیں دراز کرنا چاہئے، خواہ سات دنوں کے فاقہ سے کیوں نہ ہو۔

(۴) افراط سے کھانا، دولت، غلہ، لباس وغیرہ مہیا ہوجائے تو بچا کر نہیں رکھنا چاہئے۔

(۵) کسی کو صدمہ نہیں پہنچانا چاہئے۔ اگر کسی سبب سے صدمہ پہنچ ہی جائے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہئے کہ اس کے دشمن کو راہ حق کی ہدایت کرے۔

(۶) کوئی کار خیر انجام پائے تو اسے اپنے پیر کی دعا یا رسول مقبول کی شفاعت یا اپنے رب کا کرم سمجھنا چاہئے۔

(۷) کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو اسے خود کو ذمہ دار ٹھہرانا چاہئے۔ گناہ سے پرہیز کرنا اور خدا سے خوف کھانا چاہئے۔

(۸) ان شرائط کی پابندی کے بعد دن میں روزہ اور رات عبادت میں بسر کرنا چاہئے۔

(۹) خاموش رہنا چاہئے، حتیٰ کہ بولنا لازمی ہوجائے۔ شریعت میں طول کلامی کی ممانعت کی ہے۔ انھیں الفاظ کا استعمال کرنا چاہئے جن سے اللہ تعالیٰ راضی وخوشنود ہوسکے۔

ان نو اصولوں کی آفاقیت عیاں ہے جن کو کردار سازی کے رہنما اصول کہا جا سکتا ہے۔ یہ نو اصول کسی بھی شخص کی بہتر زندگی کے رہنما اصول ہو سکتے ہیں، خواہ وہ مسلم ہو، غیر مسلم ہو، یا کسی مذہب کا پابند نہ ہو۔ خواجہ کے تصورات کا دیگر اہم محور عشق ہے، جس کے دو پہلو ہیں: معشوق اور عاشق عشق اپنی وسعت میں بحر بیکراں ہے۔ معشوق اپنے حسن و جمال میں آفتاب کی طرح ہے اور عاشق اپنے عجز و انکسار میں زمین کی ہے۔ بہترین عبادت فاقہ کشوں کو سیر و سیراب کرتا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی نے ستانوے سال کی عمر میں وفات پائی۔ اجمیر میں اسی جگہ دفن کیے گئے، جہاں زیادہ تر رہتے تھے۔ خواجہ حسین ناگوری نے روضہ تعمیر کرایا۔ محمود خلجی نے ۱۴۵۵ء میں بلند دروازہ بنوایا۔ سلطان مالوہ نے مسجد تعمیر کرائی، جس میں جہاں گیر اور اورنگ زیب نے توسیع کی۔ اکبر اعظم شہزادہ سلیم کی ولادت پر اظہار تشکر کے لیے پا پیادہ آگرہ سے اجمیر آیا۔ فروری ۱۵۷۰ء میں پہنچا۔ کافی مال و دولت نذر کی۔ اس سے وراثت کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ اکبر نے کافی غور و خوض اور تحقیق کے بعد شیخ محمود کو متولی مقرر کیا، جنھوں نے انتظامیہ کو چست و درست کر دیا۔ خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ تقرب الٰہی، معرفت حق، انسان دوستی، خلوص و محبت اور ایثار و قربانی کی اعلیٰ ترین مثال قرار دی جا سکتی ہے، جہاں لاکھوں کی تعداد میں ہر سال زائرین بلا امتیاز مذہب و ملت، صنف و سال اور رنگ و نسل، ہندوستان سے اور بیرون جات سے حاضر ہو کر آستان بوس ہوتے ہیں۔

شاہان مغلیہ کو صوفیہ سے ایسی دلی عقیدت تھی کہ بسا اوقات ان سے ملاقات میں آداب شاہی سے بے نیاز ہو جاتے، کسی عام حاجت مند کی طرح دامن طلب پھیلا دیتے۔ ان کو دربار میں طلب کرنے کی بجائے صوفیہ کے آستانوں پر خود حاضر ہوتے۔ بابر نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہو کر ہدایت کا خواستگاری کی تھی۔ انھوں نے ہدایت فرمائی کہ عدل پر قائم رہے۔ علماء کو دوست رکھے انھیں منصف مقرر کرے۔ اوامر و نواہی کی پابندی کرے و با جماعت نماز ادا کیا کرے۔ اکبر اعظم کی شیخ سلیم چشتی سے عقیدت مندی مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ شہزادہ سلیم کی ولادت پر اظہار تشکر کے لیے پا پیادہ آگرہ سے اجمیر گیا۔ راستہ بھر روپے اور اشرفیاں لٹاتا رہا۔ فروری ۱۵۷۰ میں اجمیر پہنچا۔ شیخ سلیم سے عقیدت میں شہزادے کا نام سلیم رکھا لیکن سوءِ ادب کا خیال سے نام لے کر نہیں پکارتا تھا بلکہ اسے 'شیخو بابا' کہتا تھا۔ شیخ سلیم کے جائے قیام کو مبارک قرار دے کر فتح پور سیکری میں دلکش شہر آباد کیا، جس کو تمام شہروں کا سرتاج بنا دیا۔ جہاں گیر نے تزک میں شیخ سلیم سے اکبر اعظم کی والہانہ عقیدت کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اکبر اعظم نے شیخ سلیم سے بہ اصرار ان کے زمانۂ وصال کے بارے میں دریافت کیا۔ شیخ سلیم نے کہا، جب شہزادہ تعلیم کی گئی باتوں کو یاد کر کے دہرانے لگے گا۔ اکبر اعظم نے تمام معلموں کو ہدایت کر دی کہ شہزادہ کو نثر و نظم کی کوئی ایسی چیز کی تعلیم نہیں دی جانا چاہیے، جسے یاد کیا جا سکے۔ ایک دن کسی نے شہزادے کو شعر یاد کرا دیا:

الٰہی غنچۂ امید بکشا   گلے از روضۂ جاوید بنما

شہزادے سے یہ شعر سننے کے چند دنوں بعد شیخ سلیم نے انتقال کیا۔ اورنگ زیب کی سنگلاخ بنیاد پرستی کی داستانیں عام ہیں لیکن اسے بھی صوفیہ سے بیحد عقیدت تھی۔ اورنگ زیب نے شاہ عبدالرحیم کو دربار میں مدعو کیا۔ انھوں نے جواب میں لکھ بھیجا: ''جس کا نام بادشاہ کے دفتر میں لکھ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے دفتر سے

اس کا نام کٹ جاتا ہے ---! اورنگ زیب ان کے خط کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ تنہائی میں اس خط کو بار بار پڑھتا اور روتا تھا۔[۳]

اوچہ کو تصوف کے اہم مراکز میں شمار کیا جاتا ہے۔ جو بھول پور (پاکستان میں پچاس کلومیٹر کے فاصلہ پر ستلج و چناب کے سنگم پر واقع ہے۔ قدیم میں سندھ کا پایہ تخت تھا لیکن روحانی تقدس مخدوم سید جلال الدین حسین بخاری جلال اعظم شیر شاہ (م: ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء) خلیفہ اجل شیخ بہاؤ الدین زکریا سہروردی کی بدولت حاصل ہوا۔ جو سادات نقوی میں تھے۔ امام علی نقی کے بیٹے جعفر تواب سے سلسلہ نسل وابستہ ہے: سید جلال الدین حسین بن علی بن جعفر بن محمد اول فتح بن محمود اصغر بن احمد ابو یوسف بن عبداللہ بن علی اصغر بن جعفر تواب بن امام علی نقی۔ جعفر تواب (م: ۲۷۱ھ/۸۸۴ء) لقب ہونے کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا تو جعفر کذاب کہلائے، جب توبہ کر لی تو جعفر تواب ہوئے۔ ان کے بیٹے کا نام علی اصغر (م: ۳۲۰ھ/۹۳۲ء) اور لقب علی الاشقر تھا کیونکہ ان کے بال سرخ تھے۔ بغداد میں سید النقبا تھے۔ ان کے بیٹے عبداللہ (م: ۳۶۳ھ/۹۷۳ء) کے فرزند سید محمد انجواد (م: ۴۲۲ھ/۱۰۳۰ء) خواجہ نظام الدین اولیاء کے جد ہیں۔ پہلے یہ خاندان بغداد میں تھا۔ بعد میں سید محمد (م: ۵۲۹ھ/۱۱۳۴ء) ترک وطن کر کے بخارا آئے۔ بخارا میں ہی سید جلال اعظم کے دادا سید جعفر بن سید محمد (م: ۵۷۵ھ / ۱۱۷۵ء) اور والد سید علی ابوالموید آسودہ ہیں۔ سید جلال اعظم کے مختلف القاب ہیں: منیر شاہ، میر سرخ، شریف اللہ، جلال اکبر، مخدود اعظم، عظیم اللہ، ابوالبرکات، ابومحمد، میر بزرگ وغیرہ۔ ان القاب سے تقدس و بزرگی اور مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سید جلال اعظم نے ۹۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ ان کے فرزند خلیفہ مخدوم سید احمد کبیر (م: ۷۱۴ھ/۱۳۱۴ء) علوم ظاہر و باطن میں کامل تھے۔ ان کے بھائی سید صدر الدین محمد غوث اور بھتیجے سید بہاؤ الدین حلیم بن سید علی سرمست کا شمار اہل کمال میں ہوتا تھا۔ ان کے مزارات اوچہ میں ہیں۔ اولاد برصغیر میں پھیلی ہوئی ہے۔ مخدوم سید احمد کبیر کے فرزندوں میں جہانیاں جہاں گشت اور سید صدر الدین راجو قتال تاریخ صوفیہ کی اہم شخصیتیں ہیں۔

ہندوستان میں سلسلۂ سہروردیہ کی ابتدا شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے خلفاء کی آمد سے ہوئی، جن کے مرشد شیخ ضیاء الدین ابو نجیب اور دادا پیر شیخ وجیہ الدین تھے، جو ہمدان اور زنجان کے درمیان واقع سہرورد کے باشندہ تھے اور اسی نسبت سے سہروردی کہلائے۔ لیکن ہندوستان میں سلسلۂ سہروردیہ کو رائج و مقبول کرنے میں شیخ بہاء الدین زکریا، شیخ جلال الدین تبریزی، قاضی حمید الدین ناگوری اور سید نور الدین مبارک غزنوی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ شیخ بہاء الدین زکریا (م: ۶۶۱ھ/۱۲۶۲ء) کے اجداد مسلم بن قاسم کے ہمراہ وارد ہند ہوئے تھے اور یہیں بس گئے۔ بہاء الدین زکریا کی ولادت کوٹ کرور (نزد ملتان) ہوئی تھی۔ انھوں نے بارہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کیا اور مزید تعلیم کے لیے خراسان گئے، وہاں بخارا گئے، جہاں حسن سیرت کی بنا پر 'ملک' (فرشتہ) کہے گئے۔ پھر حج و زیارات کے لیے مکہ و مدینہ گئے اور علم الحدیث میں مہارت حاصل کی۔ وہاں سے بغداد گئے اور بانی سلسلہ سہروردیہ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ حالانکہ یہ رفاقت محض سترہ دنوں تک محدود تھی لیکن شیخ شہاب الدین عمر اس نوجوان صوفی کو

خلعت خلافت سے سرفراز کردیا۔ وہاں سے نیشاپور ہوتے ہوئے ملتان واپس ہوئے۔ ملتان کے علماء وصوفیہ نے ان کا ملتان میں قیام پسند نہیں کیا، لیکن انھوں نے ملتان کو مستقر بنالیا۔ شیخ زکریا کے تعلقات ہم عصر چشتیہ صوفیہ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے انتہائی خوشگوار تھے۔ انھوں نے چشتیہ کی طرح مسلسل روزہ کی تلقین نہیں کی، البتہ سماع میں بھی کبھار شرکت کرتے تھے۔ چشتیوں کی طرح فقر و فاقہ کی بجائے دولت و حشمت کے ساتھ خانقاہی زندگی بسر کی۔ حتیٰ کہ موقع پڑنے پر امیر ملتان کی بھی مالی امداد کرتے تھے۔ موصوف سلطان التمش (۳۵-۱۲۱۰ء) کے حامیوں میں تھے بلکہ انھوں نے بھی مقامی قاضی کی شمولیت میں سلطان کو خط لکھ کر ملتان پر حملہ آور ہونے کی دعوت کی تھی۔ جب سلطان التمش نے ۱۲۲۸ء میں ملتان پر قبضہ کرلیا تو یہ تعلقات مزید استوار ہو گئے۔ شیخ جلال الدین تبریزی کے خلاف شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کی شکایت پر سلطان التمش نے مخصوص محضر (مجلسِ علماء وفقہاء) منعقد کی، تو اس کی صدارت شیخ بہاء الدین زکریا نے کی اور اس کے نتیجہ میں شیخ نجم الدین صغریٰ شیخ الاسلام کے عہدہ سے معزول ہوئے اور یہ خطاب وعہدہ بھی شیخ بہاءالدین زکریا کو ملا۔

شیخ بہاء الدین زکریا کے خلفاء نے، جس خوبی سے سلسلۂ سہروردیہ کو قائم ومقبول کیا، خود شیخ سہروردی کے خلفاء بھی نہ کر سکے۔ شیخ زکریا کے ایک مشہور ومعروف خلفاء میں سید جلال الدین بخاری معروف بہ جلال سرخ پوش (م: ۶۹۰ھ/۱۶۹۱ء)، شیخ حسن افغان (ناخواندہ تھے لیکن شیخ نظام الدین اولیاء کے ممدوح تھے۔) اور مشہور فارسی شاعر شیخ فخر الدین عراقی (م: ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء) وغیرہ تھے لیکن شیخ زکریا نے اپنے بیٹے شیخ صدر الدین عارف (م: ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء) کو اپنا جانشین بنایا۔ شیخ زکریا نے دولت کثیر ورثہ میں چھوڑی تھی۔ ان کے سات بیٹے تھے۔ تنہا صدر الدین عارف کے ترکہ میں سات لاکھ ٹکے تھے۔ انھوں نے اپنا حصہ راہ خدا میں دیدیا۔ شیخ صدر الدین عارف کو خوش نصیبی سے شیخ امیر حسن بن عالم بن ابی الحسن الحسینی (م: ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء) کی طرح کا عالم متبحر خلیفہ ملا، جن کی تصانیف میں نزہۃ الارواح، کنز الرموز، معرکۃ، طرب المجالس، زاد المسافرین، ہفت گنج وغیرہ مشہور ہیں۔ شیخ عارف کے مشہور خلیفہ شیخ احمد معشوق تھے جو شراب خواری ترک کرکے پیر طریقت بنے تھے۔ شیخ عارف کے بیٹے اور خلیفہ شیخ رکن الدین ابوالفتح (م: ۲۵-۱۳۲۴ء) تھے، جو سلطان علاء الدین خلجی کے دور (۱۳۱۶-۱۲۹۶ء) میں دو بار دہلی گئے۔ دونوں بار بادشاہ نے دس سات سات لاکھ ٹکے نذر کیے۔ دونوں بار خواجہ نظام الدین اولیاء سے ملاقات کی۔ دونوں ایک دوسرے کے معترف ومداح تھے۔ شیخ ابوالفتح کی خلافت وجانشنی کے لیے ان کے بھتیجے شیخ اسمٰعیل اور پوتے شیخ حد کے درمیان رسہ کشی ہوئی، جس کا مقدمہ سلطان محمد بن تغلق (۵۱-۱۳۲۵ء) کے دربار تک گیا، شیخ حد جانشین مقرر ہوئے لیکن بعد میں مغلوں سے ساز باز کرنے کے جرم میں موت کی سزا ملی۔ اس طرح ملتان کی خانقاہ تباہ وبرباد ہوگئی لیکن ملک کے دیگر علاقوں میں شیخ بہاء الدین زکریا کے خلفاء کی خانقاہیں پھلتی پھولتی رہیں۔

قاضی حمید الدین ناگوری (م: ۶۷۴ھ/۱۲۷۴ء) نے دہلی میں سلسلۂ سہروردیہ قائم کیا۔ ان کا اصلی نام محمد بن عطا تھا۔ ان کے والد سلطان محمد غوری کے عہد میں بخارا سے آئے تھے۔ حمید الدین کی ولادت دہلی

میں پوئی۔ مروجہ علوم متداولہ حاصل کرنے کے بعد حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ بخارا میں شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملاقات ہوگئی۔ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔ بغداد میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ملاقات ہوگئی جو تمام عمر بہترین رفاقت کی شکل میں قائم رہی۔ دونوں بزرگوں میں ذوقِ سماع مشترک تھا۔ سلطان التمش کے صدرِ جہاں محمد صادق اور دیگر علماء نے سلطان التمش کو ورغلا کے محضر منعقد کرائی لیکن ناکام رہے۔

قاضی حمید الدین ناگوری کو اپنے علم و فضل کی بنا پر شہرت حاصل ہوئی۔ ان کو سہروردیہ کے پہلو بہ پہلو چشتیہ صوفیہ بھی یکساں اہمیت حاصل ہے۔ خواجہ اجمیری کی حیات میں ہی شاگردِ رشید کی حیثیت سے امتیاز حاصل تھا۔ ایک بار خواجہ نے اپنے تمام شاگردوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے دعا کرو۔ سب نے بہت کچھ مانگا۔ شیخ حمید الدین نے دستِ سوال دراز نہ کیا۔ خواجہ نے پوچھا تم نے کیوں نہیں مانگا۔ شیخ نے جواب دیا، میں نے خود کو راہِ خدا میں دیدیا ہے، اب بچا ہی کیا ہے، جس کے لیے مانگوں؟ خواجہ نے خوش ہوکر 'سلطان التارکین' کا لقب عطا کیا، جو نام کا جزو بن گیا۔ حالانکہ ان کے مسلک میں فتوت نقد قبول کرنے کی ممانعت نہیں تھی لیکن شیخ ناگوری نے اپنا رویہ مختلف رکھا۔ ناگور کے قصبہ سوالی میں ان کے پاس تھوڑی سی مزروعہ زمین تھی اور ایک گائے تھی، اسی پر مدارِ زیست تھا۔ ان کا تصور تھا کہ انسان کو کسی ذی روح کو نقصان پہنچانے کا حق نہیں ہے۔ گوشت خوری پسند نہ تھی۔ اپنے مریدوں کو گوشت خوری ترک کرکے سبزیوں کو غذا کرنے پر زور دیتے تھے۔ اپنے انتقال سے قبل وصیت کردی کہ ایصالِ ثواب میں ایسا کھانا تقسیم کیا جائے، جس میں گوشت نہ ہو۔ حاضرین میں کسی نے ازرہِ تفنن کہا کہ اگر گوشت خریدا جاچکا ہوتو؟ مسکرا کے جواب دیا، اس صورت میں قصاب ایک اور جانور ذبح کرے گا تاکہ اپنے دوسرے گاہکوں کو گوشت دے سکے، جو مجھے گوارہ نہیں۔ تمام شرعی مسائل و مباحث پر عالمانہ دست رس رکھتے تھے۔ جہالت کو سب سے بڑا گناہ قرار دیتے تھے۔ ان کا قول ہے کہ احکامِ شریعۃ سے واقف ہونا اور مرتکب گناہ ہونا، ایک گناہ ہے لیکن احکامِ شریعۃ سے ناواقف ہونا اور مرتکب گناہ ہونا، دو گناہ ہیں۔ قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ پر خاص زور دیتے تھے: فاینما تولوا فثم وجه اللہ (تم جس جگہ بھی قبلہ کا رخ کرلوگے بس وہیں خدا موجود ہے) اس کی تفسیر میں کہتے تھے کہ انسان کو خدا تک پہنچنے کے لیے علائق دنیا میں ہر چیز ترک کردینا چاہئے اور بس خدا سے لولگانا چاہئے۔ جہاں جائے، اس کا چہرہ خدا کی جانب ہو، جو کچھ کہے خدا سے کہے، جو کچھ مانگے، خدا سے مانگے۔ خدا انسان سے دور نہیں ہے، انسان خدا سے دور ہے۔ عرفانِ ذات سے حق شناسی کا دروازہ کھلتا ہے۔ یہ دروازہ کوئی اور نہیں کھول سکتا، انسان خود کھولتا ہے، لیکن وہ جسے اللہ تعالیٰ توفیق عطا کرے۔ جنت اور دوزخ کا مدار انسان کے اپنے کردار و عمل پر ہے۔ راہِ خدا کے مسافروں کی اپنی راہ نہیں ہوتی۔ ان کے خصوصی تعلقات خواجہ بختیار کاکی سے قائم رہے جن کی محفلِ سماع میں بھی شامل ہوتے تھے۔

قاضی حمید الدین ناگوری کے چار خلفا ہوئے۔ چاروں پس ماندہ طبقہ کے تھے۔ شیخ احمد نہروانی جولاہے تھے، شیخ شاہی لُوتیب، نائی تھے جن سے خواجہ نظام الدین اولیاء دعا کے طالب ہوئے۔ شیخ عین الدین قصاب تھے اور خواجہ محمد میاں دُز، درزی تھے۔ قاضی حمید الدین ناگوری کے پوتے اور خلیفہ شیخ فرید

الدین محمود ناگوری (م ـ ۱۳۳۳ء) کا لقب 'چاک پرّ ان' تھا۔ سلطان محمد بن تغلق (۵۱ـ۱۳۲۵ء) کے دربار میں اہم مقام رکھتے تھے۔ ناگوری مرکز روحانی کا ذکر خواجہ حسین ناگوری کے ذکر کے بغیر نامکمل رہ جائے گا جو شیخ حمید الدین کے خاندان اور شیخ فرید الدین کے صاحبزادے شیخ کبیر الدین کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ انھوں نے مقامی کاشکاروں کی سی زندگی بسر کی اور جو کچھ حاصل ہوا خواجہ معین الدین چشتی اور قاضی حمید الدین ناگوری کے مزارات کی تعمیر میں صرف کر دیا۔

سید نور الدین مبارک غزنوی (م: ۳۵ـ۱۲۳۴ء) سلسلۂ سہروردیہ شہرت یافتہ صوفی تھے۔ سلطان التمش سے 'شیخ الاسلام' کا خطاب حاصل تھا، اور دہلی میں 'میر دہلی' کہلاتے تھے۔ ۱۰؎ اسلام ملوکیت کے جتنا خلاف ہو، یہ ملوکیت کے زبردست حامی تھے۔ سلطان کو 'دین پناہ' مانتے تھے۔ اس کے اصول بھی وضع کیے تھے جن کی پیروی تمام مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دئے تھے۔ اپنی سنگلاخ بنیاد پرستی میں وہ غیر سنی مسلمانوں کو مسلمان نہیں مانتے تھے۔ ان کے اصول درج ذیل ہیں:

(۱) بادشاہ کو شریعت نافذ کرنا چاہیے۔ کفر و شرک اور بت پرستی کو نابود کر دینا چاہیے۔ اگر کفر کو نابود کرنا ممکن نہ ہو تو ہندوؤں اور دیگر بت پرستوں اور مشرکوں کی توہین کرنا چاہیے۔ ان کو خاص کر برہمنوں کوئی عہدہ و ذمہ داری نہیں سپرد کرنا چاہیے۔

(۲) گناہ، آوارگی و شراب خوری اور طوائفیت کی علانیہ اجازت نہیں ہونا چاہیے۔ اگر طوائفیں تائب نہیں ہوتیں تو چھپ کر پیشہ کریں۔ طوائفیت کو یکسر ممنوع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ بہ صورت دیگر آوارہ گرد مسلم عورتوں کی عصمت دری کر سکتے ہیں۔

(۳) نفوذ شریعت کی خدمت ماہرین شریعت و طریقت کے سپرد ہونا چاہیے۔ فلسفہ کو ممنوع اور تعلیم فلسفہ کو جرم قرار دینا چاہیے۔ اہل تشیع، جو گمراہ اور اہل تسنن کے ازلی دشمن ہیں ان کی توہین کرنا چاہیے اور انہیں کوئی سرکاری عہدہ نہیں دیا جانا چاہیے۔

(۴) عدل کو بالادستی حاصل ہونا چاہیے، جو اسی صورت میں ممکن ہے کہ بادشاہ حکومت کے ذریعہ جبر کے خوف کو ختم کر سکے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی کے اہم خلفاے ہند میں شیخ جلال الدین تبریزی (م: ۱۰۵۴ھ /۱۶۴۴ء) نے بنگال کو اپنا مستقر بنایا۔ انھوں نے کئی علمی و روحانی مراکز پر درس حاصل کیے تھے۔ وہ اور ان کے والد شیخ ابوسعید تبریزی سے بیعت تھے لیکن تحصیل علم کے لیے بغداد پہنچے اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملاقات ہوئی تو انہیں کے ہو کر رہ گئے۔ سات برسوں تک کسی خدمت گار سے بڑھ کر خدمت کی۔ ان کا کھانا گرم رکھنے کی غرض سے انگیٹھی سر پر اٹھائے سات برسوں تک سفر و حضر میں پیر کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ شیخ جلال الدین نے شیخ بہاء الدین زکریا کے ساتھ بغداد سے نیشاپور کا سفر کیا تھا۔ دونوں صوفیہ متضاد الطبع تھے۔ راستہ میں ہر منزل پر شیخ بہاء الدین مراقبہ و عبادت کرتے لیکن شیخ جلال الدین مقامی درویشوں سے ملاقات میں زیادہ دلچسپی لیتے۔ ایک بار مشہور صوفی شاعر شیخ فرید الدین محمد عطار نیشاپوری (م: ۶۲۷ھ/۱۲۲۹ء) سے ملاقات کر کے لوٹے تو اتنے مبہوت تھے کہ شیخ بہاء الدین سے کہہ دیا کہ اب تو شیخ سہروردی کی شبیہ بھی مراقبہ

میں نہیں اٹھرلی۔ شیخ بہاء الدین انتہائی خفا ہوئے اور رفاقت ترک کردی۔ شیخ جلال الدین تنہا ملتان وارد ہوئے، لیکن جلد ہی دہلی آگئے۔ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ مخالف ہوگئے۔ کردار کشی پر اتر آئے۔ محضر منعقد ہوئی، جس کے صدر نشین ان کے مخالف شیخ بہاء الدین زکریا ہوئے، لیکن انھوں نے انصاف کا ہاتھ بالا رکھا۔ شیخ نجم الدین صغریٰ خطاب شیخ الاسلام سے معزول ہوئے۔ انھوں نے بھاگ کر بدایوں میں پناہ لی۔ شیخ جلال الدین بھی بدایوں ہوتے ہوئے بنگال پہنچے اور پہلے لکھنوتی میں خانقاہ قائم کی، پھر وہاں سے دیوامحل (دیوتلہ) سوئے، جو شمالی بنگال میں پنڈوا کے قریب واقع ہے۔ وہاں خانقاہ و مدرسہ قائم کیا۔ بیحد مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہندو و مسلم یکساں طور پر عقیدت رکھتے تھے۔ دوتلہ تبرزیز آباد ہوگیا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کے دیگر خلفائے ہند میں مولانا مجد دین جنجی، شیخ ضیاء الدین رومی، شاہ ترکمان ہیں۔ سلسلہ سہروردیہ کی خانقاہیں بھی سلسلہ چشتیہ کی طرح سراسر ہند میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں ان کے موسسین شیخ بہاء الدین زکریا اور شیخ جلال الدین تبریزی ہیں۔ شیخ بہاء الدین زکریا کی بدولت سلسلہ سہروردیہ اوچ و ملتان سے گجرات، پنجاب، کشمیر اور دہلی تک پھیلا۔ شیخ جلال الدین تبریزی نے بنگال کو مرکز قرار دے کر سلسلہ سہروردیہ کی خانقاہیں پورے بہار اور مشرقی اتر پردیش تک پھیلا دیں۔

سلسلہ چشتیہ کے اہم ترین صوفیہ اور ارشد تلامذہ خواجہ اجمیری میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م: ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء) میں تھے لیکن خواجہ اجمیری کی حیات میں ہی رحلت ہوجانے کی بنا پر خلیفہ و جانشین، ہو سکے ورنہ انھیں کا سب سے زیادہ استحقاق تھا۔ ان کی ولادت اوش (فرغانہ) میں ہوئی تھی، جو حلاجی صوفیوں کا مرکز تھا۔ اٹھارہ ماہ کا سن تھا کہ ان کے والد کمال الدین احمد موسیٰ کا انتقال ہوگیا۔ ماں نے تربیت کی۔ اپنے پڑوسی مولوی کے پاس قرآن پڑھنے کے لیے بٹھانا چاہا۔ ملازمہ کے ذریعہ قطب الدین کو پڑوسی مولوی کے مدرسے بھیجا لیکن یہ شیخ ابا حفص کے مدرسے میں پہنچ گئے۔ روایت ہے کہ راستہ میں خواجہ خضر ملے اور انھوں نے شیخ ابوحفص کے مدرسے میں پہنچا دیا۔ (صوفیہ کے ذکر مین اکثر خواجہ خضر وارد ہوتے رہتے ہیں!) ان سے قرآنی تعلیم مکمل کر کے بغداد گئے۔ مسجد میں خواجہ معین الدین چشتی سے ملاقات ہوئی اور ان کے گردیدہ ہو گئے۔ حالانکہ اسی شہر میں شیخ عبدالقادر بھی موجود تھے اور ان سے شرف ملاقات بھی حاصل کیا تھا۔ بغداد سے خراسان ہوتے ہوئے آئے اور شیخ بہاء الدین زکریا سے ملاقات کی جو دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ ۶۱۸ھ/ ۱۲۲۱ء کے اواخر میں دہلی وارد ہوئے۔ سلطان التمش نے کھلے دل سے استقبال کیا۔ شیخ الاسلام کا عہدہ پیش کیا لیکن انھوں نے معذرت کرلی۔ بعد میں شیخ الاسلام کا عہدہ شیخ نجم الدین صغریٰ کو تفویض ہوا۔ شیخ الاسلام کے عہدہ نے شیخ نجم الدین کے مزاج میں رعونت بھردی۔ ابتداً انھوں نے خواجہ قطب الدین میں ہم آہنگی رکھی، پھر رقابت شروع کردی۔ خاص طور پر مسئلہ سماع پر اختلافات اتنے بڑھے کہ خود خواجہ اجمیری کو بیچ بچاؤ کے لیے دہلی آنا پڑا۔ تمام دہلی دہلی مع مشائخ دست بوسی کے لیے حاضر ہوئے لیکن شیخ نجم الدین صغریٰ نہ آئے۔ خواجہ اجمیری بہ نفسِ نفیس شیخ الاسلام شیخ نجم الدین صغریٰ کے دولت خانہ پر تشریف لے گئے لیکن وہاں بھی اغماض و بے توجہی کا سامنا کرنا پڑا۔ مجبوراً خواجہ اجمیری کو فیصلہ کرنا پڑا کہ خواجہ قطب الدین دہلی سے ہٹا کر اجمیر میں اپنے پاس رکھیں۔ ان کو لے کر اجمیر کے لیے واپس ہونے لگے تو عقیدتمندوں کا ہجوم ٹوٹ پڑا۔ لوگ

گرد راہ کو آنکھوں میں لگانے لگے۔ سلطان التمش بھی ان عقیدت مندوں میں شامل تھا۔ اہل دہلی مع مشائخ عظام کے اصرار مجبور ہو کر خواجہ اجمیری نے انھیں دہلی میں ہی ہدایت کے لیے چھوڑ دیا۔[۸۳] خواجہ بختیار کاکی تمام عمر دہلی میں ہی رہے۔ ان کی بدولت دہلی چشتیہ صوفیہ کا مرکز بن گیا۔ خواجہ بختیار کاکی اپنی پوری زندگی الفقر و فخری کے اصول پر کاربند رہے۔ کاکی، (روٹی والے) لقب کا سبب یہ ہے کہ روٹیاں ملنا بھی اللہ پہ توکل تھا۔[۵۹] سماع سے بیحد شغف تھا۔ ایک بار قوال نے مشہور صوفی شیخ احمد جامی (م:۵۳۶ھ/۱۱۴۱ء) کا ایک شعر پیش کیا:

کشت گانِ خنجر تسلیم را　　　ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست

خواجہ بختیار کاکی پر وجد طاری ہو گیا۔ اسی عالم میں گھر لائے گئے۔ جب تک زندہ رہے۔ یہی شعر سنتے رہے تا اینکہ اپنی جان ہی جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ ان کا روضہ مہرولی (دہلی) میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ ان کے شاگردوں میں شیخ بدرالدین کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔

شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر معروف بہ بابا فرید (م:۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء) شیخ معین الدین چشتی کے بعد ان کے خلیفہ و جانشین ہوئے۔ شیخ فریدالدین مسعود کے بزرگ خواجہ قطب الدین گ بارھویں صدی میں کابل سے ہجرت کر کے پنجاب میں آباد ہوئے۔ ان کے والد قاضی شعیب غزنوی حکمرانوں کی جانب سے کھتول کے قاضی تھے، جو ملتان میں مہران اور اجودھن کے درمیان واقع ہے۔ ان کی والدہ عبادات و روحانیت کی دلدادہ تھیں جن کی تربیت نے تصوف کی طرف مائل کیا۔ ملتان میں ہی مولانا منہاج الدین ترمذیؒ کے مدرسہ میں منقولات و معقولات کی درسیات کے دوران خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ملاقات ہوگئی۔ ان کے حلقہ ادارت میں شامل ہو کر بیعت کر لی۔ پھر قندھار جا کر مزید تعلیم حاصل کی اور دہلی واپس آ کر خواجہ بختیار کاکی کے جماعت خانہ کے اہم رکن بن گئے۔ وہیں جماعت خانہ کے نزدیک ایک حجرہ میں رہنے لگے۔ خواجہ اجمیری دہلی تشریف لائے تو بابا فرید کے زہد و تقویٰ سے اتنے خوش ہوئے کہ اپنے شاگردوں کے ہمراہ اپنی مخصوص عبادات میں شامل کر لیا۔ خلوت گزینی مزاج میں شامل تھی، اس لیے جب دہلی میں غیر معمولی مقبولیت راہ سلوک میں مخل ہونے لگی تو ہانسی (ضلع حصار) چلے گئے۔ پھر وہاں سے اس وقت لوٹے کہ خواجہ بختیار کاکی وفات پا چکے تھے۔ خواجہ حمیدالدین ناگوری نے خواجہ بختیار کاکی کے متبرکات، خرقہ وغیرہ حسب وصیت بابا فرید کے سپرد کر دیے۔ دہلی سے ہانسی واپس ہوتے ہوئے اجودھن، پاک پتن ضلع ساہیوال (پاکستان) آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بابا فرید کے قیام اجودھن میں رقابتوں اور سیاسی ریشہ دوانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اجودھن کے قاضی اور دیگر اراکین حکومت نے ان کے خلاف فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن جب علماء و فقہاء کو معلوم ہوا کہ یہ فتویٰ بابا فرید کے خلاف لیا جا رہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر ان کو شہید کر دینے کی سازش ہوئی۔ الغ خان اعظم غیاث الدین بلبن (۸۷-۱۲۶۶ء) نے سلطان ناصرالدین محمود (۶۶-۱۲۴۶ء) کو بے دخل کر کے سلطنت دہلی پر قبضہ کیا تھا۔ بابا فرید کو سلطان ناصر الدین کا مربی قرار دے کر بلبن ان کا دشمن بن گیا۔ اس کا ابن عم شیر خان گورنر ملتان تھا، اس نے پابندی عاید کر دی کہ باب فرید کو عوام سے فتوحات نہ مل سکے۔

بابا فرید کی زندگی زہد و تقویٰ، عبادت اور خدمت خلق سے عبارت تھی۔ فقر و فاقہ معمول میں تھا۔ ایک بار مسلسل روزہ رکھے۔ افطار کے لیے کچھ میسر نہ تھا۔ چند سنگ ریزے منہ میں ڈال لیے، سنگ ریزے بھی دانہ نبات کی طرح شیریں لگے، 'گنج شکر' لقب ہوگیا۔ مٹی کا ایک مکان جماعت خانہ کے نام سے بنایا تھا، جس میں لوگوں کی ضیافت و مہمان داری بھی ہوتی اور ذکر خدا بھی۔ مسلمان صوفیہ اور قلندر بھی آتے اور ہندو یوگی اور سادھو سنت بھی۔ مسائل و مباحث پر کھل کر بحثیں ہوتیں۔ ان میں ناتھ یوگیوں سے مباحثوں کا ذکر خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات میں موجود ہے۔ امیر خسرو نے بابا فرید کے پانسو دوہے مرتب کیے ہیں، جن میں بعض دوہوں کو سکھوں کی مقدس کتاب 'گرو گرنتھ صاحب' میں شامل کیا گیا ہے۔ اس سے بابا فرید کے وسیع المشربی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بابا فرید اپنے مریدوں سے بیعت لیتے ہوئے کہتے تھے۔۔۔ تم نے بیعت کی اس ضعیف کے ہاتھ پر، اس کے شیخ اور شیخ کے مشائخ کے ہاتھوں پر اور حضرت علی مرتضیٰ کے ہاتھ پر اور حضرت پیغمبر صلعم کے دست مبارک پر اور اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ اپنے ہاتھ، پاؤں اور آنکھوں کی حفاظت کروگے اور شریعت کی راہ اور طریقہ پر ثابت قدم رہوگے۔ بابا فرید کے خلفاء کی تعداد کثیر تھی، جن میں 'خلافت اولی' شیخ نظام الدین اولیا کو حاصل ہوئی۔ 'خلافت اولی' کو اصطلاح صوفیہ میں 'خلافت رحمانی' کہتے ہیں۔ دوسرا روحانی سلسلہ شیخ مخدوم صابر کلیری سے شروع ہوا۔ ان دونوں سلاسل کی خانقاہیں سراسر ہند میں پھیلی ہوئی ہیں۔

خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی (م: ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) چودھویں صدی کے اہم ترین صوفیہ میں تھے، جو مختلف الابعاد شخصیت کے حامل تھے۔ عارف کامل، انتہائی متقی و عبادت گذار، عالم متبحر، مفسر و محدث، فقیہ و معقولی اور ادیب و شاعر تھے۔ دہلی میں ان پر علماء و فقہاء، صوفیہ و درویش، امراء و روساء اور عوام الناس پروانہ وار نثار رہتے تھے۔ ان کے اجداد بخارا سے آکر بدایوں میں آباد ہو گئے تھے۔ وہیں ان کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی زندگی عسرت و ناداری میں گذری۔ ذوق علم دہلی کھینچ لایا۔ پھر اجودھن گئے۔ بابا فرید نے ہمت افزائی کی اور راہ سلوک کی تعلیم دی کہ روزہ سے آدھی راہ سلوک طے ہوتی ہے اور باقی آدھی راہ عبادات و زیارات سے۔ دوبارہ اجودھن گئے تو بابا فرید سے قرآن و احادیث اور دیگر اہم کتابیں پڑھیں۔ انھوں نے اپنا خلافت نامہ عطا کیا اور حکم دیا کہ دہلی کی واپسی میں اسے ہانسی (حصار) میں مولانا جلال الدین اور دہلی میں قاضی منتخب الدین کو دکھا دینا۔ رخصت کے وقت بابا فرید نے فرمایا۔۔۔ تم ایک تناور درخت بنوگے جس کے سایہ میں انسانوں کو عافیت ملے گی۔ خدمت سے اپنی طاقت میں اضافہ کرو۔ میں اپنی تمام چیزیں تمھارے سپرد کر رہا ہوں کیونکہ تم میری وفات کے وقت موجود نہیں ہوگے۔ خواجہ نظام الدین نے دہلی آکر فیض عام کا دروازہ کھول دیا۔ ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت کا عام دروازہ کھول رکھا تھا۔ گنہگاروں کو خرقہ پہناتے، ان سے توبہ کراتے، اپنے مریدوں میں قبول کرتے تھے اور خاص و عام، غریب و دولت مند، بادشاہ و فقیر، عالم و جاہل، شریف و رذیل، شہری و دیہاتی، نمازی و مجاہد، آزاد و غلام سب کو طاقیہ، توبہ اور پاکی کی تعلیم دیتے تھے۔۴۲

سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۶-۱۳۱۶ء) خواجہ نظام الدین اولیاء کے عقیدت مندوں میں تھا۔

جاگیر عطا کرنا چاہتا تھا لیکن انھوں نے قبول نہ کیا۔ پھر قطب الدین مبارک شاہ (۲۰-۱۳۱۶ء) نے سلطنت پر قبضہ کر لیا، تو ولی عہد خضر خان کا مربی و مرشد ہونے کی بنا پر خواجہ محبوب الٰہی کا دشمن ہو گیا جس کو اسی کے معتمد خاص خسرو خان برؔور نے قتل کر دیا، پھر غیاث الدین تغلق (۲۵-۱۳۲۰) تخت دہلی پر متمکن ہوا۔ اس کے دل میں بھی خواجہ کی جانب سے خلش رہی، جو تا حیات قائم رہی۔۹۶ خواجہ کی غیر معمولی مقبولیت سے بعض صوفیہ اور علماء و فقہا بھی کدر رکھتے تھے۔ انھوں نے سلطان کی خفگی کا فائدہ اٹھا کر محضر منعقد کی، جس میں مسئلہ سماع کو بنیاد بنایا۔ سلطان خود حکم بنا لیکن خواجہ محبوب الٰہی کی مقبولیت عام و خاص کی بنا پر خلاف فیصلہ صادر کرنے کی جرأت نہ کر سکا حالانکہ اس کے دل میں خواجہ محبوبِ الٰہی کی جانب کدتھی۔ خواجہ محبوبِ الٰہی کا جماعت خانہ ہو یا لنگر، ہر شخص کے لیے یکساں کھلا رہتا ہے۔ ہندو مسلم کی تفریق نہیں تھی۔ خواجہ کے محبوب مریدین میں طوطی ہند امیر خسرو کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ خواجہ محبوب الٰہی کے خلفاء کی تعداد کثیر ہے، جن سے سلسلہ چشتیہ نظامیہ سر اسر ہند میں پھیلا۔ ان میں شیخ محی الدین کاشانی، مولانا وجیہہ الدین یوسف کلاکھیڑی، مولانا شمس الدین بن یحییٰ، شیخ قطب الدین منور ہانسوی، شیخ علاء الدین نیلی، مولانا فخر الدین زرادی، مولانا برہان الدین غریب ہانسوی شیز زرک بدر الدین مانک پوری، قاضی جلال الدین دولت آبادی، سید یوسف دولت آبادی اور شیخ اخی سراج الدین عثمان، جنھوں نے بنگال میں سلسلہ چشتیہ کی خانقاہ قائم کی۔ لیکن۔ خواجہ محبوب الٰہی کی خلافت رحمانی شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کو حاصل ہوئی۔

شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (م: ۷۵۷ھ/۱۳۵۵ء) کا لقب 'قطبِ ارشاد' بھی ہے۔ 'چراغ دہلی' کہلانے کا سبب یہ تھا کہ شیخ عبداللہ یافعی نے دورانِ طوافِ کعبہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے دریافت کیا تھا، ان دنوں دہلی میں کون بزرگ ہیں؟ انھوں نے جواب دیا، اس زمانہ میں شیخ نصیر الدین محمود سے دہلی کا چراغ روشن ہے۔ اسی دن سے 'چراغِ دہلی' مشہور ہو گئے۔ شیخ نصیر الدین محمود کے جد شیخ عبداللطیف یزدی خراسان سے لاہور آئے تھے۔ والد شیخ یحییٰ اودھی صوفی منش بزرگ تھے۔ شیخ نصیر الدین محمود نے ۲۵ سال کی عمر علوم مروجہ کی تعلیم حاصل کی۔ ۴۰ سال کی عمر میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے دامنِ عاطفت میں آئے، صدق ارادت سے وابستہ ہو گئے۔ سلطان فیروز شاہ کو ان سے خصوصی عقیدت تھی۔ اس نے ان کی زندگی میں ہی مقبرہ بنوا دیا تھا۔ اسی میں آسودہ ہیں۔ ان کے دور سے دہلی کی خانقاہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، جس کو ہر دور میں کسی نہ کسی اہم صوفی کی سربراہی حاصل رہی ہے۔ ان میں خواجہ حسن نظامی (م: ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۵ء) کو بیسویں صدی کے صوفیہ میں خصوصی شہرت حاصل ہوئی جو علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں بھی ممتاز تھے۔ اردو کے صاحب طرز انشا پرداز تھے، متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں۔ ان کے صاحبزادے خلیفہ و جانشیں خواجہ حسن ثانی نظامی اپنے مرشد کے نقش قدم پر گامزن ہیں۔

بابا فرید کے دوسرے اہم خلیفہ، جن سے سلسلہ چشتیہ صابریہ جاری ہوا، شیخ مخدوم علاء الدین علی بن احمد صابر کلیری (م: ۶۷۰ھ/۱۲۷۱ء) ہیں۔ جو اپنے دور میں خدا رسیدہ بزرگ، صاحب کشف و کرامات اور زاہد و متقی کی حیثیت سے مقبول خاص و عام تھے۔ ان کا مزار رڑکی (اتر پردیش) میں مرجع عقیدت ہے۔ پہلے لوگ ان کے مزار سے واقف نہ تھے۔ عہد شاہ جہانی (۶۸-۱۶۲۸ء) میں تحقیق کے بعد معلوم ہو سکا۔ شیخ مخدوم

صابری کلیری بابا فرید کے بھتیجے کہے جاتے ہیں۔ان کے خلافت نامہ کو شیخ جمال الدین نے چاک کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔۷۹ ان کے سلسلہ کو شیخ احمد عبدالحق کی بدولت اہمیت حاصل ہوئی۔

خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (م: ۷۵۸ھ/۱۳۵۶ء) کے شاگردوں میں سید محمد بن جعفر المکی کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ان کے والد امیر جعفر المکی کو سلطان محمد بن تغلق کے دور (۵۱-۱۳۲۵ء) میں امیر کبیر اور مقطع کا عہدہ حاصل تھا۔سید حسینی نے غزنی،خراسان،فلسطین،دمشق،عراق،مکہ مدینہ،مصر اور مغربی ممالک کا دورہ کر کے ۳۸۰ نامور صوفیہ سے ملاقاتیں کی تھیں۔شیخ عبدالحق نے سید محمد بن جعفر المکی کا شمار خواجہ نصیر الدین محمود کا 'جلیل القدر خلفاء ''منفرد اولیاء' عالی مقام توحید و تفرید' میں کیا ہے۔لیکن ان کی تصانیف میں جن عقائد کا اظہار کیا گیا ہے،ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانوں کی کثرت تعداد کی مانند راہ سلوک کی بھی کثیر تعداد ہے۔لیکن ان میں تین راہیں معتبر ہیں۔اولاً یہ کہ عام شریعت کی ظاہری پابندی کی جائے۔یہ عوام کی راہ ہے،جس میں منزل مقصود تک پہنچنا دشوار ہے۔ثانیاً یہ کہ تقویٰ و ریاضت اختیار کرنا۔یہ داخلیت کی راہ ہے،جو مقدس بزرگوں کے لیے مخصوص ہے۔ثالثاً یہ کہ لاہوت شناسی حاصل ہو جائے۔یہ عارف کامل کی منزل ہے۔ اس تیسری منزل تک پہنچنے کی راہ میں نو منزلیں ہیں توبہ،زہد،توکل،قناعت،عزلت گزینی،ذکر الی اللہ،توجہ باللہ،مرتبہ اور راضی بالرضا سید حسینی کے نزدیک بایزید بسطامی یا حلاج نے خود نعرہ نہیں دیا تھا،بلکہ ان کے پردے میں خدا بول رہا تھا۔ومن دقو،کے رشتہ کی پہچان نہ ہونے کی بنا پر غلط فہمی ہوئی۔سید حسینی کلمہ پڑھ لینے کو اہمیت نہیں دیتے۔ان کے نزدیک تبدیل مذہب کے پانچ اسباب ہوتے ہیں۔موت کا خوف اہل خاندان کے غلام بنائے جانے کا خوف،مسلمانوں کی تبلیغ،انعام و اکرام کی لالچ،آبائی مذہب مین تعصب و تنگ نظریو مسلم کلمہ پڑھ کر دنیا حاصل کر لیتا ہے،قرآن کا ارشاد ہے: اللہ ولی الذین امنوا یخرجھم من الظلمت الی النور (اللہ صاحبان ایمان کا ولی ہے۔وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔) نام نہاد علمائے دین کی طرح اسلام کی تاویل نہیں کرنا چاہئے۔اسلام مذہبی اجارہ داری کے خلاف ہے۔

سلطان محمد تغلق نے ۷۲۸ھ/۱۳۲۷ء میں دولت آباد کو ہندوستان کا پایہ تخت بنایا تو صوفیہ بھی جبراً لائے گئے۔جن میں شیخ برہان الدین غریب،سید یوسف حسینی راجو قتال،میر حسن سجزی،سید زین العابدین وغیرہ شامل تھے۔ان میں اکثر صوفیہ لوٹ کر دوبارہ دہلی نہیں گئے اور خلد آباد میں ہی بس گئے۔ان میں معاصرین سید نصیر الدین کھڑک پھوڑا،پیر پالک،پیر میٹھے اور پیر جمنا کے نام مقامی ثقافتی اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں۔شیخ برہان الدین غریب کے خلفاء میں شاہ کوچک ولی دائم (م: ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء) اہم ہیں لیکن ان سے قبل سید یوسف راجو قتال (م: ۷۲۱/۱۳۳۱ء) کو دکن میں تصوف کے فروغ وارتقا میں مرکزیت حاصل ہو چکی تھی۔ان کے اہل خاندان نے ارض دکن کو ارم طریقت بنا دیا۔سید یوسف سے ملتے جلتے کئی نام ملتے ہیں جن میں راجو قتال کا لاحقہ بھی شامل ہے۔لیکن یہاں ان سید یوسف حسینی راجو قتال کا ذکر مقصود ہے جو خواجہ بندہ نواز کے والد ماجد تھے۔بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انھیں مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا بھائی لکھ دیا تو ہمارے محققین کرام نے بلا زحمت تحقیق اسے دہرانا شروع کر دیا۔حالانکہ سید یوسف حسینی راجو قتال اور سید

صدرالدین راجن قتال دو مختلف شخصیت ہیں ۔سید یوسف حسینی کا شجرۂ نسب امام حسین تک اس طرح پہنچتا ہے:
سید یوسف بن علی بن محمد بن یوسف بن حسین بن محمد بن علی بن حمزہ بن داؤد بن زید بن ابوالحسن الجنیدی بن محمد بن عمر بن یحییٰ بن حسین ابوعبداللہ بن زید شہید بن زین العابدین بن سید الشہداء امام حسین ۔یعنی سید یوسف الحسینی قتال نسبی اعتبار سے زیدی ہیں ۔جبکہ مخدوم جہاں جہاں گشت نقوی ہیں ۔ان کا شجرۂ نسب اس طرح ہے:
سید جلال الدین جہانیاں جہاں گشت بن احمد کبیر بن جلال سرخ پوش بن بخاری بن علی ابوالمکوید بن جعفر بن محمد بن محمود بن احمد بن عبداللہ بن علی اشقر بن جعفر ذکی بن امام علی نقی بن امام محمد تقی بن امام علی رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن سید الشہداء امام حسین سید راجو قتال کے اجداد خراسان سے ہندوستان وارد ہوئے جبکہ جہاں نیاں جہاں گشت کے جد سید جلال سرخ بخارا سے ہندوستان تشریف لائے ۔سید جلال سرخ سلسلۂ سہروردیہ کے شیخ بہاءالدین زکریا کے مرید و خلیفہ تھے ،جبکہ سید راجو قتال سلسلہ چشتیہ کے خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید اور شیخ چراغ دہلی کے خلیفہ تھے ،سید جلال الدین سرخ پوش بخاری اوچہ (ملتان) میں فروکش تھے ۔سید راجو قلعہ دہلی میں ملازم تھے اور محمد تغلق متلون مزاج کا شکار ہوئے وغیرہ سید راجو قتال کی یادگار مشہور فارسی نظم وتحفۃ النصائح ہے جو انھوں نے اپنے فرزند خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز کی ہدایت و رہنمائی کے لیے لکھی تھی :

گویا ہمی یوسف گدا در وعظ سخنے چند را　　　　از بہتر خلف خوش لقا بوالفتح آں نور البصر

خواجہ سید محمد بن یوسف الحسینی معروف بہ بندہ نواز گیسو دراز (م: ۸۲۶ھ/۱۴۲۲ء) سلسلۂ چشتیہ کے مقبول ترین بزرگان طریقت میں ہیں ،جن کے فیض روحانی سے اہل دکن میں فروغ دین ہوا۔موصوف کو خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی ہے سے خرقہ وخلافت رحمانی حاصل ہوئی ۔ان کے ہجرت دکن کا سبب بقول شیخ عبد الحق اپنے مرشد شیخ نصیر الدین کی وفات کے بعد دہلی سے دل اچاٹ ہونا تھا۔ابوالفضل کے مطابق اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل تھی ۔ اور ڈاکٹر اطہر عباس رضوی کے نزدیک حملہ تیمور کی خبریں تھیں ،جن کی بنا پر دہلی محفوظ جگہ نہیں رہ گئی تھی ۔موصوف پہلے گوالیار گئے ،وہاں سے گجرات گئے ،جس کی سلطنت کا بانی ظفر خان شیخ احمد کھٹو کا مرید تھا۔اس نے کوئی توجہ نہ کی ۔خواجہ بندہ نواز گجرات میں کئی برسوں تک رہے ۔وہاں سے دکن ہجرت کر گئے ۔یہ بہمنی سلطنت کا سنہرا دور تھا کہ سلطان تاج الدین فروز شاہ (۱۴۲۲-۱۳۹۷ھ) سریر آرائے سلطنت تھا۔ اس نے اپنے اراکین سلطنت کے ہمراہ استقبال کیا۔لیکن جب اس نے اپنے بھائی احمد خان کو نابینا کر کے اپنے بیٹے کو ولی عہد بنانے کا منصوبہ بنایا اور بیٹے کے لیے خواجہ سے دعا کا خواستگار ہوا تو انھوں نے انکار کر دیا۔پھر احمد خان نے خواجہ کے خانقاہ میں پناہ لی تو خواجہ اور سلطان کے درمیان کشیدگی عروج کو پہنچ گئی ۔احمد خان ۲۲ ستمبر ۱۴۲۲ء کو سلطان بنا تو خواجہ بہت ضعیف ہو چکے تھے ۔ نئے سلطان نے خانقاہ کو فراخ دلی سے عطیات دیے۔

گلبرگہ (کرناٹک) ،جہاں خواجہ گیسو دراز کا مزار ہے ،اس دور میں سلطنت بہمنی کا دارالسلطنت تھا لیکن بعد میں (۱۴۳۶ء میں) حیدرآباد دارالسلطنت ہو گیا تو گلبرگہ کی ظاہری چمک دمک ختم ہوگئی لیکن باطنی روشنی وقت گذرنے کے ساتھ بڑھتی گئی ہے ۔دکن میں خواجہ بندہ نواز کی درگاہ کو درگاہ خواجہ اجمیری کی سی اہمیت

ہے۔خواجہ بندہ نوازاپنے تقویٰ وتقدس، کشف روحانی اور مقبول بارگاالٰہی ہونے کے علا
ں ممتاز ہیں۔ان سے متعدد تصانیف منسوب ہیں جن میں تفسیر قرآن مشرق الانوار (مجموع
قہ اکبر، ادب المریدین (رسالہ قشیری کا ترجمہ) عوارف المعارف، جوامع الکلام وغیرہ ف
العاشقین، تلاوت الوجود، ہدایت نامہ وغیرہ اردو میں یادگار چھوڑی ہیں۔ بعض محققین ا
انتے بلکہ بعد کے دور سے منسوب کرتے ہیں لیکن اس میں کسی کو کلام نہیں ہے کہ خواجہ
علوم کے علاوہ ہندوستانی کا علوم کا باقاعدگی سے مطالعہ کیا تھا۔حالانکہ سلسلۂ چشتیہ میں نظ
کا بول بالا رہا، انھوں نے تصور وحدت الشہود کو مساوی اہمیت عطا کی۔موصوف ابن ع
کے خلاف تھے کہ اس میں اولیاء کا اطلاق قرب الٰہی پر منحصر قرار دیا گیا ہے۔خواجہ گیسودراز
ں کو صوفیہ پر فضیلت حاصل ہے اور اور اصلاً وہی ولی اللہ ہیں۔ان کے خانوادۂ روحانی
ں کے فرزند وخلیفہ سید اکبر حسینی (م:۸۱۲ھ/۱۴۰۹)اور نواسے سید عبداللہ حسینی (م:۸۵۲
ں۔سید اکبر حسینی کو خواجہ بندہ نواز 'میاں بڑھ' کہتے تھے۔ان کا انتقال باپ کی زندگی میں ہو
زان کا عرس اسی اہتمام سے کرتے تھے، جس طرح مرید پیر کا عرس کرتے ہیں۔سید اکبر حسی
ی کے بیان میں کہتے تھے کہ اگر وہ میرے بیٹے نہ ہوتے، اس صورت میں یہ خدمت بجالا
یر سے نہیں بڑھا، سوال دو اشخاص کے: ایک، خواجہ بختیار کا کی جو خواجہ معین الدین چشتی
ے سید محمد اکبر مجھ سے۔سید اکبر حسینی نے خواجہ بندہ نواز کے دو سال کے ملفوظات 'جامع الکلم
یں ترتیب دیے تھے، جو تصوف کی اساسی کتب میں شمار ہوتی ہے۔سید عبداللہ حسینی کا خواجہ
یان کرنے میں اختلاف ہے۔کوئی پوتا کسی نے نواسی کا شوہر لکھا ہے۔سید عبداللہ حسینی سے
کے رسالہ نشاط کا ترجمہ منسوب ہے، جو ناپید ہے۔

دکن میں خود مختار بہمنی سلطنت قائم ہوئی تو اہل علم و عرفت کے پہلو بہ پہلو اہل طریقت
ی۔سلطان حسین بہمن (۵۹-۱۳۴۷) کا پایہ تخت گلبرگہ تھا، جو احسن آباد یا حسین آباد کہا
ت میں شیخ عین الدین گنج العلم (م:۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء) ہوتے ہوئے دکن تشریف لا
ت ہوئی۔وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔دہلی سے گجرات ہوتے ہوئے دولت آباد گئے
دین حسینی سے بیعت کی۔وہاں سے عین آباد ساگر اور آخر میں بیجاپور گئے، جہاں وفات
ں تصنیف کیں جن میں تکملۂ عطقات ناصری اور صوفیہ کے احوال پر مبنی اطوار الابرار قا
ں محمد شاہ ثانی (۹۸-۱۳۷۸ء) کے دور میں مولانا فضل اللہ انجو اور شیخ سراج جنیدی گلبرگ
ں خواجہ بندہ نواز گلبرگہ تشریف لائے۔خواجہ ابرار الدین محمود گاواں (م:۱۴۸۱ء) وکیل سلطن
ی صفات انسانی یکجا تھے۔جس کے حسن تدبر سے سلطنت بہمنی کا وقار قائم رہا۔اس نے
لیے مدرسہ قائم کیا۔صوفیہ کا بڑا قدرداں تھے۔جن میں شاہ طاہر استر آبادی اور ملا نظیری ک

شاہ میرن جی شمس العشاق (م:۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء) دکنی تاریخ تصوف میں خصوصی اہم

ہیں۔ان کے نسب وسوانح میں محققین کے درمیان شدید اختلافات ہیں۔ان کی بوتنت کے اعتبار سے ان کے والد کا نام حاجی دولت مکی تھا، جن کی سکونت مکہ معظمہ میں تھی۔ والدہ ہندوستانی چغتائی تھیں، میران جی کی ولادت مکہ معظمہ میں ہوئی۔امیر الدین نام میران جی عرفیت۔ بائیس سال کی عمر میں مکہ سے مدینہ گئے۔ بارہ سال تین مہینے پانچ دن ایک کروٹ سے لیٹے رہے۔خواب میں رسالت مآب کی زیارت ہوئی۔ ہدایت نبوی ہوئی کہ ہندوستان جاؤ۔ انھوں نے کہا میں وہاں کی زبان نہیں جانتا۔ حکم ہوا شاہ کمال الدین بیابان سے ملاقات کرو۔میران جی ہندوستان آئے، شاہ کمال الدین بیابانی (م:۸۸۱ھ/۱۴۷۲ء) سے بیعت کی۔اور دکن میں ہی رہ گئے۔ان سے کئی تصانیف منسوب ہیں مثلاً شرح رغوب القلوب، سبع صفات، حل ترنگ اور گل باش وغیرہ لیکن محققین ان کی تصانیف قرار دینے میں تامل کرتے ہیں۔البتہ ان کا مرتبہ ماہے کون شوال ہے یادگار ہے۔میران جی کے بیٹے اور خلیفہ شاہ برہان الدین جانم (م:۱۰۰۷ھ/۱۶۵۹ء) صاحب تصانیف صوفی تھے۔ ان کی متعدد کتابوں میں کلمۃ الحقائق اور ارشاد نامہ زیادہ اہم ہیں جانم نے بن عربی کے وحدت الوجود شیخ شہاب الدین سہروردی کے تصور حقیقت نور کے درمیان تطابق پیدا کیا۔ابن عربی کے نزدیک ذات باری چھ تنزلات سے گذر کر عالم ممکنات میں ظہور کرتی ہے۔ شیخ الاشراق اپنے تصور حقیقت نور میں نورالسمٰوات والرض (اللہ آسمان اورزمین کا تعرنور ہے۔النور۲۴/۳۵) کے چھ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ان کی تفصیلات اپنی جگہ بیان کی جاچکی ہیں لیکن یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ جانم نے نور کے تنزلات اور وجود کے مراتب کی بحث میں من ناسوت کے چار عناصر یعنی آب، آتش خاک اور ہوا۔ پر زور دیا ہے۔ ان کے فرزند اور خلیفہ سید امینالدین اعلیٰ نے تطابق وجود و نور کو مزید تناظر عطا کیے۔

سید امین الدین اعلیٰ (م:۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء) کی ولادت جانم کی وفات کے بعد ہوئی تھی لہٰذا ان کے سایہ عاطفت سے محروم رہے۔ تعلیم وتربیت چچا امین الدین نے کی اور خاندانی خرقہ خلافت شیخ عطااللہ حسینی سے پہنا۔ان کی تعلیمات سے اہل دکن کو خصوصی طور پر عرفان وآگہی حاصل ہوئی۔ان کے لاتعداد القاب مقبولیت کی دلیل ہیں۔ان کی مریدین تعداد ایک لاکھ بتائی جاتی ہے جن میں بزرگ شخصیتیں شامل ہیں۔مثلاً بابا شاہ حسینی شاہ فتاح، شاہ قائم، شاہ نور محمد دریا، وغیرہ ان کے نزی کارناموں میں رسالہ گنج مخفی وجوریہ، شرح کلمہ طیب، حکمۃ الاسرار۔ گنج لگی نولطو داہلیہ ارشاد نامہ ایک ہی رسالہ کے تین نما ہیں۔اس میں نظام تصوف کی توضیح وتشریح کی گئی ہے۔رسالہ وجودیہ میں وجود کے چھ مراتب: موکل، روح، قلب، توحید ذکر اور منزل شہادت کی وضاحت کی گئی ہے۔اعلیٰ نے عناصر ترکیبی میں وخالی کو شامل کر کے ان کی تداد پانچ کردی۔قدیم ہندوستانی تصور میں عناصر ترکیبی مذکورہ بالا چار عناصر کے علاوہ پانچواں عنصر آکاش ہے، جن کو پنچ مہا بھوت کہتے ہیں۔'پنچ' سے متعلق متعدد تصورات ہیں مثلاً 'پنچ گوپیہ' 'پنچ تپ' 'پنچ پلو' وغیرہ' اودتیہ' سے متعلق مادھوآچار کا 'گرنتھ پنچ دشی' ہے۔اس سے اعلیٰ کے ماخذ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اعلیٰ نے پانچ عناصر کے پانچ 'گن' بھی متعین کیے۔اس بناپر ان کے تصور عرفانیت کو پچیس گنواں کا تصوت بھی کہتے ہیں۔۱۶ویں صدی (دکرمی) کے مشہور رادوتیوزادی آچاریہ نرسنگھا شرم سوامی ادے بھٹ نے بھی عرفانیت کے پنچ گنوں کا ذکر کیا ہے۔ اعلیٰ کی عرفانی اصطلاحات بھی سنسکرت تباد ہیں مثلاً

آکاز (ناسوت) اونکار (ملکوت) بودھ (عقل) ترکی (سرنہتی) بھرم (وہم) اروپ (تنزل)، آتما (روح) دستاپن (مشہود) وغیرہ۔ اعلیٰ پر اکثر جذب وسرمستی طاری رہتی تھی۔ استغراق سے افاقہ ہوتا تو معتقدین سے ملاقات کرتے۔ معاصر صوفی میران جی خدانما نے ملاقات کی۔ اعلیٰ انھیں اپنے حجرے میں لے گئے۔ باہر آئے تو کہا امین الدین میران بنو گیا۔ میران امین الدین بن گیا۔ ایہ تصور ہندوستانی شریت کا تصور ماہیت قلب (☆☆) ہے۔ سجدۂ بندگی اور سجدۂ تحسیت کے درمیان فرق بنیا کر کے اعلیٰ سجدۂ تعظیمی کو جائز قرار دیتے تھے۔
بیابانی صوفیہ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سندھ میں آبادی سے دور جنگلوں میں رہنے کی بنا پر بیابانی کہلائے۔ انھیں میں شالی کمال الدین بیابانی کمش العشاق کے مرید تھے۔ شاہ اشرف بیابانی (م: ۹۰۳۵ھ/۱۵۲۹ء) کے وادل قادر آباد جالنہ میں رہتے تھے جو دولت آباد کی بنا پر رشد وہدایت کا مرکز بن گیا تھا۔ سید ضیاء الدین بیابانی (م: ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء) نے حسن کردار سے متاثر ہو کر سلطان مشکل آسان نے ان سے اپنی بہن کا عقد کر دیا اور چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، رفاعیہ اور نقش بندیہ کی خلافتیں عطا کر دیں۔ سید اشرف بیابانی نے اپنے والد سے علم وآگہی رموز طریقت اور خلافت رحمانی حاصل کی۔ ان کی وفات کے بعد جانشین ہوئے۔ شاہ اشرف کی شہرت کا مدار نوسرار ہے، جو اردو میں ولین مرثیہ ہے۔ لازم المتعدی بھی ہے، جو ایک طرح کی فرہنگ ہے۔ دکن کے دیگر اہم صوفیہ میں شیخ قطب الدین قادری (م: ۹۴۰ھ/۱۵۳۳ء) خواجہ محمد دہدار (م: ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء)، میرانجی خدانما (م: ۱۰۷۴ھ/۱۶۶۲ء) میران یعقوب (م: ۱۰۷۸/۱۶۶۷ء) وغیرہ شامل ہیں۔

بنگال اور بہار کا فاتح محمد بختیار خلجی تھا، جس نے رائے لکشمن رائے یا رائے لکشمی کو قتل کر کے ۵-۱۲۰۴ھ میں اس کے دارالسلطنت نادیا پر قبضہ کیا۔ منہاج سراج نے اس واقعہ کو داستانوں کی طرح دلچسپ بنا کر پیش کیا ہے۔ لیکن بختیار خلجی نے اپنا پایہ تخت لکھنوتی (لکشمن وتی) کو بنایا، جہاں مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں آباد کیں اور لکھنوتی کو مشرقی ہند کے اسلامی مذہبی وثقافتی مرکز کی حیثیت سے ترقی دی۔ ان مدرسوں اور خانقاہوں سے وابستہ علماء وصوفیہ کے بارے میں تفصیلات نہیں ملتیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ شیخ اخی سراج الدین عثمان (نیم تعلیم یافتہ درویش) نے لکھنوتی میں سلسلہ نظامیہ چشتیہ کی بنیاد ڈالی تھی، حالانکہ اس سے قبل شیخ جلال الدین تبریزی اور شیخ شرف الدین ابوتو آنا نے سنارگاؤں (مشرقی بنگال) اور پنڈوا (بنگلا دیش) میں سلسلہ چشتیہ کی بنیاد قائم کر دی تھی۔ شیخ اخی کے برعکس ان کے خلیفہ شیخ علاؤ الحق بن اسعد لاہوری (م: ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء) بڑے عالم وفاضل تھے۔ ان کے فرزند وخلیفہ شیخ نورالحق معروف بہ شیخ نور قطب عالم (م: ۸۱۳ یا ۸۱۹ھ/۱۴۱۰ یا ۱۶ء) سے خانقاہ پنڈوا کو خصوصی شہرت ہوئی۔ ان کی خانقاہیں پورے بنگال اور بہار میں پھیلی ہوئی ہیں، جن میں پورنیہ کو شیخ حسین دھکڑ پوش کی خانقاہ کو امتیاز حاصل ہے۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے بنگال کو عالم اسلام کے اہم صوفی مراکز میں شمار کیا ہے۔

میر سید اشرف جہاں گیر سمنانی (م: ۸۰۸/ ۱۴۰۵ء)[۱۰۷] کی بدولت مشرقی اتر پردیش میں تحریک تصوف کو خصوصی تقویت حاصل ہوئی۔ موصوف کو سلاسل چشتیہ وسہروردیہ میں یکساں عظمت و اہمیت حاصل ہے۔ ان کے والد محمد ابراہیم سمنان کے سلطان تھے۔ ان کی وفات کے بعد سمنان کی عنانِ حکومت

سنبھالی۔لیکن ان کی طبیعت راہِ سلوک پر مائل تھی۔ترک سلطنت کیا۔سب کو وداع کر کے ماورالنہر، بخارا، سمرقند ہوتے ہوئے ۱۳۸۰ء میں اوچہ تشریف لائے۔ ہندوستان کے مختلف اکابر صوفیہ کے مزارات کی زیارات کے بعد مزید زیارات کے لیے مدینہ منورہ، نجف اشرف، کربلائے معلیٰ گئے پھر روم، شام، دمشق، مشہد مقدس ہوکر ہرات گئے۔ایران، عراق، دمشق، ترکی، عرب وغیرہ سفر کرتے رہے۔تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انھوں نے دورانِ سفر ایک سو نوے اولیاء سے فیوض و برکات حاصل کیے تھے۔علاء الدولہ سمنانی سے دوستانہ مراسم تھے لیکن ان کے تصور وحدت الشہود سے متاثر نہ ہوئے۔ ماوراالنہر میں خواجہ بہاء الدین نقش بند سے ملاقات کی لیکن ان کا مسلک بھی متوجہ نہ کر سکا۔ اوچہ میں تھوڑے عرصہ تک شیخ مخدوم جہانیان جہاں گشت کے ہمراہ قیام کیا۔ پھر خواجہ بندہ نواز سے ملاقات کی، ان سے اور ان کے شاگردوں سے تصور وحدت الشہود پر مباحثہ کیا، پھر ۵ شوال ۷۸۲ھ/۲ جنوری ۱۳۸۱ء کو منیر (بہار) پہنچے، جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کی لاش تدفین کی منتظر تھی۔ نماز جنازہ پڑھائی اور بنگال کے لیے روانہ ہوگئے۔پنڈوا اور سنارگاؤں ہوکر جون پور واپس ہوئے، لیکن وہاں بھی قیام نہیں کیا بلکہ مشرقی اتر پردیش میں فیض آباد کے ایک گاؤں کچھوچھہ کو اپنا مستقر قرار دیا۔ ردولی (سیتاپور) میں شیخ کریم الدین دانشمند سے ملاقات کی۔سید سمنانی نے ابن عربی کے تصور وحدت الوجود کی زبردست موئیدین میں تھے۔ لیکن ابن عربی کے عقیدہ اطاعت اور تصور فرعون اولیٰ مصری کے متعلق دلائل کی تائید نہیں کرتے تھے۔ ابن عربی نے فصوص الحکم میں اس مسئلہ کے تعلق سے دس مختلف مقامات پر بحث کی ہے۔ابن عربی کے نزدیک فرعون کو جنت و دوزخ کی فکر نہیں تھی، بلکہ وہ مشیت الٰہی کا پابند تھا۔اس لیے آزاد مطلق نہیں تھا اور اس کی عدول حکمی نہ تو خالص مذہبی تھی، نہ غیر مذہبی۔اس لیے اس کو بدعقیدہ قرار دینا غیر صحیح ہے۔ لطائف اشرفی میں ایک واقعہ درج ہے کہ سید اشرف جہاں گیر نے ایک کتاب حضرت علی کی فضیلتوں پر مبنی لکھی تھی جس میں انھیں تمام صحابہؓ کرام سے افضل ثابت کیا گیا تھا۔اس پر علمائے اہل تسنن نے محضر کیا اور ان پر رفض کا الزام وارد کیا۔لیکن انھیں میں سے مولانا سید خان نے یہ کہہ کر معاملہ رفع دفع کر دیا کہ موصوف سید ہیں۔اگر انھوں نے اپنے جد کے لیے چند اچھے کلمات لکھ دئے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔

کم وبیش اسی زمانہ میں چشتیہ صوفیہ کے دیگر مراکز بھی قائم ہوئے، جن میں چند اہم مراکز کا ذکر ہی کیا جاسکتا ہے۔مثلاً لکھنؤ سے تقریباً ۱۰۰ کم کے فاصلہ پر ردولی (ضلع سیتاپور) میں شیخ احمد عبدالحق شاگرد شیخ جلال پانی پتی، جو سلسلہ چشتیہ صابریہ کے صوفی تھے، شاہ مینا کے شاگرد شیخ سعد الدین (م۔۸۵۱۵ء) خیرآباد (ضلع سیتاپور)، خود شاہ مینا جن کا مزار لکھنؤ میں ہے۔شیخ نظام الدین اولیا کے شاگرد مولانا محمد اسماعیل بن مولانا جلال الدین۔نمانک پور (ضلع پرتاپ گڑھ)، کڑا میں شاہ حسام الدین معروف بہ شاہ حسام الحق (م۔ ۱۴۱۱ء) الہ آباد ضلع کے جھونسی کے نزد قصبہ اتراؤں (الہ آباد) میں دنگدھ کے شاہ باسط علی قلندر رونی کے قاضی خطیر الدین، ان کے بھائی قاضی معز الدین ظفرآباد ضلع جون پور، انھیں کے خاندان کے خواجہ اسماعیل چشتی کنت ضلع مرزاپور، شہر الہ آباد میں صوفیہ کے بارہ دائرے، خصوصاً دائرہ شاہ محب اللہ، دائرہ شاہ حجت اللہ، دائرہ شاہ اجمل، دائرہ شاہ علیم اللہ، دائرہ شاہ رفیع الزماں، دائرہ شاہ نور علی، دائرہ شاہ رضی الدین وغیرہ۔مندد

(مالوہ) کے خواجہ معین الدین خورد جو خواجہ اجمیری کے خاندان سے تھے۔ خانقاہ رشیدیہ جون پور (یوپی) کے، خانقاہ علیمیہ غازی پور (یوپی) کے اور گورکھپور کے صوفیان سبز پوش میں سید قیام الدین شاہ (م۔۱۷۱۶ء) اور سید شاہد شاہ فانی سبز پوش (م۔۱۹۵۲ء) وغیرہ وغیرہ

اوپر کی سطروں میں ذکر آچکا ہے کہ سلسلہ سہروردیہ کے موسس شیخ شہاب الدین ہیں۔ لیکن ان کے خلیفہ سلسلہ سہروردیہ کے متوازی سلسلہ کبرویہ قائم ہے، جس کے بانی شیخ ابوالجناب احمد بن عمر الخواقی معروف بہ شیخ ولی تراش ہیں، جو شیخ شہاب الدین سہروردی زنجانی (م۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء) کی طرح شیخ زہادالدین ابوالنجیب سہروردی (م۔۱۱۶۸ء) کے شاگرد تھے۔ شیخ ولی تراش سے سلسلہ کبرویہ قائم ہوا اور عالم اسلام میں پھیل گیا۔ اس کی تین مختلف شاخیں ہیں بغدادی شاخ، خراسانی شاخ، جس کی دو ضمنی شاخین رکنیہ اور انغشائیہ ہیں۔ تیسری ہندوستانی شاخ ہے جس کی دو ضمنی شاخیں ہیں ایک شاخ میر سید علی ہمدانی شاگرد شیخ شرف الدین محمود کی نسبت سے سلسلہ ہمدانی اور دوسری شاخ خواجہ رکن الدین فردوسی شاگرد خواجہ بدر الدین ثمرقندی کی رعایت سے سلسلہ فردوسیہ کہلاتی ہے۔

سلسلہ کبرویہ کے ممتاز صوفی بزرگ امیر کبیر سید علی ہمدانی (م:۷۸۶ھ/۱۳۸۵ء) کے سلسلہ ہمدانیہ کا ایک اہم مرکز وادی کشمیر ہے، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ کشمیر میں تصوف کا آغاز سید علی ہمدانی سے ہوا۔ ان سے بہت پہلے راجہ ہرش (۱۰۸۹۔۔۱۱۱۱ء) کے دور مین بہت سے مسلمان کشمیر میں آباد ہو چکے تھے اور ایک صوفی بزرگ سید شرف الدین معروف بہ بلبل شاہ (م:۷۲۸ھ/۱۳۲۷ء) کی ۸ خانقاہ بھی قائم ہو چکی تھی جو سلسلہ سہروردیہ سے متعلق تھے۔ جب منگول حملہ آور رنچن (م:۷۲۴ھ/۱۳۲۳ء) بلبل شاہ کے ذریعہ مشرف بہ اسلام ہوا اور اسلامی نام صدرالدین اختیار کیا، تو بلبل شاہ کی خانقاہ کو زبردست عطیات دیئے، لیکن ان کے خلفاء میں کوئی صوفی ایسا نہ ہوا، جو اس کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھال سکتا لیکن سلطان زین العابدین (۱۴۲۰۔۷۰ء) کے زمانہ میں سہروردیہ سلسلہ نے ایک بار سنبھالا لیا، جب شیخ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے شاگرد سید احمد کرمانی وارد کشمیر ہوئے، حالانکہ وہ صرف چھ ماہ کے قیام کے بعد وطن مالوف لوٹ گئے لیکن اپنے ایک کشمیری شاگرد شیخ حمزہ کو اپنا جانشین بنا گئے۔

امیر کبیر سید علی ہمدانی نے علمِ طریقت شیخ تقی الدین علی دوسی سے حاصل کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد شیخ شرف الدین محمود نظام الدین مرزقانی نے سلسلہ کبرویہ میں داخل کیا، جو شیخ علاؤالدولہ سمنانی کے شاگرد تھے۔ شیخ علاؤالدولہ کا ذکر وحدت الشہود کے بانی کی حیثیت سے کیا جا چکا ہے۔ شیخ علاؤالدولہ کی خانقاہ میں ہی سید علی ہمدانی اور سید اشرف جہانگیر سمنانی کی باہمی ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں ہندوستان آئے لیکن سید اشرف سمنانی پہلے آئے اور سید علی ہمدانی کافی عرصہ بعد۔ پہلے انھوں نے اپنے نمائندوں کو ہندوستان بھیجا، جو سلطان شہاب الدین (س۔۱۳۵۴ء) سے خانقاہ کی زمیں اور دیگر مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے شہاب الدین پورہ میں خانقاہ و لنگر قائم کر کے سید علی ہمدانی کو اطلاع کی تو موصوف تشریف لائے۔ راستہ میں اوچ کی خانقاہ میں بھی حاضری دی لیکن شیخ مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے ان کا تمسخر کیا کہ ہمدانی وہی شخص ہوسکتا ہے، جو علمِ ظاہر و باطن سے واقف ہو! سید علی ہمدانی پر یہ کلمات بار ہو گئے۔

انھوں نے جواب میں ہمدانیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔تین سال تک سری نگر میں قیام کے بعد وطن کی واپسی میں انتقال ہوگیا۔ان کی تصانیف میں ذخیرۃ المسلوک کو شہرت ملی۔ان کی کتاب رسالۃ فتوۃ سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف صوفیہ کی تحریک فتوت سے بھی متعلق تھے۔ان کی مشہور کتاب مودۃ القربیٰ ان کے شیعی عقائد کی دلیل ہے۔اس میں انھوں نے متعدد ایسی احادیث درج کی ہیں،جن سے فقط اہلِ تشیع کا ناجی ہونا ثابت ہوتا ہے۔اسی زمانہ میں (غالباً ۱۳۹۰ء) ایک اور ممتاز صوفی سید حصاری،جو سلسلہ کبرویہ سے متعلق تھے،سری نگر وارد ہوئے۔سلطان سکندر (۱۴۱۴۔۱۳۸۹ء) ان کا بیحد معتقد تھا۔انھوں نے اپنی بقیہ زندگی سری نگر میں گذاری۔سید علی ہمدانی کے صاحبزادے میر محمود بھی سری نگر آئے۔ان سے متأثر ہوکر سلطان سکندر کا امیر خاص سابحث مسلمان ہوگیا اور سیف الدین نام اختیار کیا،خود سلطان سکندر بھی مرید ہوگیا۔میر محمود کے اثرات بڑھے تو سید حصاری سے تصادم شروع ہوا،آخر کار میر محمود کو اپنے والد سید علی ہمدانی کی طرح کشمیر چھوڑنا پڑا۔لیکن ایرانیوں کی اکثریت کشمیر میں رک گئی،جنھوں نے اپنی دست کاریوں سے کشمیری معیشت کو گلزار بنادیا۔ان میں بیہقی سادات بھی تھے،جنھوں نے شاہی خاندان سے روابط قائم کیے۔سلطان زین العابدین (۷۰۔۱۴۲۰ء) ان کا بڑا سرپرست تھا۔انھوں نے میر محمود کی مذہبی سخت گیری کے خلاف ہندوؤں سے نرمی کا برتاؤ کیا۔اس نے سلطان زین العابدین کی مقبولیت میں زبردست اضافہ کیا کہ کشمیری اسے بڑاشاہ، (بڑا بادشاہ) کہتے ہیں۔

کشمیر میں سلسلۂ نوربخشی سے متعلق اتنی غلط سلط روائتیں رائج ہیں کہ صحیح نتائج تک پہنچنا دشوار ہوجاتا ہے۔ان کا بنیادی سبب یہ ہے کہ دو مختلف شخصیتوں کو ناموں کی مماثلت کی بنا پر ایک سمجھ لیا گیا،حالانکہ ان کے درمیان تین سو برسوں کا فاصلہ ہے۔ہماری تحقیق کے مطابق صحیح صورت حال یہ ہے کہ موسس سلسلہ سید صلاح الدین محمد نوربخش (م:۶۷۵ھ/۱۲۷۶ء) کے والد سید عبدالمومن (م:۵۵۰ھ/۱۱۵۵ء) خلفائے فاطمین کی جانب سے عامل مراکو تھے۔ان کا خاندان خوند میں آباد ہوا جو قزوین اور جیلان کے سرحدوں کے مضافات میں ہے۔خوند مرکز رشد وہدایت بنا اور اسی خاندان کے ملا سید طاہر نے دکن میں آکر خصوصی اہمیت حاصل کی۔سید صلاح الدین محمد نوربخش اور ان کے چچیرے بھائی قاسم انوار کو طریقت سے خصوصی دلچسپی تھی۔تاریخ گلزار شمس کے الفاظ میں ''(سید صلاح الدین) علوم ظاہری و باطنی میں یکتائے زمانہ ہوا اور فاضل جلیل القدر تھا۔انھوں نے کتاب فقہ الاحوط تصنیف فرمائی اور تمام فرقۂ اسماعیلیہ کے پیشوا اور امام ہو۔انھوں نے اوائل دولت اسماعیلیہ میں لباس درویشانہ زیب تن فرمایا اور مذہب اثناعشری نوربخشی کو تقویت دی۔یہ صاحب کامل اکمل اور صاحب دل تھے۔انھوں نے اپنے جدامجد کے طریقہ کو پردۂ تصوف میں رواج دیا ہے۔ان کے فرزندوں سے یکے بعد دیگرے مذہب اثناعشرہ کی کوشش کرتے تھے۔'' ''موصوف اور ان کے صاحبزادے میر شمس الدین قاسم انوار (م:۶۷۵ھ/۱۲۷۶ء) اپنے مسلک طریقت کی ترویج میں مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے کشمیر وارد ہوئے۔'' ''تمام کوستان میں تبت کشمیر گلگت یارقند اسکردو وغیرہ۲ کو رائج کرکے ۵۸۵ھ/۱۱۸۹ء) میں اپنے وطن سبزوار واپس ہوگئے۔''میر شمس الدین مولانا روم کے درمیان گہری دوستی تھی۔انھوں نے مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کی اور اپنے مشن کو پھیلایا۔ہر جگہ الگ الگ ناموں سے

مسہور رہوئے پہلے سید شمس الدین عریفضی اسماعیلی کہے جاتے تھے۔ وطن مالوف میں شمس الدین تبریزی، سبزوار میں شمس الدین سبزوداری، کشمیر میں پر شمس الدین عراقی، ترکستان میں شمس پرندہ شام ومصر میں شمس مغربی اور قاسم انوار، شاعروں میں شمس تبریز۔ ان کا مزار ملتان میں ہے۔

مذکورہ بالا دونوں بزرگ صوفیہ کی ساتویں پشت میں سید محمد نور بخش ثانی پیر متھ (۸۱۰ھ / ۱۴۰۷ء) اوران کے فرزند سید شمس الدین (م: ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء) اپنے جد کی پیروی میں اسی طرح اپنے جد کی کتاب فقہ ا لاحوط نے کر کشمیر میں تشریف لے گئے اور ''مردم کشمیر وتبت واسکردو وگلگت وبدخشاں میں ائمۂ اثناعشر کے نام کا خطبۂ سکہ جاری کیا اور مذہب نور بخشی نے زیادہ فروغ پایا۔'' لیکن ا بکی بار انھوں نے اپنی آمد کی نوعیت مختلف رکھی۔ تیموری سلطان حسین مرزا (۵۰۶-۱۴۶۹) کے سفیر کی حیثیت سے ۱۴۸۱ء میں سری نگر وارد ہوئے۔ لیکن منصب سفارت سے زیادہ اپنے مذہب ومسلک کی ترویج واشاعت کے خواہاں تھے۔ وہ سفیر کی حیثیت سے امور سلطنت میں دخل اندازی نہیں کر سکتے تھے۔ پھر حصول مقصد کے لیے مقامی تائید کی بھی ضرورت تھی، اس لیے سلسلہ کبرویہ کے شیخ اسمٰعیل کے مرید ہوگئے اور ایرانی صوفی نور بخش کی حیثیت سے عوامی مقبولیت کے حقدار ہوگئے۔ سلطان حسین مرزا کے طلبی پر واپس ہوئے لیکن ۱۵۰۱ء میں دوبارہ سری نگر لوٹ آئے اور اپنے عقائد کی ترویج واشاعت کے لیے ایک خانقاہ قائم کی۔ موسیٰ ریناایک سرکاری اہل کار متاثر ہوکر ان کے مسلک میں شامل ہوگیا، جس سے ان کو بڑی کامیابی ملی، لیکن وزیر سلطنت سید محمد بیہقی کی مخالفت سے زندگی اجیرن بن گئی تو مجبوراً الداغ میں سکردو چلے گئے، جہاں بدھوں کی کثیر تعداد کو شیعی عقائد میں داخل کیا۔ لیکن ۱۵۰۵ء میں سلطان فتح شاہ (۱۴-۱۵۰۵) نے موسیٰ رینا کو وزیر مقرر کیا، تو اس نے جارحانہ طور پر شیعت کی تبلیغ کی اور کثیر تعداد میں لوگ شیعی عقائد میں داخل کیے گئے۔ سلطان محمد شاہ، تیسری بار (۲۸-۱۵۱۶ء) حکمراں ہوا تو اس کا وزیر قاضی چک میر عراقی کا ہم نوا تھا۔ اس کے زیر اثر چک قبیلہ شیعہ ہوگیا، پھر جب چک سلطنت قائم ہوئی تو شیعیت کو مزید مواقع حاصل ہوئے۔ کشمیر کے علاوہ برصغیر کے دیگر علاقوں میں بھی سلسلۂ نور بخشی کے مختلف مراکز قائم ہوئے، جہاں ان کے مختلف مزارات ہیں اور بعض مقامات پر خانقاہیں ہنوز سر گرم ہیں۔ مثلاً ملتان، لاہور، اوچہ، نگمری، ٹھٹھہ، ہوشیار پور، کراچی، سکر، ممبئی، احمد آباد، ک بڑودہ، کچھ، جے پور، حیدرآباد، کڑاوغیرہ۔

کشمیر میں صوفیہ کا ذکر سلسلہ ریشیان کے بیان کے بغیر مکمل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سلسلۂ اویسی کے صوفیہ تھے۔ اسلام لانے سے قبل کی ان کی زندگی میں بودھیت کی کارفرمائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کشمیر میں بودھیت اشوک اعظم (۲-۲۳۱ ق م) سے قبل داخل ہوچکی تھی۔ جس میں ریشیت کو روحانی درجہ حاصل تھا۔ ترک دنیا اور ترک لذت کر کے رہبانی وخانقاہی زندگی کو اساسی اہمیت حاصل تھی۔ ریشیت اور بدھ مت کے درمیان متعدد مماثلتیں ہیں۔ کشمیر میں ریشیت کے سرخیل شیخ العالم نورالدین نورانی (م: ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء) ہیں۔ ان کے والدین راجگان کشتواڑ میں تھے جو مہاراجہ بکرماجیت کی نسل سے تھے۔ ان ریشیوں نے مختلف اثرات کے تحت دعوت اسلام پر لبیک کہا تو اپنے نام تبدیل کر دیے اور اپنی عبادت و ریاضت اسلامی شریعت کا مطابق انجام دینے لگے لیکن عوام میں اپنے پرانے ناموں یا ریشی کی نسبت مشہور

ہیں۔ ان عارفوں میں للہ عارفہ (لل دید، جس کے متعلق خیال ہے کہ اسلام قبول نہیں کیا لیکن سید علی ہمدانی سے ملاقات کی تھی) شیخ العالم نور الدین نورانی (نندہ ریشی یا سنہرا نند) بابا بام الدین (بم ساد) بابا زین الدین (جے یا زیا سنگھ) بابا لطف الدین (لدی) بابا نصر الدین (اوتر)۔ وغیرہ شیخ العالم ریشیت کا سلسلہ پیغمبر اسلام سے قائم کرتے ہیں۔ زبان کشمیری میں ان کے اشعار ملاحظہ ہوں: ۵۸

اَوّل ریشی احمدؐ ریشی، دویم اویس قرنی آو	(پہلے ریشی احمد مجتبیٰ ہیں اور دوسرے ریشی اویس قرنی ہیں)
تریم ریشی زَلک ریشی، ژوریم حضرت پلاس آو	(تیسرے ریشی زلکا ریشی اور چوتھے حضرت پلاس ہیں)
پُونژیم ریشی رُمے ریشی، شییم حضرت میراں آو	(پانچویں ریشی رمہ ریشی اور چھٹے حضرت میراں سید علی ہمدانی)
ستم کرکرمُ دِش ناہشی ہُبہ سے کہنہ مئے کیا ناو	(ساتواں رشی تقوے میں ہوں مگر میرا رتبہ اتنا بلند نہیں ہے)

شیخ العالم کے چار خلفاء ہوئے۔ یہ چاروں دعوت اسلام قبول کرنے سے قبل بھی اپنی اپنی ریشیت میں ممتاز تھے۔ ان کے نام ہیں بابا بام الدین، بابا زین الدین، بابا نصر الدین اور بابا لطیف الدین۔ ان کے علاوہ کئی ریشیوں نے بطور خاص شیخ العالم کی روحانی تربیت سے امتیاز حاصل کیا۔ ان میں سنگرام گنائی، سنگرام ڈار، بابا تاج الدین، بابا غلام الدین، بابا قطب الدین، بابا قیام الدین، مولانا مانک نایک، سوزن ریشی، خاطی ریشی، پچھم ریشی اول، پچھم ریشی ثانی، روپہ ریشی، سدہ ریشی بابا نیروز ریشی، گلاب ریشی وغیرہ کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔ کشمیری سلسلۂ ریشیاں کی ایک اور انفرادی خصوصیت ہے کہ شیخ العالم کے خلفاء میں خواتین بھی شامل ہیں۔ ان میں شنگہ بی بی، شام بی بی، بہت بی بی، وَہست بی بی، دتہ بی بی، سلا بی بی وغیرہ شنگہ بی بی ابتدائی زندگی میں کافی ادا خیز قتالہ مست شباب ورقاصہ تھیں، جنھوں نے سوزن رشی کے جامہ تقویٰ کو تار تار کر دیا تھا لیکن شیخ العالم سے متاثر ہو کر تائب ہو گئیں۔

ہندوستانی سلسلہ کبرویہ کی ایک اور شاخ فردوسیہ کے موسس خواجہ رکن الدین فردوسی ہیں، جو خواجہ بدر الدین سمرقندی کے شاگرد و خلیفہ تھے۔ خواجہ بدر الدین کا دہلی میں مستقل قیام تھا۔ چشتیہ صوفیوں سے خوش گوار مراسم تھے۔ شیخ نظام الدین اولیا اور خواجہ بدر الدین ایک دوسرے سے ملاقات کے لیے اکثر ایک دوسرے کی خانقاہ میں جاتے۔ سماع اور عرس میں خصوصیت سے دونوں جگہ بزرگ یکجا ہوتے۔ لیکن خواجہ رکن الدین کے خلیفہ و جانشین شیخ عماد کے دو بیٹے علانیہ شیخ نظام الدین اولیا کی مذمت کرتے تھے۔ البتہ اسی سلسلہ کے بزرگ شیخ نجیب الدین فردوسی نے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی مگر ان کے شاگرد مولانا فرید الدین، جنھوں نے ۷۶۔۱۳۷۵ء میں سنی فقہ پر ایک کتاب فتویٰ تاتار خانیہ لکھی، استاد کو مشہور کر گئے، دوسرے ممتاز صوفی بزرگ شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری ہیں، جو استاد کو چار چاند لگا گئے۔ ان کا نام احمد، والد کا نام یحییٰ اور شرف الدین لقب تھا، منیر (بہار) کو مستقر قرار دیا۔

شیخ شرف الدین (م: ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء) نے سونار گاؤں (بنگلہ دیش) میں قیام کر کے تقریباً بائیس برسوں (۵۱۔۱۲۲۹ء) تک مولانا شرف الدین ابو توامہ سے تعلیم و تربیت حاصل کر کے منیر واپس آئے تو ان کے والد ماجد شیخ یحییٰ کا انتقال ہو چکا تھا چند دنوں کے قیام کے بعد شیخ نظام الدین اولیا سے ملاقات کرنے کے لیے دہلی چلے گئے، وہاں سے پانی پت گئے شیخ بو علی قلندر سے ملاقات کی۔ پھر شیخ نجیب الدین فردوسی

سے ملاقات کر کے سلسلۂ فردوسیہ میں داخل ہو گئے۔ انہی کی ہدایت پر دوبارہ منیر لوٹ آئے۔ پھر بارہ برسول تک مگدھ (بہار) میں بہیا اور راج گیر کے جنگلوں میں عبادت و ریاضت کرتے رہے۔ عقیدت مندوں کی آمد سے خلل پڑنے لگا تو حاجتمندوں سے ملاقات کے لیے ہر جمع کو منیر آتے اور نماز جمعہ بھی پڑھانے لگے۔ شیخ نظام الدین اولیا کے ایک شاگرد مولانا نظام مدنی شیخ یحییٰ کے زبردست عقیدت مندوں میں تھے۔ انھوں نے منیر میں چھوٹی سی خانقاہ بنوادی۔ پھر سلطان محمد تغلق (م) کے حکم سے شاندار خانقاہ تعمیر ہوئی اور پرگنہ راج گیر جاگیر میں عطا ہوا۔ بعد میں شیخ شرف الدین نے نہ صرف یہ جاگیر کا فرمان سلطان فیروز شاہ تغلق کے حکم سے بہاری صوفیہ کے قتل پر احتجاج میں واپس کر دیا۔[۱۳۸] بلکہ عوام کو اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ اس پر سلطان فیروز شاہ تغلق بہت خفا ہوا اور فرمان جاری کر کے محضر منعقد کرنا چاہا لیکن شیخ مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے سمجھا بجھا کر خاموش کر دیا۔[۱۳۹] شیخ شرف الدین اپنے رویہ میں سہروردیوں سے زیادہ چشتیوں کے قریب تھے انہیں کی طرح حکام سے کنارہ کش اور مال و دولت سے بے نیاز اور عوام میں گھل مل کر انہیں راہ حق کی ہدایت کرتے تھے۔ انھوں نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، جن میں راحت القلوب، بحر المعانی، خوان پر نعمت، گنج لایعنی مسخ المعانی، مراۃ المحققین، مکتوبات، ملفوظات وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

شیخ شرف الدین کے خلفاء کی خانقاہیں پورے بہار پر محیط ہیں بلکہ بنگال، مشرقی اتر پردیش اور مدھ پردیش میں بھی ہیں۔ ان میں محض چند کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً پھلواری (پٹنہ) میں سید منہاج الدین راستی، اور شیخ مظفر، ملک رادہ فضل الدین، مولانا نظام الدین جنہوں نے ناموری حاصل کی۔ بہار کے صوفیہ کا ذکر خواجہ شہاب الدین حق گو شہید زاہدی کے بغیر مکمل نہیں کیا جا سکتا۔ جو ہندوستان میں سلسلہ زاہدیہ کے بانی ہیں۔ اس سلسلہ کے موسس خواجہ فخر الدین خدا داد بزرگ زاہد تھے، جو خواجہ شہاب الدین ا،) کعبہ کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے۔ بعض اس سلسلہ کو شیخ ابواسحٰق شہریار گازرونی کی نسبت سے سلسلہ گازرونیہ بھی کہتے ہیں۔ خواجہ حق گو نے سلطان محمد تغلق کے فلسفہ الملک عادل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، جس پر خفا ہو کر سلطان نے قلعہ کی چھت سے نیچے گرا دیا تھا کہ وہیں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ ان کی قبر قلعہ کے دامن میں ہے[۱۴۰] سلسلہ زاہدیہ کے صوفیہ کی خانقاہیں، بنگال، بہار اور یوپی میں پھیلی ہوئی ہیں۔

سلسلہ نقش بندیہ کو ہندوستان میں خواجہ باقی باللہ (م: ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء) نے جاری کیا جو موسس سلسلہ خواجہ بہاء الدین نقش بند کی دسویں پشت میں تھے۔ حالانکہ خواجہ باقی باللہکے قیامِ ہند مدت محض تین سال تھی کہ ان کی وفات ہو گئی لیکن ان کے شاگرد اور خلیفہ شیخ احمد سرہندی معروف بہ مجدد الف ثانی (م: ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) سے خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ شیخ احمد سرہندی کو صوفی کی بجائے پرجوش مبلغ کہنا زیادہ درست ہے۔ عام طور پر صوفیہ کا پیغام محبت مسلم و ہندو میں امتیاز نہیں کرتا لیکن شیخ احمد سرہندی نے نفرت کو محبت پر ترجیح دی۔ جہاں گیری دربار کے ایک اہم امیر اور اپنے پیر بھائی شیخ فرید بخاری کو خط میں انھوں نے ہدایت کی کہ اہل تشیع سے سب کو دور رہنا چاہئے کیونکہ وہ ہندوؤں سے بھی بدتر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس شدت تعصب میں تصوف کا گذر نہیں ہو سکتا، انجام ظاہر ہے، نقش بندی خانقاہیں ویران و برباد ہو گئیں اگر ان میں چند باقی ہیں تو محض اس لیے کہ ان کا سلسلہ دوسرے سلسلوں سے وابستہ ہو گیا ہے۔ خاص کر ابوالعلائیہ سلسلہ کو مقبولیت

حاصل ہے۔

ہندوستان میں سلسلہ قادریہ دیگر سلاسل سے منسلک ہوکر عام ہوا۔ موسسِ سلسلہ غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی . . . کی وفات کے تین سو سال بعد اسی خاندان کی دسویں پشت شیخ محمد نے رائج کیا۔ اسی سلسلہ کے شاہ قمیص سے سلسلۂ قمیصیہ جاری ہوا۔ ایک اور بزرگ میر محمد عرف میاں میر تھے جو شہزادہ داراشکوہ کے مرشدوں میں تھے۔ لیکن اصلاً سلسلہ قادریہ کو شیخ ولی اللہ محدث دہلوی (م:۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کی بدولت مقبولیت حاصل ہوئی، جو اپنے آپ میں ایک ادارہ تھے۔ ان کی فعال شخصیت مسائل و مباحث کو عصری تناظر میں دیکھا متعدد زاویوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں اہم نشانِ منزل ہیں۔ وہ عہدِ وسطیٰ اور عہد جدید کے اسلام کے درمیان ایک پل کی طرح ہیں۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ بیک وقت مفسر و محدث، فقیہ و نحوی عالم و دانش دور، ماہر سیاسیات اور باعمل صوفی صافی تھے۔ ان کے بعض عقائد و تصورات شدید اختلافی و انزائی ہیں لیکن ان کی فعال شخصیت کی کرشمہ سازیوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کو صوفیہ میں اس بنا پر خصوصی اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے شریعت و طریقت کی مطابقت قائم کی۔ شریعت کی پابندی کے بغیر طریقت کو لایقین قرار دیا۔ ان کے خانوادہ میں ان کے خلیفہ جانشین شاہ عبدالعزیز (م:۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء) نے شیعیت کی رد میں تحفۂ اثنا عشریہ لکھی اور تصوف سے شیعیت کو جدا کرنے کی مہم میں اپنی عمر صرف کردی۔

صوفیہ میں سلسلۂ قلندریہ کی اپنی انفرادی شناخت ہے جو اپنے چار ابرو کا صفایا کرتے ہیں کیونکہ ان کے موسس شیخ عبدالعزیز مکی کے بال کبرسنی سے جھڑ گئے تھے، لہٰذا پیر کے تتبع میں مریدین اپنے چہرے ان کے مماثل بناتے ہیں۔ اصطلاح 'قلندر' کی مختلف تعبیریں کی گئی ہیں مثلاً سریانی میں اللہ کے ناموں میں ہے، فارسی 'گل' سے ماخوذ ہے جس کے معنی پاک وصاف کے ہیں، 'کلاں تر' یعنی بزرگ ہے صوفی درجۂ کمال تک پہنچ جائے تو قلندر ہے۔ خواجہ سید اشرف جہاں گیر کا قول ہے کہ قلندر وہ ہے جو دنیا سے اپنے رشتے منقطعہ کرچکا اور ظاہری و باطنی طور پر بالکلیہ بے تعلق ہوگیا ہو۔ قلندر صرف خدا کا طالب ہوتا ہے اور دنیا و عقبیٰ کی ساری دلچسپیوں کو خیرباد کردیتا ہے۔ وہ نہ اس دنیا میں صلہ کا آرزومند ہوتا ہے اور نہ ثوابِ آخرت کا متمنی۔ وہ صرف خدا کا طالب ہوتا ہے اور بس! سلسلۂ قلندریہ کے وجود میں آنے کے اسباب میں ان صوفیہ کے خلاف ردعمل بھی تھا جو فقیری کے نام پر اپنے حلقہ اثر بناتے، خانقاہوں میں وراثت قائم کرتے ر ترک دنیا کی تعلیم دینے کے عوض میں نام آوری حاصل کرتے تھے وغیرہ۔ شاہ خضر رومی شیخ عبدالعزیز مکی کے شاگرد تھے، جو صحابیِ رسول تھے۔ شیخ عبدالعزیز بہ اجازت رسول اکرم جنگلوں میں چلے گئے تا کہ وہاں تنہائی میں یادِ الٰہی میں مصروف رہ سکیں۔ وہ حضرت علی کے دورِ خلافت میں جنگل سے لوٹے اور بعد بیعت دوبارہ جنگل کو لوٹ گئے، پھر خواجہ بایزید بسطامی سے بیعت کرنے کے لیے ظاہر ہوئے، پھر شاہ خضر رومی کی ہدایت کے لیے آئے اور اجودھن سے غیبت میں چلے گئے، اب امام مہدی کے ساتھ دوبارہ آئیں گے۔ تاریخ صوفیہ میں قلندر پہلی بار دمشق میں توجہ کا مرکز بنے، جن کے رہنما مصر کے اندلس عرب یوسف اور ساوا کے شیخ جمال الدین کہے جاتے ہیں۔ شیخ جمال الدین ہندوستان بھی آتے تھے، جن کو شیخ نصیر الدین چراغ دہلی مفتی اور چلتی پھرتی لائبریری

کہتے تھے ۔اس کے علاوہ قلندروں کے ایک حلقہ کے رہنما حسن الجوالقی تھے، جو ایرانی تھے لیکن انھوں نے مصر میں قلندروں کا مرکز قائم کیا تھا۔لیکن ہندوستان میں قلندروں کو شامل کر کے چشتیہ قلندریہ سلسلہ قائم کرنے کی روایت ۱۳ویں صدی سے شروع ہوتی ہے، جس کے بانی شاہ خضر رومی (م:۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء) ہیں۔شیخ عبد العزیز کی کشفی شخصیت سے قطع نظر شاہ خضر رومی تاریخی شخصیت ہیں۔بقول شیخ عبدالحق خضر رومی اپنے وطن مالوف اناتولیہ سے دہلی آئے اور شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے مرید ہوئے۔شیخ نے ان کو اپنا لباس برقرار رکھنے کی اجازت دی۔وہاں سے مشرقی یوپی میں سرہرپور (نزد جون پور) جا کر سید نجم الدین غوث الدھر کو اپنا خلیفہ و جانشین مقرر کیا اور وطن مالوف اناتولیہ میں وفات پائی۔

قلندریہ روایات کے مطابق شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی (م:۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء) شاہ خضر رومی یا سید نجم الدین میں کسی ایک کے شاگرد تھے، جو اپنے علم وفضل اور روحانی کشف وکرامات کے لیے مشہور ہیں ۔۱۴۵؎ حالانکہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی موت ایک قلندر کے بے رحم چھرے سے ہوئی تھی، لیکن قلندروں نے زیادہ تر سلسلہ چشتیہ ہی اختیار کیا۔سہروردیوں میں بھی قلندر ہوئے۔شیخ فخر الدین عراقی سہروردی قلندر تھے۔شیخ بہاء الدین زکریا قلندروں کو سخت ناپسند کرتے تھے کیونکہ جو بھی قلندر وارد ہندوستان ہوتا، پہلا نشانہ ان کی خانقاہ کو بناتا لیکن سہورن (سندھ) کے میر سید عثمان معروف بہ لال شہباز کو بیحد عزیز رکھتے تھے۔سید راجو قتال کے مریدین قلندر مرتضوی کہے جاتے ہیں، جو سہروردیہ ہوتے ہیں اور مشرقی اتر پردیش میں ان کے مراکز ہیں۔اسی طرح سہروردیہ قلندروں کی ایک جماعت رسولی کہلاتی ہے، جس کے بانی سید شاہ عبد الرسول ہیں۔بعض قلندر اپنا سلسلہ شیعی صوفی شیخ نور الدین شاہ نعمت اللہ ولی (م:۸۳۴ھ/۱۴۳۱ء) سے قائم کرتے ہیں۔ان کا عقیدہ ہے کہ شاہ نعمت اللہ ولی سلطان محمد غوری (م:۱۲۰۵ء) کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے اور جنگ میں شہید ہوئے۔ان کی مزار کرمان میں نہیں ہانسی میں ہے۔ایک جماعت حیدری بھی ہے، جس کے بانی ترکی صوفی حیدر تھے۔اس طرح قلندروں کی مختلف جماعتیں ہیں، کن کن کا نام لیا جائے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ جس خانقاہیت کے خلاف قلندر دمشق، ایران اور مصر سے آ کر ہندوستان میں ہنگامہ کرتے رہتے، جب ہندوستان سے ابھرے تو خانقاہیت میں جذب ہو گئے۔تحریک تصوف میں رنگ وآہنگ قلندروں کی بدولت پیدا ہوا۔

ہندوستانی صوفیہ میں مجاہدوں کا ذکر ضروری ہے، جنھوں نے راہ خدا میں جہاد بالسان سے زیادہ جہاد بالسیف کو اہمیت دی، ان میں سپہ سالار مسعود غازی (م:۴۲۴ھ/۱۰۳۳ء) جو بالے میاں یا غازی میاں کہلاتے ہیں۔مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں میں مقبول ہیں۔ان کا مزار مشرق اتر پردیش کے بہرائچ میں ہے۔سلطان محمود غزنوی کے بھانجے اور سپہ سالار کہے جاتے ہیں جنھوں نے راجہ مہی پال کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کرلیا تھا لیکن سلطان محمود غزنوی سے اپنی قرابت کا لحاظ کر کے اپنے نام کا خطبہ نہ پڑھوایا لیکن ان کا نام تاریخوں میں نہیں ملتا، ممکن ہے کہ شہزادہ نصیر الدین محمود (۶۶۔۱۲۴۶) کے ہمراہیوں میں رہے ہوں، جن کو بہرائچ میں قیام کے دوران مقامی ہندو راجاؤں سے جنگ کرنا پڑی تھی۔۱۴۷؎ بنگالی مجاہدوں میں سلہٹ کے شیخ جلال (م۔) ہیں، جو سلسلہ خواجگان کے صوفی تھے۔۱۴۸؎ راجہ گور گوبند سے جنگ ہوئی لیکن، شیخ جلال ہی فتح

جلال ہیں، جو سلسلہ خواجگان کے صوفی تھے۔ راجہ گور گوبند سے جنگ ہوئی لیکن، شیخ جلال ہی فتح یاب ہوئے۔ انھوں نے تمام مال و املاک اور زمین اپنے ساتھیوں میں تقسیم کردی۔ خود کچھ بھی نہیں لیا۔ شیخ جلال نے شادی نہیں کی تھی، اس لیے ان کا لقب ہی شیخ جلال مجرد ہو گیا۔

بنگلہ دیش کے چٹ گام سے ایک صوفی بزرگ کی مقبولیت داستان بن گئی ہے۔ ان کا نام شیخ بدر الدین یا پیر بدر عالم (م۔۲۲/دسمبر ۱۴۴۰ء) ہے، جن کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے۔ ان کے دادا خواجہ شہاب الدین حق نو تھے، جن کا ذکر گزشتہ سطروں میں آچکا ہے۔ شیخ بدر الدین کو روحانی تربیت ان کے والد اور شیخ جلال الدین بخاری سے حاصل ہوئی تھی۔ شیخ شرف الدین کی دعوت پر بہار گئے لیکن ان کے پہنچنے سے قبل ہی شیخ موصوف وفات پا چکے تھے۔ انھوں نے منیر پہنچ کر چالیس دنوں کا چلہ کیا، وہ جگہ ہنوز زیارت گاہ عام بنی ہوئی ہے۔ ان کے عقیدت مندوں میں ہندو اور بدھ شامل ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پیر بدر ایک چٹان کے ٹکڑے پر سوار ہو کر چٹگام آئے تھے، جو پانی میں تیر رہا تھا۔ اس سے پانی پر ان کا اختیار ثابت ہوتا ہے۔ مقامی ماہی گیر پانی کا سفر شروع کرنے سے قبل بڑے جوش میں گاتے ہیں:

अमरा अच्चौ पोलापन गाजी अच्चे निगहमन

श्री गंगादरिया पंचपीर बदर बदर बदर बदर

(ہم بچے ہیں اور غازی ہمارے محافظ ہیں۔ گنگا ندی ہماری ہے۔ اے پنج پیر، اے بدر، اے بدر)

بنگالیوں کے عقیدہ پنج پیر ہیں غازی میاں (سالار مسعود) زندہ غازی (شیخ عبد العزیز) خواجہ خضر اور پیر بدر! اسی طرح کی ایک شخصیت شاہ بدیع الدین قلب المدار بھی ہے۔ ان کا ذکر لطائف اشرفی میں موجود ہے۔ ان کی ذات سے کشف و کرامات کے کتنے قصے مشہور ہیں۔ شاہ مدار کا مزار مکن پور (اکبر پور، یوپی) میں ہے۔ ان سے صوفیہ کا ایک سلسلہ چلتا ہے، جن کو 'مداری' کہتے ہیں بے قائدہ و بے نوا۔ مداری درویش ذم مدار، کا نعرہ لگاتے ہوئے آگ پر چلتے ہیں! ان کا ایک سلسلہ گورکھپور (یو۔ پی) میں بھی ہے۔ وہاں مدریہ پہاڑی پر شاہ مدار کا میلہ لگتا ہے اور ایک طبقہ دھمال، ہے جہاں سے مداری ملنگوں کی ٹولی۔ دھمال، نکالتی ہے۔

صوفیہ ہند کا ذکر خواتین صوفیہ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا شیخ نظام الدین اولیا کہا کرتے تھے جب شیر جنگل سے برآمد ہوتا ہے تو کوئی اس کے جنس کے متعلق معلوم نہیں کرتا۔ اولاد آدم کو تقوی اور فرماں برداری کی راہ پر چلنا چاہئے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت! شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب میں خواتین صوفیہ پر ایک باب مخصوص کیا ہے، ان کے مطابق اولین خواتین میں سارہ بی بی کا نام لیا جا سکتا ہے، جو خواجہ بختیار کاکی کے ہم عصر ایک صوفی شیخ نظام الدین ابو المعید کی والدہ تھیں۔ بابا فرید کی والدہ کا ذکر آچکا ہے، جن کی تربیت سے بابا فرید روحانی مراتب کو پہنچے۔ اسی طرح کی خاتون خواجہ نظام الدین اولیا کی والدہ بھی تھیں۔ بابا فرید بڑی عقیدت سے دہلی کی بی بی فاطمہ سام کا ذکر کرتے تھے، جو ان کو اپنا بھائی سمجھتی تھیں۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے بھی بی بی فاطمہ کا ذکر کیا ہے، جو تقدس، ترک دنیا اور عبادت میں نادر روزگار تھیں۔ کشمیر میں تصوف کا بیان للا عارفہ کے بغیر ممکن نہیں۔ کشمیر کی دیگر خواتین صوفیہ کا ذکر سلسلہ ریشیاں میں کیا جا چکا ہے۔

اس بیان کو ختم کرنے سے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اہل تشیع میں تصوف کو دوبارہ قائم کرنے

ہو گئے۔ سلسلہ نوربخش کے بانی علاء الدین محمد نوربخش (م ۱۴۶۴ء) شیعیت کے سخت خلاف تھے لیکن ان کے فرزند سید قاسم فیض بخش (م۔۱۵۱۱) شیعہ ہو گئے۔ اس سلسلہ کے قاضی نوراللہ شوشتری کو ہندوستانی شیعہ 'شہید ثالث' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

حواشی

۱۔ فصلنامہ راہ اسلام: شمارہ ۱۸۲، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۱ء
۲۔ محمد ہندو شاہ فرشتہ: گلشن ابراہیمی ج ا ص ۵۶۹
۳۔ سید علی ہجویری: کشف المحجوب (اردو ترجمہ محمد الطاف نیروی) ص ۲۰۸ (دہلی ۱۹۹۲ء)
۴۔ شاہ ملک: گلزار شمس معروف بہ کنزالانساب صص ۸۱۔۷۹
۵۔ سید فرمان علی: ترجمہ کلام الٰہی ص ص ۱۶۶۔۱۵۶۵
۶۔ ترجمہ کلام الٰہی ص ۹۵۸
۷۔ سید علی ہمدانی: مودۃ القربیٰ ص ۴۳ (اردو ترجمہ زاد العقبی سید شریف حسین سبزواری) مع عربی متن لاہور سے شایع ہوا۔ اس کی طبع دوم راقم السطور کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔
۸۔ محمد جمال قوام: قوام العقائد (اردو ترجمہ نثار احمد فاروقی) صص ۱۰۶۔۱۰۵ (دہلی ۱۹۹۴ء)
سید محمد حسینی: جوامع الکلم ج ا صص ۲۸۔۲۷ کان پور ۱۹۳۷ء)
۹۔ سعید نفیسی: سرچشمہ تصوف در ایران ص ۱۲۹ (کتاب فروشی مہر ماہ ۱۳۴۶ ھ ش)
۱۰۔ سخاوت مرزا: تذکرہ ص ۲۷ (حیدر آباد ۱۹۶۲ء)
۱۱۔ شاہنواز خان: ماثر الامرا (مرتبہ غلام علی آزاد بلگرامی) ج ۴ ص ۴۴۸
۱۲۔ مودۃ القربیٰ صص ۸۱۔۸۵
۱۳۔ کبیر احمد جائسی: ایرانی تصوف ص ۲۱۱ (علی گڑھ ۱۹۹۳ء)
۱۴۔ Birge, John Kingley : The Bektashi Order of Dervishes p236 (London 1937)
۱۵۔ Moojan Momem : An Introduction to Shi'i Islam p 210 (Delhi 1985)
۱۶۔ شیخ فریدالدین عطار: تذکرۃ الاولیاء (اردو ترجمہ طفیل احمد جالندھری) (دہلی ۱۹۹۶ء)
شیخ عبدالحق: اخبار الاخیار، اردو ترجمہ، محمد فاضل (دہلی سن ندارد)
محمد مجتبیٰ حسین: قرۃ العین، مخطوطہ مملوکہ وسیم حسن احمد، ایڈوکیٹ، ملاواں بزرگ، ضلع الہ آباد
سید خیرات حسن: تنویر الانساب، مخطوطہ مملوکہ راقم
موسیٰ منظور حسین: السلاسل والانسانید کتبہ محمد ایوب ابدالی مخطوطہ مملوکہ پروفیسر سید محمد طیب ابدالی، گیا
محمد غوثی (شیخ محمد شطاری): تذکرہ گلزار ابرار، مخطوطہ، سنٹرل لائبریری، حیدر آباد
وجیہ الدین کاکوروی: بحر ذخار، مخطوطہ، سنٹرل لائبریری، حیدر آباد
احمد السدعو یہ بھائی یعقوب: خزانہ جلالی، مخطوطہ، سنٹرل لائبریری، حیدر آباد
ضیاء العباسی: خزانہ جواہر جلالی، مخطوطہ، سنٹرل لائبریری، حیدر آباد
دارا شکوہ: سفینۃ الاولیاء، مخطوطہ، سنٹرل لائبریری، حیدر آباد
شاہ تقی الدین: منبع الانساب، مخطوطہ، سنٹرل لائبریری، حیدر آباد
شاہ علی اکبر: مجمع الاولیاء، مخطوطہ، سالار جنگ لائبریری، حیدر آباد

شاہ علی اکبر: مجمع الاولیاء، مخطوطہ، سالار جنگ لائبریری، حیدرآباد
امام بیگ: ثمرات القدس من شجرات الانس، مخطوطہ، سالار جنگ لائبریری، حیدرآباد
سید صدیق حسن: الفرع النامی فی اصل السامی (بھوپال ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء)
غلام سرور لاہوری: تذکرہ خزینۃ الاصفیاء (لکھنؤ ۱۸۷۳ء)
سید امام الدین احمد: تاریخ الاولیاء (بمبئی ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء)
شیخ مبارک کرمانی: سیر الاولیاء (۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء)
جمالی: سیر العارفین (۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء)
سید غوث محی الدین رضوی: شرف الانساب (حیدرآباد ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء)
نسب نامہ سادات، مخطوطہ، سنٹرل لائبریری، حیدرآباد
ضیاء اللہ: نسب نامہ کلاں (لاہور ۱۳۰۹ھ/۱۸۶۱ء)
خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت (دہلی ۱۹۸۴ء)
موج کوثر: شیخ محمد اکرام (لاہور ۱۹۸۸ء)
محمد طیب ابدالی: الشرف (نالندہ ۱۹۸۰ء)
اختر مہدی: شاہ محمد اجمل الہ آبادی وادب فارسی (دہلی ۱۹۹۲ء)
سید صباح الدین عبدالرحمٰن: بزم صوفیہ ص ۱۸۷ (اعظم گڑھ ۱۹۸۹ء)

۱۸۔ آیت اللہ شہید مطہری: اسلامی علوم کا تعارف (اردو ترجمہ: محمد عسکری) ص ۲۵۷ (دہلی ۱۴۱۷ھ)
۱۹۔ ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینی: الکافی: کتاب المعیشہ
۲۰۔ راغب الطباخ: تاریخ افکار وعلوم اسلامی (اردو ترجمہ افتخار احمد بلخی) ج ۲ ص ۱۵۲ (دہلی ۱۹۹۸ء)
۲۱۔ محمد قاسم غنی: تاریخ تصوف در اسلام ص ۱۹ (چاپ تہران)
۲۲۔ آیت اللہ مطہری: اسلامی علوم کا تعارف ص ۲۶۲
۲۳۔ تاریخ تصوف در اسلام ص ۵۵
۲۴۔ ابوعبدالرحمٰن سلمی: طبقات الصوفیہ ص ۲۰۶ (چاپ تہران)
۲۴۔ Saiyed Athar Abbas Rizvi : A Socio- Intellectual History of the Isna Ashari Shi'is in India vol. I p199 (New Delhi1986)
۲۵۔ اخبار الاخیار ص ۲۰۳
۲۶۔ امیر حسن سجزی: فوائد الفواد ص ۳۹ (بلند شہر ۱۸۵۵ء)
۲۷۔ شیخ ابوالفضل علامی: آئین اکبری ج ۳ ص ۱۶۸ (لکھنؤ ۱۸۹۳ء)
۲۸۔ جمالی کنبوہ دہلی سیر العارفین ص ۷ (دہلی ۱۸۹۳ء)
۲۹۔ فوائد الفواد ص ۲۹، سیر الاولیا ص ص ۸۔۱۷
۳۰۔ خلیق احمد نظامی: خیر المجالس ص ۸ (علی گڑھ ۱۹۵۹ء)
۳۱۔ احمد اللہ مصطفوی: نزہت القلوب ص ۱۵۲ (tr. G.Le Strange)
۳۲۔ Saiyid Athar Abbas Rizvi: A History of Sufism in India vol I p114.
۳۳۔ غلام علی آزاد: ماثر الکرام ص ۷
۳۴۔ آئین اکبری ج ۳ ص ۱۶۸
۳۵۔ جمالی کنبوہ دہلوی: سیر العارفین ص ص ۷۔۲

۳۷ اخبار الاخیار ص ۲۳ آئین اکبری ج ۳ ص ۱۶۸

۳۸ History of Sufism in India vol I p146

۳۹ سرور الصدور ص ۲۲۶

۴۰ حمید قلندر: خیر المجالس ص ص ۱۰۸۔۱۰۷

۴۱ امیر خورد: سیر الاولیاء ص ص ۵۵۔۵۴

۴۲ ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۱

۴۳ ایضاً ایضاً ص ۳۳۳

۴۴ امیر خسرو: تغلق نامہ ص ۱۶ (حیدر آباد ۱۹۳۳ء)

۴۵ History of Sufism in India vol I p 251

۴۶ سید علی طباطبائی: برہان مآثر ص ص ۴۸۰۔۴۳، ۵۶ (دہلی ۱۹۳۶ء)

۴۷ منہاج سراج: طبقات ناصری ص ۱۵۲ (کلکتہ ۱۸۶۳ء)

۴۸ History of Sufism in India vol I p p 70-266

۴۹ فوائد الفواد ص ص ۲۳۶۔۲۷

۵۰ تاریخ فیروز شاہی صص ۴۰۔۴۱، (مترجمہ اطہر عباس رضوی، علی گڑھ ۱۹۵۶ء)

۵۱ M.A. Rahman: Social and Cultural History of Bengal I p99 (Karachi 1963)

۵۲ Rajatarangini of Kalhana(Tr. M. A. Sterin) .p 573 (Delhi 1991)

۵۳ فوائد الفواد ص ۲۱۶

۵۴ داؤد دخاکی: دستور السالکین ص ص ۷۔۶۵ (سری نگر ۱۹۳۷ء)

۵۵ عبد الرحمن جامی: کتاب نفحات الانس ص ۴

۵۶ J. N. Ganhar & P.N. Ganhar: Buthusin in kslmir and hadakh p 15.

۵۷ حامدی کشمیری: شیخ العالم حیات اور شاعری ص ۹۳ (سری نگر ۱۹۹۸ء)

۵۸ محمد اسد اللہ وانی: شیخ العالم، ایک مطالعہ صص ۱۱۹۔۸۷

۵۹ حمید قلندر: خیر المجالس صص ۲۰۳۔۲۰۲

۶۰ شیخ شعیب: مناقب الآصفیہ صص ۴۰۔۳۳۹ (لکھنؤ ۱۸۷۰ء)

۶۱ مخدوم شاہ شعیب: مناقب الاصفیاء (مخطوطہ) مملوکہ پروفیسر طبیب ابدالی (گیا)

۶۲ Aziz Ahmad :An Intellectual History of Islam in India p 36 (Edinburgh,1965)

۶۳ A.J.Arberry :An Introduction to the History of Sufism p 124 (Oxford,1942)

♦♦♦

امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ
مودۃ القربیٰ

(سریال۔۱)

امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانیؒ کی مشہور و معروف کتاب مودۃ القربیٰ ان احادیث رسولؐ کا مجموعہ ہے جن کو مودت و محبت اہل بیتِ اطہار کے بیان میں اساسی اہمیت حاصل ہے۔ مودۃ القربیٰ کمیاب ہی نہیں نایاب ہے۔ ہمیں اس کا نادر نسخہ پروفیسر سید جعفر رضا کے ذاتی ذخیرہ کتب سے فراہم ہوا، جس کے لیے ادارہ موصوف کا شکر گذار ہے۔ اس نادر نسخہ میں اصل عربی عبارت کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی درج ہے۔ مترجم مولانا سید شریف حسین سبزواری ہیں۔ اردو ترجمہ "زاد عقبیٰ مع نسخہ صحیحہ مودۃ القربیٰ" امامیہ کتب خانہ لاہور سے شائع ہوا۔ سن طباعت درج نہیں، البتہ قرائن سے ایک صدی قبل کا معلوم ہوتا ہے۔ دوسری اشاعت میں مقیم پنجاب مرزا احمد علی امرتسری کا مقدمہ شامل ہے۔

[ادارہ]

دیباچہ مصنف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللّٰہ ما انعمنی اولی النّعم والھمنی الی مودۃِ حبیبه جامع الفضائل والکرم الذی بعث رسولا الی کافة الامم محمد ن الامی العربی صلی اللّٰہ علیه و سلم و بعد فقد قا ل اللّٰہ تعالی قل لا اسئلکم علیه اجرا الا المودّة فی القربی و قال رسول ا للّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم احبو اللّٰہ لما ارفد کم من نعمة و احبونی لحب اللّٰہ و احبو اهل بیتی لحبی ۔ فلما کان مودة آل النبی مسئولا عنها حیث امر اللّٰہ تعالیٰ لحبیبه العربی بان لا یسئل عن قومه سوی المودة فی القربی ۔ و انّ ذالك سبب النجاة

للمحبين و موجب وصولهم اليه و الى اله عليهم السلام كما قال النبی من احب قوما حشر فی زمرتهم و ايضا قال عليه السلام المرء مع من احب يوجب علی من طلب طريق الوصول و منهج القبول محبه الرسول و مودة اهل بيت البتول و هذا لا يحصل الا بمعرفته فضائل اله عليه السلام و هی موقوفة علی معرفة ما ورد فيهم من اخباره عليه السلام و لقد جمعت الاخيار فی فضائل العلماء والفقهاء اربعينات كثيرة و لم يجمع فی فضائل اهل البيت الا قليلا فلذا و انا الفقير الجانی سيد علی ابن شهاب الدين العلوی الهمدانی اردت ان اجمع فی جواهر اخباره ولا لی اثاره مما ورد فيهم مختصر موسوما بكتاب المودة فی القربی تبركا بالكلام القديم كما فی ما مو كی ان يجعل الله ذالك وسيلتی اليهم و نجاتی بهم و طويته علی اربعة عشره مودة والله يعصمنی من الخبط والخلل فی القول والعمل و لم يحول قلمی الی مالم ينقل بحق محمد و من اتبعه من اصحاب الدول

ترجمہ اردو: میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں۔ جو نہایت رحم کرنے والا۔ اور بہت مہربان ہے۔ تمام حمد و ثنا خاص اللہ ہی کو سزاوار ہے۔ کہ اس نے مجھ کو تمام نعمتوں سے بہتر نعمت عطا فرمائی۔ اور اپنے حبیب (جو تمام فضائل و کرامات کا جامع ہے اور جس کو خدا نے تمام امتوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا) محمدؐ امی عربی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی محبت میرے دل میں ڈالی۔

امابعد ! اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے قل لا اسئلكم عليه اجراً. اشعری سے روایت ہے۔ کہ رسول خداؐ نے فرمایا۔ میں احمد ہوں۔ اور میں محمدؐ ہوں اور میں حاشر (اپنی امت کے لوگوں کو اپنے پیچھے جمع کرنے والا) ہوں۔ اور میں عاقب (یعنی سب پیغمبروں کے بعد آنے والا) ہوں۔ اور میں مقفی یعنی سب پیغمبروں سے پیچھے دنیا میں آنے والا اور پیغمبر رحمت ہوں۔ اور جہاد کرنے والا نبی ہوں۔

۲۔ و عن ابی الطفيل عامر بن واثلة قال قال رسول الله انا محمدؐ و انا احمدؐ والفاتح والخاتم و ابوالقاسم والحاشر والعاقب و طٰه و يٰس و المحی اور ابو طفیل عامر بن واثلہ سے مروی ہے۔ کہ جناب رسول خداؐ نے فرمایا ہے۔ کہ میں محمدؐ ہوں اور میں احمدؐ ہوں۔ اور

فاتح یعنی فتح کرنے والا۔ اور خاتم یعنی ختم نبوت کرنیوالا اور ابوالقاسمؑ اور حاشر اور عاقب اور طہ (طاہر) اور یٰس اور ماحی یعنی کفر و آثار کفر کو مٹانے والا ہوں

۴۔ و عن ابی سعید خدری قال قال رسوؐل اللّٰہ انا النبی ولا کذب انا ابن عبدالمطلب انا اعرب العرب ولدت فی قریش و نشأت فی بنی سیعد اور ابو سعید خدری سے روایت ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ میں پیغمبر خدا ہوں۔ اور اس میں ذرا جھوٹ نہیں ہے۔ میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔ میں تمام عرب سے زیادہ تر فصیح زبان رسول ہوں۔ میں قبیلہ قریش میں پیدا ہوا۔ اور قبیلہ بنی سعد میں میں نے پرورش پائی۔

۵۔ و عن واثلہ بن اسقع قال قال رسوؐل اللّٰہ ان اللّٰہ اصطفیٰ کنانۃ من ولد اسمعیلؑ و اصطفی قریشا من کنانۃ واصطفی من بنی قریش بنی ہاشم واصطفانی من بنی ہاشم و روی ان اللّٰہ تعـ اصطفی من ابراھیمؑ اسمعیلؑ و اصطفی من ولد اسمعیلؑ بنی کنانۃ الخـ اور واثلہ بن اسقع سے مروی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد اسمعیلؑ میں سے بنی کنانہ کو منتخب کیا۔ اور بنی کنانہ میں سے قریش کو۔ اور قریش میں سے بنی ہاشم کو۔ اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو منتخب کیا۔ دوسری روایت کے موافق ترجمہ۔ اولاد ابراہیمؑ میں سے اسمعیلؑ کو منتخب کیا۔ اور اولاد اسمعیلؑ میں سے ...... الخ

۶۔ و عن ابی ہریرۃ قال قال رسولؐ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ اٰلہ و سلم انا سید ولد آدمؑ یوم القیامۃ و اول من ینشق عنہ القبر و اول شافع و اول مشفع ۔ اور ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ کہ میں قیامت کے دن اولاد آدمؑ کا سردار ہوں گا۔ اور میں وہ شخص ہوں جس کی قبر سب سے پہلے شق ہو گی۔ اور میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں۔ اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہو گی۔

۷۔ و عنہ قال قال رسولؐ اللّٰہ نحن الاخرون من الدنیا والاولون یوم القیامۃ المقضی بھم قبل الخلائق نیز ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ کہ حضرتؐ نے فرمایا ہے۔ کہ ہم دنیا میں سب (پیغمبروں) سے پیچھے آنے والا ہیں۔ اور قیامت کے دن سب سے اول ہوں گے۔ کہ تمام مخلوق

سے پہلے ہمارا حساب فیصل کیا جائے گا (یعنی سب سے پہلے ہم جنت میں جائیں گے)

۸۔ و عن انسؓ قال قال رسولؐ الله انا اکثر الانبیاء اتباعا یوم القیامة وانا اول من یقرع باب الجنة فاستفتح فیقرل الخازن من انت فاقول انا محمدؐ فیقول بك امرت ان لا افتح احدا قبلك ۔ اور انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن میرے پیرو سب پیغمبروں کے پیروؤں سے زیادہ تر ہوں گے۔ اور میں ہی سب سے پہلے جنت کے دروازے کو کھٹکھٹاؤں گا۔ اور دروازہ کھولنے کی درخواست کروں گا۔ تب خازن جنت کہے گا تو کون ہے۔ میں جواب دونگا۔ کہ میں محمدؐ ہوں۔ تب وہ کہے گا۔ کہ مجھ کو تیرے ہی سبب حکم دیا گیا ہے۔ کہ تجھ سے پہلے کسی کے واسطے جنت کا دروازہ کھولوں۔

۹۔ و عن عائشة قالت قال رسولؐ الله انا سید ولد آدم ولا فخر اور عائشہ سے روایت ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔ کہ میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور میں فخر نہیں کرتا۔

۱۰۔ و عن عرفجة قال قال رسولؐ الله انا سیف الاسام او سابق الاسلام اور عرفجہ سے مروی ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ میں اسلام کی تلوار ہوں یا بروایت دیگر میں سب سے پہلے اسلام لانے والا ہوں۔

۱۱۔ و عن ابی هریرة قال قال رسولؐ الله بعثت بجوا مع الکل و نصرت بالرعب ۔ اور ابوہریرہ سے روایت ہے۔ کہ جناب رسولؐ خدا نے فرمایا۔ کہ میں جوامع الکلم یعنی قرآن شریف کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں۔ اور رعب سے مجھ کو مدد دی گئی ہے۔

۱۲۔ و عن انس قال قال رسولؐ الله انا سابق ولد آدم۔ اور انس سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ میں بنی آدمؑ میں سب سے سابق (پہلا) ہوں۔

۱۳۔ و عن ابی سعید الخدری قال قال رسولؐ الله انا معاشر الانبیاء یضاعف لنا البلاد کما یضاعف لنا الاجر کان نبئ من الانبیاء یبتلی بالقتل حتیٰ یقتل و انهم کانوا یفرحون بالبلاء کمات فرحون بالرخاء اور ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے۔ کہ جناب رسول خداؐ نے فرمایا۔ کہ ہم پیغمبروں کے گروہ کے لئے بلائیں مضاعف (دوچند) ہوتی ہیں۔ جیسا کہ اجر

وثواب ہمارے لئے مضاعف ہوتا ہے۔اور بعض پیغمبر قتل کی بلا میں مبتلا ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ قتل کئے جاتے تھے۔اور وہ (پیغمبر) بلاؤں لیے ایسے خوش ہوتے تھے۔ جیسے تم لوگ خوشی اور فارغبالی سے خوش ہوتے ہو۔

۱۴۔ و عن ابی ھریرۃ قال قال رسولؐ اللہ انا معا الانبیاء لا نشھد علی جور و لو کنت مفضلا احدا علی احد لا ثرت بالبنات بضعفھن و قلۃ حیلتھن۔اور ابوہریرہ سے روایت ہے۔کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے۔کہ ہم پیغمبروں کا گروہ ظلم و ستم پر گواہی نہیں دیتا۔اور اگر میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دینے والا ہوتا۔ تو میں لڑکیوں کو ان کے ضعف اور کمی حیلہ و تدبیر کے باعث ترجیح دیتا۔

۱۵۔ وعن عائشۃقالت قال رسولؐ اللہ انی اعرفکم باللہ واشدکم خشیۃ ۔ اور عائشہ سے روایت ہے۔کہ جناب رسولؐ خدا نے فرمایا ہے۔کہ میں تم سب سے بڑھ کر خدا کا پہچاننے والا اور تم سب سے زیادہ اس سے خوف کرنیوالا ہوں۔

۱۶۔ و عن ابی ھریرۃ قال قالوا یا رسولؐ متی وجبت لك النبوۃ قال وجبت لی و آدمؑ بین الروح والجسد. اور ابوہریرہ سے روایت ہے۔کہ اصحاب نے عرض کی۔یارسولؐ اللہ نبوت آپ کے لئے کب لازم کی گئی تھی۔فرمایا۔اس وقت لازم کی گئی تھی۔جب کہ آدمؑ روح اور بدن کے درمیان تھے (یعنی ابھی روح بدن میں داخل نہ ہوئی تھی۔)

۱۷۔ و عن جابر قال قال رسولؐ اللہ ان اللہ بعثنی بتمام محاسن الاخلاق و کمال محاسن الافعال . اور جابر انصاریؓ سے مروی ہے۔کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو تمام پسندیدہ اخلاق اور سب نیک افعال سے کامل کر کے مبعوث کیا ہے۔

۱۸۔ و عن ابی ھریرۃ قال قال رسولؐ اللہ انی رأیت الانبیاء فانا نبیہ ابراھیمؑ ۔اور ابوہریرہ سے روایت ہے کہ جناب رسولخداؐ نے فرمایا ہے۔کہ میں نے سب پیغمبروں کو دیکھا۔پس میں ابراہیم علیہ السلام کے مشابہ ہوں۔

۱۹۔ و عن جابر قال قال رسولؐ اللہ اتخذ اللہ ابراھیمؑ خلیلا و موسی نجیا وتخذ

نی حبیبا ثم قال و عزتی و جلالی لاو ثرن حبیبی علی خلیلی و نجی" جابر انصاری "سے روایت ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل مقرر کیا۔ اور حضرت موسیٰ" کو اپنا نجی یعنی راز دار۔ اور مجھ کو اپنا حبیب بنایا۔ پھر ارشاد فرمایا۔ کہ مجھ کو اپنی عزت و جلالت کی قسم ہے۔ کہ میں اپنے حبیب کو اپنے خلیل اور نجی پر ضرور ترجیح دوں گا۔

۲۰۔ و عن امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب عن رسول" اللہ انه قال خرجت من نکاح و لم اخرج من سفاح الجاهلیة من لدن آدمؑ الیٰ ان ولد نی ابی و امی و لم یصیبنی من سفاح الجاهلیة شیئٌ اور امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے روایت کی ہے۔ کہ رسولؐ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں نکاح سے پیدا ہوا ہوں۔ اور زمانہ جاہلیت کی زنا سے پیدا نہیں ہوا۔ آدمؑ سے لے کر اس وقت تک کہ میں اپنے باپ اور ماں کے ہاں پیدا ہوا۔ اور زمانہ جاہلیت کی زناکاری ذرا بھر بھی مجھ کو نہیں پہنچی۔

۲۱۔ و عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ فضلت علی الانبیاء بستۃٍ اعطیت بجوامع الکلم و نصرت بالرعب و احلت لی الانعام و جعلت لی الارض مسجدا و طهورا و ارسلت الی الخلق کافة و ختم بی النبوة۔ اور ابو ہریرہ سے روایت ہے۔ کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے۔ کہ مجھ کو چھ چیزوں سے تمام پیغمبروں پر فضیلت دی گئی ہے۔ مجھ کو جوامع الکلم یعنی قرآن عطا ہوا۔ اور رعب سے مدد دی گئی۔ اور چوپائے میرے لئے حلال کئے گئے۔ اور زمین میرے لئے مسجد اور طاہر کرنے والی مقرر کی گئی۔ اور مجھ کو تمام مخلوق کا پیغمبر بنا کر بھیجا گیا۔ اور مجھ پر نبوت ختم ہوئی۔

۲۲۔ و عن انس قال قال رسولؐ اللہ فضلت علی الناس باربع بالسخاء والشجاعة وکثرة الجماع وشدة العطش ۔ اور انس سے روایت ہے کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے۔ کہ مجھ کو چار باتوں میں سب آدمیوں پر فضیلت دی گئی ہے۔ ۱۔ سخاوت میں ۲۔ شجاعت میں ۳۔ کثرت جماع میں ۴۔ سختی سے حملہ کرنے میں۔

۲۳۔ و عن ابن عباس" قال جلس ناس من اصحاب رسولؐ اللہ و قد سمعهم یتذکرون قال بعضهم ان اللہ اتخذ ابراهیمؑ خلیلا و قال اٰخر فموسی کلم اللہ تکلیما

۲۵۔ و عن عائشة قالت قال رسولؐ اللہ بنیت اجسامنا علی ارواح اهل الجنت و امرت الارض ما کان منا ان تبتلعه اور عائشہ سے مروی ہے۔ کہ جناب رسالتمآب نے فرمایا ہے۔ کہ ہمارے جسم بہشتیوں کی روحوں پر بنائے گئے ہیں۔ اور زمین کو حکم دیا گیا ہے۔ کہ جو (بول و براز) ہم سے خارج ہو۔ اس کو نگل جایا کرے۔

۲۶۔ و عن انس قال لم یکم رسولؐ اللہ فحاشا و لا سبابا اور انس سے روایت ہے۔ کہ جناب رسولؐ خدا بدکلامی نہ کرتے تھے۔ اور نہ (بے وجہ) لعنت کرتے تھے۔ نہ گالی دیتے تھے۔

۲۷۔ و عن ابی هریرة قال قیل لرسول اللہ ادع علی المشرکین فقال ما بعثت لعانا و انما بعثت رحمة ابوہریرہ سے مروی ہے۔ کہ کسی نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی۔ کہ یا رسولؐ اللہ مشرکوں کے لئے بددعا کیجئے۔ فرمایا۔ میں لعنت کرنے کے لئے مبعوث نہیں ہوا۔ بلکہ فقط رحمت کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔

۲۸۔ و عن انس قال کانت امة من اماء اهل المدینة تاخذ بید رسولؐ اللہفنتطلق به حیث شاء ت و سئلت ۔اور انس سے روایت ہے۔ کہ اہل مدینہ کی کوئی کنیز آتی تھی۔ اور آنحضرتؐ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتی تھی۔ جاتی تھی۔ (یعنی آنحضرتؐ نہایت خلیق اور حلیم تھے)۔

۲۹۔ وعن عائشة قالت ما کان رسولؐ اللہ یضع فی بیته کان یکون مهنة اهله . اور عائشہ سے مروی ہے۔ کہ رسولؐ خدا جو چیز اپنے گھر میں بناتے تھے۔ وہ آپ کے گھر والوں کے استعمال میں آتی تھی۔

۳۰۔ و عنها قالت ما خیر رسولؐ اللہ بین امرین قط الا اخذ الیسر هما ما لم یکن اثما فان کان اثما کان ابعد الناس منه و ما انتقم رسولؐ اللہ لنفسه فی شیئٍ قط الا ان ینتهك حرمة اللہ فینتقم للہ بها و قالت ما ضرب ۔ رسولؐ اللہ شیئاً قط بید ہ و لا امرأة و لا خادما الا ان یجاهد فی سبیل اللہ. عائشہ سے مروی ہے۔ کہ جب کبھی آنحضرت کو دو کاموں میں سے کسی ایک کام کرنے کو پسند کرنے کا اختیار دیا جاتا تھا۔ تو آپ دونوں میں سے زیادہ تر آسان اور سہل کام کو اختیار فرماتے تھے۔ جب کہ اس کام کا کرنا گناہ نہ ہو۔ اور اگر گناہ ہوتا۔ تو آپ

و قال أخر فعیسیٰ کلمة الله و روحه و قال أخر أدمؑ اصطفاہ الله فخرج (صلی الله علیه و سلم) و سلم و قال سمعت کلامکم و عجبکم ان ابراهیمؑ خلیل الله و هو کذالك و موسیٰ نجی الله و هو کذالك الا و انا حبیب الله ولا فخر و انا صاحب لواء لحمد یوم القیامة تحته أدمؑ و من دونه ولا فخر و انا اول شافع و اول مشفع یوم القیاۃ و لا فخر و اول من یحرك باب الجنة فیفتح الله لی فادخلها و معی فقراء المومنین ولا فخر و انا اکرم الاولین والآخرین علی الله و لا فخر ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ کہ اصحاب رسولؐ خدا کی ایک جماعت بیٹھی تھی۔ اور آنحضرتؐ نے ان کو باتیں کرتے سنا۔ ایک نے کہا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا اور دوسرے نے کہا۔ کہ حضرت موسیٰ سے خدا ہمکلام ہوا۔ اور ایک بولا۔ کہ عیسیٰ کلمہ خدا اور اس کی روح ہے۔ ایک اور نے کہا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو منتخب کیا۔ اصحاب کی یہ باتیں سن کر حضرتؐ باہر تشریف لائے۔ اور ان کو سلام کیا۔ اور فرمایا اے صحابہ۔ میں نے تمہاری گفتگو اور تمہارا متعجب ہونا سنا۔ کہ ابراہیمؑ خلیل خدا ہیں اور وہ بیشک ایسے ہی ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام سے خدا نے کلام کیا۔ یعنی وہ خدا کے رازداں ہیں۔ اور بیشک اسی طرح ہے۔ اور عیسیٰ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں۔ اور ایسا ہی ہے۔ اور آدمؑ کو خدا نے منتخب کیا۔ اور ایسا ہی ہے۔ اے صحابہ آگاہ ہو۔ میں حبیب خدا ہوں۔ اور میں فخر نہیں کرتا۔ اور قیامت کے دن علم حمد کا مالک ہوں گا۔ جس کے نیچے آدم علیہ السلام اور دیگر پیغمبر ہوں گے۔ اور میں فخر نہیں کرتا۔ اور میں وہ شخص ہوں۔ جو قیامت کے دن سب سے پہلے شفاعت کریگا۔ اور جس کی شفاعت سب سے پہلے قبول ہوگی۔ اور میں فخر نہیں کرتا۔ اور میں وہ شخص ہوں جو سب سے پہلے جنت کا دروازہ ہلائے گا۔ اور اللہ میرے لئے اس کو کھول دیگا۔ تب میں اس میں داخل ہوں گا۔ اور میرے ساتھ محتاج مومنین ہوں گے۔ اور میں فخر نہیں کرتا۔

۲۴۔ و عن سلطان الاولیاء علی علیه السلام قال قال رسولؐ الله: انا اهل البیت فقد اذهب الله عنا الفواحش ما ظهر منها و ما بطن ۔ اور سلطان اولیاء علیؑ سے روایت ہے۔ کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے۔ کہ ہم اہلبیت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ظاہری اور باطنی فواحش اور قبائح کو ہم سے دور کر دیا ہے۔

سب لوگوں سے زیادہ اس کام سے بچتے اور پرہیز کرتے تھے۔اور حضرتؐ نے اپنے نفس کی خاطر کبھی کسی معاملے میں کسی شخص سے بدلا نہیں لیا۔ مگر ہاں جب کوئی حرمت خدا کی ہتک کرتا۔ تو خدا کے واسطے اس ہتک حرمت کے عوض میں اس سے بدلا لیتے تھے نیز عائشہ بیان کرتی ہیں کہ آنحضرتؐ نے اپنے ہاتھ سے نہ تو کبھی کسی عورت کو مارا۔ اور نہ کسی خدمتگار کو۔ سوا اس وقت کے جب کہ راہ خدا میں جہاد کرتے تھے۔

۳۱۔ و عن انس قال كان رسولؐ الله اذا صافح الرجل لا ينزع يده حتى يكون هو الذى يصرف وجهه و لم يترك مقدما ركبتيه بين يدى من جلس له اور انس سے روایت ہے۔ و رسولؐ خدا جب کسی شخص سے مصافحہ کرتے تھے۔ تو اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے جدا نہ کرتے تھے جب تک کہ وہ شخص اپنا رخ نہ پھیر لیتا تھا۔ اور کبھی کسی ہمنشین کے آگے گھٹنے بڑھا کر نہیں بیٹھے۔

۳۲۔ و عن عائشه قالت ان رسولؐ الله ما كان يدخر شيئاً لغو بی بی عائشہ فرماتی ہیں۔ کہ جناب رسالت مآبؐ اگلے روز (کل) کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھتے تھے۔

۳٤۔ و عن عبدالله بن الحارث قال ما رايت احدا اكثر تبسما من رسولؐ الله اور عبداللہ بن حارث بن حر نے روایت کی ہے۔ کہ میں نے آنحضرتؐ سے زیادہ کسی کو مسکرانے والا نہیں دیکھا۔

۳٤۔ و عن عبدا لله بن سلام قال كان رسول الله اذا جلس يحدث بكثير ان يرفع طرفه الى السماء اور عبداللہ بن سلام سے روایت ہے۔ کہ رسولؐ خدا جب بیٹھتے تھے۔ تو بات کرنے میں اپنی آنکھ اکثر آسمان کی طرف اٹھائے رکھتے تھے۔

۳۵۔ و عن عكرمة عن ابن عباسؓ قال بعث رسولؐ الله لا ربعين سنة مكث بمكة ثلث عشر سنة بعد ما يوحىٰ اليه ثم امر بالهجرة فهاجر الى المدينة فمكث بها و بعد عشر سنين مات و هو ابن ثلث و ستين سنة صلى الله و آله و سلم اور عکرمہ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ کہ جناب رسولؐ خدا چالیس سال کی عمر میں پیغمبری پر مبعوث ہوئے۔ اور وحی

نازل ہونے کے بعد تیرہ برس مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ پھر خدا کی طرف سے ہجرت کرنے کا حکم ہوا۔ اور حضرتؐ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ اور دس برس وہاں رہے۔ اور تریسٹھ برس کے سن میں اس عالم فانی سے رحلت فرمائی۔ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

قال المصنف ۔ اعلم یا اخی ان فضائل رسوؐ الله اکثر من ان یحصی او یعد و ما ذکر کان اقل من القلیل والله مرفق بمودة علے الصلوٰة والتحیة والسلام و علی اٰله الکرام ۔ مصنفؒ فرماتے ہیں۔ اے بھائی معلوم رہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فضائل اس قدر ہیں۔ کہ شمار و حساب میں نہیں آسکتے۔ اور یہ جو کچھ مذکور ہوئے۔ کمتر سے کمتر ہیں۔ اور اللہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ وسلام و علی آلہ الکرام کی دوستی کی توفیق دینے والا ہے۔

المودة الثانیة فی فضائل اهل البیت جلة علیه السلام

دوسری مودت تمام اہل بیت علیہم السلام کے فضائل میں

۱۔ عن سعد بن ابی وقاص قال لما انزلت هذه الآیات ندع ابنا ئنا و ابناء کم الخـ دعی رسولؐ الله علیا و فاطمة و حسنا و حسینا فقال ! اللهم هؤلآء اهلیتی سعد ابن ابو وقاص سے مروی ہے۔ کہ جب آیہ ندع ابناء نا و ابناء کم و نسائنا و نسائکم و انفسنا وا نفسکم یعنی آیہ مباہلہ نازل ہوئی۔ تو آنحضرتؐ نے علیؑ اور فاطمہؑ اور حسنؑ اور حسینؑ کو بلایا۔ اور فرمایا۔ اے خدا یہ میرے اہلبیتؑ ہیں۔

۲۔ و عن سعد بن معاذ قال قال رسولؐ الله لی یوما و قد انصرف من الخندق یا سعد ان الله اطلع لی الارض فاختار نی منها علیا و فاطمةؑ والحسنؑ والحسینؑ و انا نذیر هذا الامة علیؑ هادیها اور سعد بن معاذ سے مروی ہے۔ کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جنگ خندق سے مراجعت فرما کر ایک دن مجھ سے فرمایا۔ اے سعد اللہ تعالیٰ نے زمین کی طرف نگاہ کی۔ پس اس سے مجھ کو اور علیؑ اور فاطمہؑ اور حسنؑ اور حسینؑ کو منتخب کیا۔ اور میں اس امت

کا نذیر یعنی ڈرانے والا ہوں۔اور علیؑ اس امت کا ہادی (یعنی راہ خدا دکھانیوالا۔)

۳۔ و عن جابر قال کان رسول اللّٰه یقول توسلوا بمحبتنا الی اللّٰه واستشفعو بنا فان بنا تکرمون و بنا تحیون و بنا ترزقون فاذا غاب من غائب فمحیونا امنا ثنا غدا کلهم فی الجنة اور جابر انصاری سے روایت ہے کہ رسولؐ خدا فرمایا کرتے تھے۔اے لوگو۔ ہماری محبت کو اللہ کی طرف اپنا وسیلہ بناؤ۔اور ہماری شفاعت طلب کرو۔کیونکہ ہمارے ہی سبب سے تمہارا اکرام کیا جاتا ہے۔اور ہمارے ہی سبب سے تم کو زندگی عطا ہوتی ہے اور ہمارے ہی سبب سے تم کو رزق دیا جاتا ہے۔پس جب ہم میں سے کوئی غائب ہو۔تو ہمارے محبّ ہمارے امین ہیں۔وہ سب کل قیامت کے دن جنت میں ہوں گے۔

٤۔ و عن ابی ریاح مولی ام سلمةؓ قال قال رسولؐ اللّٰه لو علم اللّٰه تعالیٰ فی الارض عبادا اکرم من علیؑ و فاطمةؑ و الحسنؑ والحسینؑ لا مرنی فی ان ابا هلیهم ولکن امرنی بالمباهلة مع هؤلاء و هم افضل الخلق فغلبت بهم النصاری ۔ اور ابو ریاح غلام ام سلمہؓ سے روایت ہے۔کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔کہ اگر اللہ تعالیٰ روئے زمین پر ایسے بندوں کو جانتا۔جو علیؑ اور فاطمہؑ اور حسنؑ اور حسینؑ علیہم السلام سے افضل اور بہترین ہوں۔تو ضرور مجھ کو حکم دیتا۔کہ میں ان کو اپنے ہمراہ لے کر (نصاریٰ سے) مباہلہ کروں۔مگر اللہ تعالیٰ نے مجھ کو حکم دیا۔کہ انہی چاروں کو کہ یہی چاروں تمام مخلوق سے افضل ہیں اپنے ساتھ لے کر مباہلہ کروں۔پس میں ان کے سبب نصاریٰ پر غالب ہوا۔

٥۔ و عن محمد بن حنفیة عن ابیه علیه السلام قال انی لنائم یوما اذ دخل رسولؐ اللّٰه فنظر الی و حرکنی برجله و قال لی قم یفدی بك و ابی و امی فان جبرئیل اتانی فقال لی بشر هذا بان اللّٰه تعالیٰ جعل الائمة من ولده و ان اللّٰه تعالی لغفر له ولذریته و لشیعته و لمحبته و ان من طعن علیه و یحبس حقه فهو فی النار ۔ اور محمد بن حنفیہ نے اپنے والد ماجد علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے روایت کی ہے۔کہ میں ایک دن سو رہا تھا۔کہ اسی اثناء میں رسولؐ خدا وہاں تشریف لائے۔پس میری طرف نگاہ کی۔اور پائے مبارک سے

مجھ کو بلایا۔اور مجھ سے فرمایا۔اے علیؑ اٹھو۔ تم پر میرے ماں باپ فدا ہوں۔ جبرئیلؑ میرے پاس آئے۔ اور مجھ سے کہا۔ کہ اے محمدؐ تم اس (علیؑ) کو یہ خوش خبری دو کہ اللہ تعالیٰ نے امام اس کی اولاد میں مقرر کئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اور اس کی ذریت (اولاد) اور اس کے شیعوں اور محبوں کو بے شک بخش دیا ہے۔ اور جو کوئی اس پر طعن کرے۔ اور اس کے حق کو ضبط کرے۔ وہ جہنم میں جائے گا۔

۶۔ و عن ابن عباس قال قال رسولؐ اللہ انا اول الناس شافعا ثم علی ثم ذریتی ثم محبوبنا یدخلو ن الجنة بغیر حساب لا یسئلون عن دینهم بعد المعرفة والمحبة اور ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔ کہ قیامت کے دن میں سب سے پہلے اپنی امت کی شفاع کروں گا۔ پھر علیؑ پھر میری اولاد علیہم السلام پھر ہمارے محب۔ وہ بے حساب جنت میں داخل ہوں گے۔ اور ہماری معرفت اور محبت کے بعد ان کے گناہوں کی پرسش نہ ہو گی۔

۷۔ و خالد بن معدان قال قال رسولؐ اللہ من احب ان یمسی فی رحمة اللہ وان یصبح فی رحمة اللہ علیه فلایدخلن بقلبه شك بان ذریتی افضل اللہ الذریات ووصیی افضل الاوصیاء اور خالد بن معدان سے مروی ہے۔ کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے۔ کو جو کوئی چاہے۔ کہ رحمت خدا میں شام کرے اور رحمت خدا میں صبح کرے (یعنی صبح و شام رحمت خدا اس کے شامل حال رہے) پس اس امر کی بابت اس کے دل میں کسی طرح کا شک ہرگز داخل نہ ہو۔ کہ میری ذریت طاہرہ سب ذریتوں سے افضل ہے۔ اور میرا وصیؑ تمام اوصیاء سے بہتر اور برتر ہے۔

۸۔ وعلی قال قال رسولؐ اللہ توضع منابر حول العرش الشیعتی وشیعة اهل بیتی المخلصین فی ولا یتنا و یقول اللہ تعـ هلموا یا عباری انشر علیکم کرامتی فقد اونیتم فی الدنیا اور امیر المومنین علی علیہ السلام سے مروی ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔ کہ قیامت کے دن میرے اور میرے اہلبیت علیہم السلام کے شیعوں کے لئے جو ہماری ولایت میں مخلص ہوں گے۔ عرش کے گرد منبر رکھے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا۔ اے میرے بندو۔ آؤ۔ میں اپنی کرامت کو تم پر ڈالوں (یعنی اپنی کرامت و رحمت سے تم کو نہال و خوش حال

کروں) کہ دنیا میں تم نے ایذا سہی ہے

۹۔ و عنه علیه السلام قال قال رسول ؐ اللّٰه یا علیؑ خلقت من شجرة و خلقت منها و انا اصلها وانت فرعها والحسنؑ والحسینؑ اغصانها و محبونا اوراقها فمن تعلق بشئ منها ادخله الله الجنة نیز اسی جنابؑ سے مروی ہے۔ کہ رسولؐ خدا نے فرمایا۔ اے علیؑ میں ایک درخت سے پیدا کیا گیا ہوں۔ اور تم بھی اسی درخت سے پیدا کئے گئے ہو۔ میں اس درخت کی اصل ہوں۔ اور تم اس کی فرع ہو۔ اور حسنؑ اور حسینؑ اس کی شاخیں ہیں۔ اور ہمارے محب اس کے پتے ہیں۔ پس جو کوئی اس درخت کے کسی حصہ میں لٹک جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریگا۔

۱۰۔ و عنه علیه السلام ایضا قال قال رسول ؐ الله من احب ان یتمسك بالعروة الوثقی فلیتمسك بحب علیؑ ابن ابی طالب و اهل بیتیؑ نیز جناب امیرالمومنینؑ سے روایت ہے۔ کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا ہے۔ کہ جو کوئی عروۃالوثقیٰ یعنی مضبوط دستہ کو پکڑنا چاہے۔ اس کو چاہئے کہ علیؑ ابن ابی طالب اور میرے اہل بیت علیہم السلام کی محبت کو مضبوط کر کے پکڑے۔

۱۱۔ و عن ابن عبا سؓ قال قال رسول الله انا میزان العلم و علی کفتاه والحسنؑ والحسینؑ خیوطه والفاطمةؑ علاقته والائمة من بعدی عموده یوزن اعمال المحبین لنا والبمغضین علینا۔ اور ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا ہے۔ کہ میں علم کی ترازو ہوں۔ اور علیؑ اس کے دونوں پلڑے اور حسنؑ اور حسینؑ اس کی ڈسیں (ڈوریاں) ہیں۔ اور فاطمہؑ اس کا علاقہ یعنی چوٹی ہے۔ اور آئمہ طاہرین جو میرے بعد ہوں گے۔ اس ترازو کا ستون ہیں۔ اس میں ہمارے دوستوں اور دشمنوں کے اعمال تولے جائیں گے۔

۱۲۔ و عن انسؓ قال قال رسول ؐ الله انا معشر بنی مطلب سادا اهل الجنة اناو علیؑ و حمزةؑ و جعفرؑ والحسنؑ والحسینؑ والمهدی علیهم السلام اور ان سے مروی ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔ کہ ہم اولاد مطلب کا گروہ بہشت والوں کے سردار ہیں۔ یعنی میں اور علیؑ اور حمزہؑ اور جعفرؑ اور حسنؑ اور حسینؑ اور مہدی علیہم السلام۔

۱۳۔ و عن ابی رافع قال قال رسول ؐ الله ان آل محمد لا یحل لهم صدقة و ان

موالی القوم المومنین منھم اور ابورافع سے روایت ہے۔ کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے۔ کہ آل محمدؐ کے لئے صدقہ حلال نہیں ہے۔ اور قوم مومنین کے حاکم اور سرداران ہی میں سے ہوں گے۔

۱۴۔ و عن حذیفةؓ و ابن عمر قال قال رسولؐ اللّٰہ اول نساء العالمین خدیجةؓ بنت خویلد و اول من اشفع یوم القیامة اھل بیتی ثم الاقر ب فالاقرب ثم الانصار ثم من اٰمن بی واتبعنی ثم اھل الیمن ثم سائر العرب ثم العاجم و من اشفع له اولا فھو افضل اور حذیفہؓ یمانی اور ابن عمر دونوں سے روایت ہے۔ کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے۔ کہ تمام عالم کی عورتوں میں سب سے پہلے خدیجہؓ بنت خویلد مجھ پر ایمان لائی۔ اور قیامت کے دن سب سے پہلے جس کی شفاعت کروں گا۔ وہ میرے اہلبیتؑ ہیں۔ پھر درجہ بدرجہ اپنے قریبوں کی۔ پھر انصار کی۔ پھر باقی لوگوں کی جو مجھ پر ایمان لائے۔ اور میری متابعت کی۔ پھر اہل یمن کی۔ پھر باقی اہل عرب کی۔ پھر اہل عجم کی۔ اور جس کی میں پہلے شفاعت کروں گا۔ وہ سب سے افضل ہے۔ (یعنی میرے اہل بیتؑ)

۱۵۔ و عن ابی سعید الخدری قال قال رسولؐ اللّٰہ انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ حبل ممدود من السماء الی الارض و عترتی اھل بیتؑ لن یفترقا حتی یرد علی الحوض ابو سعید خدری سے مروی ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ اے لوگو میں تمہارے درمیان دو گراں بہا چیزیں چھوڑنے والا ہوں۔ ایک کتاب خدا (قرآن) جو کہ آسمان سے زمین تک ایک پھیلی ہوئی رہتی ہے۔ دوسری میری اہل بیتؑ و عزت اطہار علیہم السلام۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس دونوں موجود ہوں۔

۱۳۔ و عن ابن مسعود قال قال رسولؐ اللّٰہ حب آل محمد یوما خیر من عبادة سنة و من مات علیه دخل الجنة اور ابن مسعود سے روایت ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ ایک دن آل محمدؐ کی محبت رکھنا ایک برس کی عبادت سے بہتر ہے۔ اور جو کوئی اس محبت پر مرے گا۔ وہ جنت میں داخل ہوگا۔

۱٤۔ و عن علی علیه السلام قال قال رسولؐ اللّٰہ مثل اھل بیتیؑ کمثل سفینة نوحؑ من تعلق بھا نجی و من تخلف عنھا دخل فی النار اور علی علیہ السلام سے مروی ہے۔

کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری اہلبیتؑ کی مثال کشتی نوحؑ کی مانند ہے کہ جو کوئی اس میں چڑھ گیا۔ وہ نجات پا گیا۔ اور جس نے اس سے روگردانی کی۔ وہ جہنم میں داخل ہوا۔ (اسی طرح جو کوئی اس کشتی اہل بیتؑ سے متفق ہوگا۔ نجات پائے گا۔ اور جو روگردانی اور مخالفت کرے گا۔ وہ دوزخ میں جائے گا)

۱۰۔ و عنه عليه السلام قال قال رسولؐ الله اربع انا اشفع لهم يوم القيامة المكرم لذريتي والقاضي لهم حوائجهم والساعي لهم في امورهم عند ما اضطر و اليه والمحب لهم بقلبه و لسانه ۔ نیز انہی حضرتؑ سے روایت ہے۔ کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے۔ کہ میں قیامت کے دن چار قسم کے شخصوں کی شفاعت کروں گا۔

(۱) جو میری اولاد کی تعظیم و تکریم کرے۔ (۲) جو ان کی حاجتوں اور ضرورتوں کو پورا کرے (۳) جو ان کے امور میں سعی و کوشش کرے۔ جب کہ وہ اس کی طرف مضطر ہوں۔ (۴) جو دل اور زبان سے ان کو دوست رکھے۔

۱۱۔ و عنه عليه السلام قال قال رسولؐ الله ليس في القيامة راكب غير اربعة قال فقام رجل اليه من الانصار فقال فاك ابي و امي يا رسول الله انت و من قال ان على ناقة البراق واخي صالحؑ على ناقة التي عقرت و عمي حمزةؑ على ناقة الغ...... و اخي عليؑ على ناقة من نوق الجنة بيده لواء ا لحمد فيقف بين يدى عرش رب العالمين فيقول لا اله الا الله محمد رسول الله قال فيقول آدميون ما هذا الا ملك مقرب او بني مرسل او حامل عرش رب العالمين قال فينادى مناد من بطنان العرش يا معشر الا دميين ما هذا ملك مقرب ولا نبي مرسل ولا حامل عرش رب العالمين هذا الصديق الاكبر عليؑ ابن ابي طالب ۔ نیز انہیں حضرتؑ سے مروی ہے۔ کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن چار شخصوں کے سوا اور کوئی سوار نہ ہوگا۔ اس وقت انصار میں سے ایک شخص نے اٹھ کر عرض کی یا رسولؐ اللہ میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں۔ ایک تو آپ ہوں گے۔ فرمایئے اور کون کون ہوں گے۔ حضرتؐ نے فرمایا۔ اور میرے بھائی صالحؑ پیغمبر اس ناقہ پر سوار ہوں گے۔ جس

کوان کی قوم نے پے کر دیا تھا۔ اور میرے چچا حمزہ ناقہ عضبا پر سوار ہوں گے۔اور میرے بھائی علیؑ ایک بہشتی ناقے پر سوار ہوں گے۔اور اس کے ہاتھ میں علم حمد ہوگا۔اور عرش پروردگار عالمین کے سامنے کھڑا ہوگا۔اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ زبان سے کہے گا۔اس وقت تمام آدمی کہیں گے۔یہ یا تو کوئی فرشتہ مقرب ہے۔یا کوئی پیغمبر مرسل ہے۔یا عرش پروردگار عالمین کا اٹھانے والا فرشتہ ہے تب وسط عرش سے ایک منادی ندا کرے گا۔اے آدمیو۔یہ نہ تو مقرب فرشتہ ہے۔اور نہ پیغمبر مرسل۔اور نہ عرش پروردگار عالمین کا اٹھانیوالا فرشتہ۔بلکہ یہ صدیق اکبر علیؑ ابن ابی طالب ہے۔

۲۰۔ و عن عکرمة عن ابن عباسؓ قال رسول خط رسولؐ ا للّٰه فی الارض خطوطا اربعة ثم قال اتدرون ما هذا قالوا اللّٰه و رسوله اعلم قال افضل نساء اهل الجنة خديجة بنت خويلد و فاطمةؑ بنت محمدؐ و مريمؑ بنت عمران و آسية بنت مزاحم امراة فرعوم اور عکرمہ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے۔کہ آنحضرتؐ نے زمین پر چار خط لکیریں) کھینچے۔پھر صحابہ سے فرمایا۔تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟صحابہ نے عرض کی۔اللہ اور اس کے رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔فرمایا۔بہشتی عورتوں میں سب سے افضل خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہؑ بنت محمدؐ اور مریمؑ بنت عمران۔اور آسیہؑ بنت مزاحم زوجہ فرعون ہیں۔

۲۱۔ و عن احمد بن حنبل قال راء يت رسولؐ ا للّٰه فی النوم فقال لی يا احمد هلكت فی قول الشافعی محمد بن ادريس عن حديثی من حفظ من امتی اربعين حديثا من السنة كنت له شفيعا يوم القيامة ۔ ما عرفت ان فضائل اهل بيتیؑ من اسنة ۔ اور امام احمد بن حنبل سے روایت ہے۔کہ میں نے جناب رسولؐ خدا کو خواب میں دیکھا۔حضرتؐ نے مجھ سے فرمایا۔اے احمد تو محمد بن ادریس شافعی کے اس قول میں ہلاک ہوگیا۔کہ اس نے میری اس حدیث کو بیان کیا تھا۔کہ جو کوئی میری امت میں سے میری سنت کی چالیس حدیثیں حفظ کرے گا۔قیامت کے دن میں اس شخص کی شفاعت کروں گا۔تو یہ نہ سمجھا کہ میرے اہل بیتؑ کے فضائل میری سنت میں داخل ہیں۔

۲۲۔ عن عائشة بنت عبداللّٰه بن عاصمی التميمی بمدينة رسولؐ اللّٰه و كانت

مجاورة بها قالت حدثنی ابی عن وائل عن نافع عن ام سلمة انها قالت سمعت رسولؐ اللہ یقول ما من قوم اجتمعوا یذکرون فضائل محمدؐ و آلؑ محمدؐ الا ھبطت الملئکة من السماء حتی الحقوا بھم بحدیثھم فاذا تفرقوا عرجت الملئکة الی السماء فیقول لھم الملئکة الآخر انا نشم رائحة منکم ما شممنا رائحة اطیب منھا فیقولون انا کنا عند قوم یذکرون فضل محمدؐ و آلؑ محمدؐ نعطرونا من ریحھم فیقولون اھبطوا بنا الیھم فیقولون انھم قد تفرقوا فیقولون اھبطوا بنا الی المکان الذی کانوا فیه ۔ عائشہ دختر عبداللہ بن عاصمی تمیمی جو مدینہ رسولؐ خدا میں مجاور تھی۔ بیان کرتی ہے۔ کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا۔ اور اس نے اوائل سے اور اوائل نے نافع سے اور نافع نے ام سلمہ زوجہ رسولؐ خدا سے روایت کی ہے۔ کہ ام سلمہؓ کہتی ہیں۔ کہ میں نے رسولؐ خدا سے سنا ہے۔ کہ جب لوگ فضائل محمدؐ اور آل محمدؐ کا ذکر کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ تو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں۔ اور اس فکر میں ان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ جب وہ لوگ فارغ ہو کر چلے جاتے ہیں۔ تو وہ فرشتے آسمان کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ تب اور فرشتے ان فرشتوں سے کہتے ہیں۔ ہم تم سے ایسی خوشبو سونگھتے ہیں۔ کہ اس سے پاکیزہ تر خوشبو ہم نے کبھی نہیں سونگھی۔ وہ فرشتے جواب دیتے ہیں۔ کہ ہم ایسے لوگوں کے پاس موجود تھے۔ جو فضائل محمدؐ آل محمدؐ کا ذکر کرتے تھے۔ پس ان کی بوئے خوش سے ہم معطر ہو گئے۔ یہ بات سن کر وہ فرشتے ان سے کہتے ہیں۔ کہ ہم کو بھی وہاں لے چلو۔ وہ جواب دیتے ہیں۔ کہ وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ تب وہ فرشتے کہتے ہیں۔ کہ ہم کو اس مکان ہی میں لے چلو۔ جہاں وہ موجود تھے۔ (اور ذکر فضائل محمدؐ و آل محمدؐ کرتے تھے)

۲۳۔ و عن الامام جعفر بن محمد الصادق عن آبائه علیھم السلام عن رسول اللہ انه قال من احبنا اھل البیتؑ فلیحمد اللہ علی اولی النعم قیل و ما اولی النعم قال طیب الولادة ولا یحبنا الا من طابت ولا دته اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے آبائے کرام علیہم السلام سے روایت کی ہے۔ کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ جو کوئی اہل بیتؑ کو دوست رکھے۔ اس کو چاہئے۔ کہ اولی النعم یعنی بہترین نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر

ادا کرے۔ صحابہ میں سے کسی نے عرض کی۔ کہ اولی النعم کیا چیز ہے۔ فرمایا۔ پیدائش کا پاکیزہ ہونا۔ یعنی حلال زادہ ہونا۔ اور ہم اہل بیتؑ کو وہی شخص دوست رکھتا ہے۔ جو طیب الولادہ یعنی حلال زادہ ہوگا۔

۲۴۔ و عن جابرؓ قال قال رسولؐ اللہ الزمرا مر وتنا اهل البیت فان من لقی اللہ و هویو دنا دخل الجنة معنا والذی نفس محمدؐ بیده لا ینفع عبدا عمله الا بمعرفته حقنا۔ اور جابرؓ انصاری سے مروی ہے۔ کہ رسولؐ خدا نے فرمایا۔ اے میری امت کے لوگو۔ اور اے صحابہ ہم اہل بیتؑ کی دوستی کو لازم پکڑو۔ کیونکہ جو کوئی اللہ سے ملاقات کرے در آنحالیکہ وہ ہم کو دوست رکھتا ہو۔ وہ ہمارے ہمراہ جنت میں داخل ہوگا۔ اور میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں۔ جس کے قبضہ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے۔ کہ کسی بندے کو اس کا عمل کچھ نفع نہ دیگا مگر ہمارے حق کی معرفت کے ساتھ (یعنی ہمارے حق کی معرفت کے بغیر کسی شخص کو اپنے عمل سے کچھ نفع نہ ہوگا)

۲۵۔ و عن جبیر ابن مطعم قال قال رسولؐ اللہ الست بولیکم قالوا بلیٰ یا رسول اللہ قال علیه السلام انی ارشك ان ادعی فاجیب فانی تارك فیکم الثقلین کتاب ربنا و عترتی اهل بیتیؑ فانظروا کیف تحفظونی فیهما۔ اور جبیر ابن مطعم سے روایت ہے۔ کہ رسولؐ خدا نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے صحابہ کیا میں تمہارا حاکم اور مختار نہیں ہوں۔ انھوں نے عرض کی۔ یا رسولؐ اللہ۔ ہاں آپ ہمارے حاکم اور مختار ہیں۔ حضرتؐ نے فرمایا۔ میں عنقریب (دربار خدا میں) طلب کیا جاؤں گا۔ اور میں اس (طلبی) کو قبول کروں گا۔ (یعنی میری رحلت قریب ہے) پس میں تمہارے درمیان دو نفیس اور گراں بہا چیزیں چھوڑنے والا ہوں۔ ایک ہمارے پروردگار کی کتاب یعنی قرآن ہے اور دوسری میری عزت واہل بیتؑ۔ پس تم دیکھو۔ کہ ان کے بارے میں تم میری کیونکر رعایت کرتے ہو۔ (باقی آئندہ)

حوالے:

ا۔ عجم سے عرب کے سوا تمام دنیا مراد ہے ۱۲۔

❀❀❀

ڈاکٹر سید حسن عباس

نور الانوار ترجمہ عبقات الانوار

(حدیث نور)

میر حامد حسین موسوی(۱۲۴۶-۱۳۰۶ھ) کا نام لکھنؤ کے عمائدین، علما و مصنفین امامیہ میں ایک اہم نام ہے۔ ان کے والد مفتی محمد قلی (۱۱۸۸- ۱۲۶۰ھ) متکلم، محقق، مناظر اور جامع علوم معقولات و منقولات تھے۔ یہ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ انہوں نے تحفۂ اثنا عشریہ، تالیف شاہ عبد العزیز دہلوی (۱۱۵۹-۱۲۳۹ھ) کے باب اول، دوم، ہفتم، دہم، اور باب یازدہم کے جوابات لکھے تھے۔ میر حامد حسین کے بھائی، سید اعجاز حسین (۱۲۴۰-۱۲۸۶ھ) مولف کشف الحجب والاستار، بھی علمی اور مذہبی دنیا میں اپنے علمی کارناموں کی بدولت معروف ہیں۔ میر حامد حسین کے بیٹے سید ناصر حسین الملقب بہ ناصر الملت اور ان کے دیگر بھائیوں کی علمی و دینی خدمات کا زمانہ معترف ہے۔ کتابخانۂ ناصریہ، ان ہی لوگوں نے اپنی علمی اور مذہبی ضرورتوں کے تحت قائم کیا تھا جو نوادرات کے اعتبار سے منحصر بہ فرد ہے۔ کئی ہزار نفیس قلمی اور قدیم مطبوعہ کتب کے سبب عالم اسلام اور اہل دانش و بینش کی نظر میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ صاحب الغدیر علامہ امینی اپنی کتاب الغدیر کی تالیف کے زمانہ میں ایران سے لکھنؤ تشریف لائے، چھ ماہ یہاں مقیم رہے اور اس کتابخانہ سے علمی مواد جمع کرتے رہے۔ اسی طرح ایک اور ایرانی مصنف و عالم آقا بزرگ تہرانی صاحب الذریعہ نے بھی کتابخانۂ ناصریہ کی عظمت و بزرگی اور وسعت کا اعتراف کیا۔ ان کے علاوہ ایران و عرب کے علماء اکثر و بیشتر علمی معاملات میں اس کتاب خانہ سے رجوع کرتے رہے اور جب بھی موقع ملا اس کا کھل کر اعتراف بھی کیا۔

میر سید حامد حسین کی مشہور زمانہ کتاب، عبقات الانوار، شاہ عبد العزیز دہلوی کی تحفۂ اثنا

عشریہ کے ساتویں باب (امامت) کا نہایت مدلل اور مفصل جواب ہے۔ تحفہ کی زبان بھی فارسی تھی اس لئے جواب بھی فارسی زبان میں ہی دیا گیا۔ تحفہ کی اشاعت سے برصغیر میں مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں میں مناظرہ و مجادلہ کا دروازہ کھولا گیا تھا جس کے بعد جواب الجواب کا سلسلہ زمانۂ دراز تک جاری رہا اور مناظرے کے موضوعات پر فریقین کی جانب سے بے شمار کتابیں معرض وجود میں آئیں۔ تحفہ کے مختلف ابواب کے عربی اور اردو ترجمے بھی شائع ہوئے۔ دسویں اور بارہویں باب کا اردو ترجمہ تحفۂ حسن، کے نام سے سر سید احمد خاں نے ۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ میں شائع کیا جبکہ مرزا محمد ہادی رسوا نے تحفۃ السنۃ، کے نام سے ۱۵ جلدوں میں ایک مفصل جواب لکھا جو مدرسہ الواعظین لکھنو کے کتابخانہ میں موجود ہے (تقریظ نور الانوار)

عبقات چونکہ فارسی میں ہے اور فارسی کا رواج ہمارے یہاں کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے اس لئے ضرورت تھی کہ اس اہم کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ ہو، تاکہ اردو داں حضرات اس سے فیض یاب ہو سکیں۔ یہ اہم کام سید شجاعت حسین گوپالپوری نے انجام دیا ہے۔ موصوف ابتدا سے علمی ذوق رکھتے ہیں اور کئی رسالوں میں ان کے مضامین و ترجمے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حوزۂ علمیہ قم کے علمی اور مذہبی ماحول کا انہوں نے صحیح فائدہ اٹھایا اور تصنیف و تالیف کے کام میں خود کو مصروف کر لیا۔ ابھی عبقات کے اردو ترجمہ نور الانوار کی پہلی جلد منظر عام پر آئی ہے۔ مکمل ترجمہ ۱۴۔۱۵ جلدوں میں سامنے آئے گا۔ اصل عبقات جو ہندوستان میں چھپی تھی۔ وہ ۱۱ جلدوں میں ہے۔ ایران میں حدیث غدیر اور حدیث ثقلین کے علاوہ یہی جلدیں آفسیٹ پر چھاپی گئیں۔ تقریباً چالیس سال قبل حدیث ثقلین و سفینہ جو ہندوستان میں شائع ہوئی تھیں۔ وہ ایران میں چھ جلدوں میں شائع ہوئیں۔ حدیث غدیر جو ہند میں دو جلدوں میں چھپی تھی، ایران میں مولانا بروجردی کی تحقیق کے ساتھ دس جلدوں میں شائع ہوئی۔ ایرانی محقق حجۃ الاسلام سید علی میلانی نے عربی میں عبقات کا ترجمہ و خلاصہ کیا جس کی ۱۹ جلدیں نفحات الازہار کے نام سے ایران میں شائع ہوئیں۔ جناب میلانی نے ۳۵ سال اس کتاب کی تحقیق، تعریب اور تلخیص میں صرف کئے۔ سید شجاعت حسین نے اپنے اردو ترجمہ میں جناب میلانی کی مذکورہ کتاب کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔

'نورالانوار' کی تقریظیں فارسی میں آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی نے اور اردو میں مولانا سید سعید اختر رضوی گوپال پوری نے لکھی ہیں۔ دونوں بزرگوں نے مترجم کی اس کوشش کی تعریف و تحسین کی ہے۔ مولانا سعید اختر صاحب نے اپنی تقریظ میں تحفہ اور اس کے جواب میں لکھی جانے والی کتابوں کی ایک فہرست بھی درج کی ہے۔

'نورالانوار' میں مترجم کا اسلوب صاف و سادہ اور رواں ہے اور بقول مولانا سعید اختر صاحب:

ترجمہ پر اصل تصنیف کا گمان ہوتا ہے۔

یہ کتاب انتشارات دار البشیر اور زہرا مشن آف انڈیا قم کے تعاون سے ۳۶۰ صفحات میں مئی ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب بہت عمدہ چھپی ہے گٹ اپ بھی بہت خوبصورت ہے۔ اسے ہر لائبریری میں ہونا چاہئے۔ خاص طور پر اہل ذوق اس کی بڑھ چڑھ کر پذیرائی کریں گے۔ ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم مترجم موصوف کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ جلد سے جلد اس اہم ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکیں اور اہل علم کو عبقات کے مکمل ترجمہ کا سیٹ حاصل ہو سکے۔

❀❀❀

از: سید نور الدین شریعتمدار جزائری

نہج البلاغہ میں نبوی تبلیغ کی راہ وروش

اس مقالے کا مقصد نہج البلاغہ کی روشنی میں دین کی تبلیغ میں پیغمبر اسلامؐ کی ارشادی سیرت اور تبلیغی راہ وروش کا تجزیہ ہے۔ در حقیقت انسان کی تعلیم وتربیت میں کامیاب اور کار آمد تبلیغ نمایاں کردار ادا کرتی ہے جس کا اس مقالہ میں مکمل تجزیہ پیش کیا جائے گا۔ اس مختصر مقالہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) نہج البلاغہ میں پیغمبرؐ کی تبلیغی سیرت وروش

(۲) کامیاب اور کار آمد تبلیغ

در حقیقت مقالہ کا دوسرا حصہ پہلے حصے میں کی جانے والی بحث کا نتیجہ و نچوڑ ہے۔ پس پہلے مرحلے میں پیغمبر کی تبلیغی روش کے قالب میں مختلف تبلیغی کارناموں کو پیش کر دیا گیا ہے اور اس کے بعد مفید وکارساز روش کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔

نہج البلاغہ میں نبوی تبلیغ کی روش:

کارساز اور کامیاب تبلیغ پیغمبر خداؐ کی تبلیغ ہے کیونکہ ان کی راہ وروش اور سیرت طیبہ تمام انسانوں کے لئے اسوہ ونمونہ شمار کی جاتی ہے چنانچہ قرآن مجید میں خداوند عالم کا ارشاد ہوتا ہے۔ "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ"۔ یعنی در حقیقت تم لوگوں کے لئے پیغمبر اکرمؐ کی ذات میں

ایک اچھا اسوہ و نمونہ عمل موجود ہے۔ پس نہج البلاغہ میں رسول خدا کی تبلیغ کی نوعیت و کیفیت کی وضاحت کے سلسلے میں جو چیزیں اہم اور لازمی تھیں، انھیں پیش کر دیا گیا ہے لیکن اس حقیقت کا اعتراف لازمی معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم کتاب میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی مکمل وضاحت ہم لوگوں کی سمجھ سے بہت بالاتر ہے کیونکہ امیر المومنین کے بیانات میں سے جو چیزیں ہم لوگوں کو دستیاب ہیں وہ بہت کم ہیں۔

تبلیغ کا مقصد:۔

ہر چیز کی قدر و قیمت اس کے مقصد کی قدر و قیمت سے ہوا کرتی ہے۔ مقصد کی عظمت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کام کی قدر و قیمت میں کمی و زیادتی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری چیزوں کی طرح تبلیغ کا بھی کوئی مقصد ہونا چاہیے اور یہ مقصد مادی مفاد و مصالح سے بلند و بالاتر ہونا چاہیے اور صرف فنا ہو جانے والی متاع و دنیوی کے دائرہ میں محدود نہ رہنا چاہیے۔ نہج البلاغہ میں تبلیغ نبوی کے مختلف مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ مقاصد بطور نمونہ پیش کئے جا رہے ہیں۔

ا۔ جہالت و نادانی سے نجات اور روح کی ایجاد:- حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا۔ "الیٰ عن ..... من جهالة "۔ یعنی خداوند عالم نے حضرت محمدؐ کو اس دنیا میں اس لئے بھیجا کہ اس نے لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے پیغمبر بھیجنے کا جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دے، پیغمبر کو درجہ کمال عطا کر دے اور اس نے اپنے بارے میں پیغمبروں کے ساتھ جو پیغام ارسال فرمایا تھا اس کی اپنی واضح علامتوں اور اپنی کرامتوں کے ذریعہ ظاہر و نمایاں کر دے۔

اور اس زمانے میں لوگ مختلف مطالبات اور طرح طرح کی رہ و روش کے حامل تھے۔ ان میں سے بعض افراد کائنات کے خالق کو اس کی مخلوق کی طرح جانتے تھے اور بعض جماعتوں نے اس معبود حقیقی سے روگردانی اختیار کرتے ہوئے اس کی جگہ دوسرے کو اپنا خالق مان لیا تھا۔ ان حالات میں خداوند عالم نے پیغمبر کو بھیجا تاکہ وہ ان لوگوں کو گمراہی سے نکال کر ہدایت کی طرف لے جائے اور جہالت و نادانی سے انھیں نجات فراہم کر دے۔ ۱

اس خطبہ میں نبوی تبلیغ کا مقصد اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ اپنے وعدہ کو وفا کرنا، نبوت کو درجہ کمال عطا کرنا، گمراہی سے لوگوں کی ہدایت کرنا، لوگوں کو جہالت اور نادانی سے نجات عطا کرنا اور مختلف اغراض ومقاصد اور افکار و عقائد کی حامل جماعتوں میں وحدت کی روح پھونکنا۔ یہ مقاصد در حقیقت انسانی تصور میں آنے والی گرانقدر اور عظیم ترین چیز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لوگوں کے درمیان انتشار و پراگندگی اور ان کے پست و حقیر مقاصد کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ بعض لوگ گھوڑے اور بعض اونٹ کی پرستش کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ مٹی کو جمع کر کے اس کو دودھ میں ڈال دیتے تھے اور پھر اس کے اردگرد طواف بھی کرتے تھے۔ انہیں سے بعض لوگ سفید پتھر کی پوجا کرتے تھے۔ یہودیوں نے عزیز کو اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا بنا رکھا تھا۔ انہیں سے بعض لوگ دہریہ مذہب کے پیرو تھے اور یہ کہتے تھے کہ اس دنیوی زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ بعض بت پرست اور بعض عقیدہ تناسخ کے حامل تھے۔ جب پیغمبر نے ان لوگوں کو خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی تو وہ لوگ یہ کہنے لگے کہ ۳۶۰ خداؤں کو چھوڑ کر صرف ایک خدا کو کیسے قبول کر لیں ۲۔

ایک دن پانچ جماعتیں پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں کہ ان سے مباحثہ و گفتگو کریں۔ یہودیوں، عیسائیوں، دھریوں، ثنویوں عرب اور مشرکوں نے اپنے نمائندوں کو پیغمبر کی خدمت میں بھیجا تھا۔

یہودیوں نے کہا "ہم عزیز کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ ہم لوگ تم سے یہ کہنے آئے ہیں کہ تم ہماری بات مان لو کیونکہ ہمارا عقیدہ تمہارے اس دین سے بہتر ہے۔ اگر تم نے ہماری بات قبول نہ کی تو ہم لوگ تمہاری دشمنی پر کمر بستہ ہو جائیں گے"۔ اسی طرح عیسائیوں نے بھی پیغمبر سے فرمایا۔ "ہم عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ ہم تم سے یہ کہنے آئے ہیں کہ تم ہماری بات مان لو کیونکہ ہمارا عقیدہ تمہارے دین و عقیدہ سے زیادہ بہتر ہے۔ اگر تم لوگوں نے ہماری بات نہ مانی تو ہم لوگ تمہارے دشمن ہو جائیں گے"۔

دھریہ جماعت کے لوگ پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ "ہمارا عقیدہ و ایمان ہے کہ دنیا ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی اور اس کی کوئی ابتدا یا انتہا نہیں ہے۔ اگر تم ہمارے عقیدہ کو قبول کر لو تو تمھیں اندازہ ہو گا کہ یہ تمارے دین سے بہتر ہے اور اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو

ہملوگ تمہارے دشمن ہو جائیں گے۔

ثنوی جماعت والوں نے کہا کہ روشنی اور تاریکی دنیا کی خالق ہیں اور یہی دنیا کو چلاتی ہیں پس تم میرے اس عقید کو قبول کر لو۔ یہ تمہارے دین سے بہتر ہے۔ اگر تم نے ہماری بات نہ تسلیم کی تو ہم لوگ تمہارے دشمن ہو جائیں گے۔

اس کے بعد مشرکین عرب پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بُت ہی خدا خدا ہیں۔ اگر تم میری بات قبول کر لو تو تمھیں اندازہ ہو گا کہ ہم لوگوں کا عقیدہ تمہارے دین سے بہتر ہے اور اگر تم نے ہماری بات نہیں قبول کی تو ہم تمہارے دشمن ہو جائیں گے۔

پیغمبرؐ نے ان لوگوں سے کہا کہ میں خدای واحد پر اعتقاد و ایمان رکھتا ہوں جس کا کوئی شریک اور مثل نہیں ہے۔ میں اس معبود حقیقی کے علاوہ کسی غیر خدا کی پرستش کو کفر مانتا ہوں۔ خداوند عالم نے مجھ کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ میں دنیا میں حجت تمام کر سکوں۔ جو شخص خدا کے دین میں مکر و فریب کرتا ہے تو وہ خود اسی فریب کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے یہودیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ میں کسی دلیل کے بغیر تمہاری بات تسلیم کر لوں؟

حضرت نے فرمایا کہ تم لوگوں کے پاس اس بات کی کوئی دلیل ہے کہ عزیز خدا کا بیٹا ہے؟

ان لوگوں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے بنی اسرائیل کے لئے توراۃ کو زندہ کیا پیغمبر نے فرمایا۔ "اگر تمہاری یہی دلیل ہے تو پھر موسیٰ خدا کے بیٹے کیوں نہیں ہو سکتے کیونکہ توراۃ کو لانے والے وہ ہیں اور وہ الٰہی معجزات کے حامل بھی ہیں اور عزیز مصر کے پاس تو کوئی معجزہ نہیں ہے...... تملوگ عزیز مصر کو جو عہدہ و مرتبہ دے رہے ہو وہ موسیٰؑ کے لئے زیب دیتا ہے کیونکہ بارگاہ خداوندی میں ان کی عزت و کرامت بالاتر رہی ہے"۔

یہودیوں کے پاس پیغمبر کی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا لہذا انھوں نے عاجزی کے ساتھ یہ فرمایا کہ ہم لوگ سلسلے میں غور و فکر کریں گے۔

حضرت محمدؐ نے عیسائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ یہ کہتے ہو کہ حضرت مسیح

علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں اور خدا قدیم ہے۔ اس کی کوئی ابتدا یا انتہا نہیں ہے تو کیا خداوند عالم کی طرح حضرت مسیحؑ بھی قدیم ہیں۔ اور حضرت مسیحؑ کی طرح خدا بھی حادث ہے؟ اگر تم لوگ یہ کہتے ہو کہ خدای قدیم حادث ہو گیا تو یہ بالکل غلط بات ہے کیونکہ قدیم کبھی حادث نہیں ہوگا اور اگر تم یہ کہتے ہو کہ خدا نے حضرت مسیحؑ کو منتخب کیا اور اس کے ساتھ متحد ہو گیا تو پھر تم یہ کہنے کے لئے مجبور ہو کہ عیسیٰ حادث ہیں اور ان کا انتخاب نیز ان کے ساتھ متحد ہونا بھی حادث ہے لیکن تمہاری اس بات سے اس چیز کی خلاف ورزی ہوتی ہے جس کا تم لوگوں نے شروع میں اعتراف کیا ہے۔

ان لوگوں نے کہا۔ ”چونکہ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ کو معجزے عطا کئے ہیں اس لئے ہم انھیں خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔

پیغمبر نے ان لوگوں سے پوچھا کہ میں نے حضرت موسیٰؑ کے بارے میں یہودیوں سے جو کچھ کہا ہے اسے تم لوگوں نے بھی سنا ہوگا پس خدا کا بیٹا بننے کے لئے موسیٰ سے بہتر کون ہوگا؟ اگر خدا کا بیٹا بننے کے لئے کرامت و معجزۂ الٰہی کا ہونا شرط ہے تو پھر موسیٰ کو بھی ان کا بیٹا مان لینا مناسب ہے۔ پیغمبر کی یہ بات سن کر وہ لوگ خاموش ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد ان لوگوں میں سے ایک نے کہا، ”آپ لوگ حضرت ابراہیمؑ کو خلیل خدا کیوں کہتے ہیں؟ جس طرح آپ لوگ انھیں خلیل خدا کہتے ہیں بالکل اسی طرح ہم لوگ حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔

پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا۔ ”خلیل در حقیقت خلت سے اخذ کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے فقر و نیاز۔ چونکہ حضرت ابراہیمؑ مفلس و نادار اور نیاز مند خدا تھے اور سب لوگوں سے قطع تعلق کر کے فقط خدا کی ذات سے لو لگائے ہوئے تھے اسی وجہ سے انھیں خلیل اللہ کہا گیا۔ اگر عیسیٰؑ کو ابراہیمؑ جیسا قیاس کرتے ہوئے انھیں خدا کا بیٹا کہا جا سکتا ہے تو پھر اسی بنیاد تم لوگوں کو موسیٰ کو بھی خدا کا بیٹا مان لینا چاہیے کیونکہ وہ عیسیٰ سے ہرگز کمتر نہیں تھے۔

عیسائی جماعت کے لوگ یہ کہتے ہوئے خاموش ہو گئے کہ ”ہم لوگ غور و فکر کریں گے“۔

اس کے بعد پیغمبر نے دھریہ، ثنویہ اور عرب مشرکوں کی جماعتوں سے الگ الگ ملاقات و

گفتگو کی۔ ان لوگوں کے خیالات معلوم کئے اور ان کی باتوں کو غور سے سنا اور ان کے ہر سوال کا مدلل جواب دے کر انھیں سکوت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ منقول ہے کہ تین روز تک غور و فکر کے بعد اس مناظرہ کے آخر میں وہ لوگ پیغمبر کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئے اور سب نے اسلام قبول کر لیا۔ ان لوگوں نے پیغمبر سے کہا کہ جیسی دلیل آپ نے پیش کی ویسی دلیل ہم لوگوں کے پاس نہ تھی لہذا ہم لوگ یہ گواہی دیتے ہیں کہ آپ پیغمبر خدا ہیں۔ ۳

اس مناظرہ و گفتگو کے دوران پیغمبر اکرمؐ نے مختلف گروہ و جماعت سے وابستہ اور مختلف افکار و عقائد کے حامل لوگوں کی ہدایت فرماتے ہیں۔ ان لوگوں کو وحدت و ہم آہنگی کی دعوت دیتے ہیں اور تمام لوگوں کو خدای وحدہ لاشریک کا معتقد بنا دیتے ہیں۔

(۲) شبہات کی وضاحت:- کتاب نہج البلاغہ میں مذکور پیغمبر اکرمؐ کی تبلیغ کے جو مقاصد بیان کئے گئے ہیں انمیں سے ایک اہم مقصد لوگوں میں موجود شبہات کی وضاحت ہے۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں۔ "واشهد ان محمداً عبده ...... و تخويفا بالمثلات "۔ یعنی اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندے اور اس کے پیغمبر ہیں جن کو خداوند عالم نے ایک واضح دین، معین عقل و دانش، نوشتہ شدہ کتاب، رفعت و بلندی والا روشن و تابناک نور اور واضح حکم کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے شبہات کو دور کر دیں اور واضح دلیلوں کے ساتھ احتجاج کریں اور الٰہی نشانیوں کے ذریعہ لوگوں کو ڈرائیں"۔ ۴

پیغمبر اکرمؐ اپنی تبلیغ کے دوران لوگوں کے شبہات کو اس طرح دور کر دیا کرتے تھے کہ ان لوگوں کے دل و دماغ میں دین خداوندی کے سلسلے میں کوئی چیز مُبہم اور غیر واضح نہیں رہ جاتی تھی۔ در حقیقت اس سلسلے میں پیغمبر نے اتنی جد و جہد کی کہ خود خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ دین کی قبولیت کے سلسلے میں جبر و اکراہ نہیں ہے یہاں تک کہ ہدایت کا راستہ گمراہی سے بالکل واضح اور روشن ہو چکا ہے۔

"لااكراه فى الدين قد تبين الرشد من الغى"۔ ۵

راہ ہدایت کی وضاحت اور اس کو گمراہی سے الگ کرنے میں رسول مقبول نے غیر معمولی جدو

جہد سے کام لیا اور اپنی مثالی کوشش کے ذریعہ لوگوں کے شبہات کو پوری طرح دور کر دیا۔ پس لوگوں نے مخصوص عشق، غیر معمولی دلچسپی اور دین خدا کی درستی و صحت کے سلسلے میں خصوصی ایمان و اعتقاد کے ساتھ اس کو قبول کیا۔ خدا کے دین اور اس کی مقدس کتاب کی وضاحت کا یہ عالم تھا کہ سبھی لوگوں اس کی صحت کا اعتراف کیا اور اس کی مثال پیش کرنے سے اپنی عاجزی و ناتوانی کا اعلان و اقرار کر لیا۔ جب خداوند عالم نے ان لوگوں سے قرآن جیسی کتاب پیش کرنے کا مطالبہ کیا تو ان لوگوں نے ایک سورہ بھی پیش کرنے سے اپنی عاجزی و ناتوانی ظاہر کر دی۔ قرآن اس سلسلے میں ارشاد فرماتا ہے۔ "وان کنتم فی ...... والحجارة "۔[۶] یعنی ہم نے اپنے بندہ پر جو کچھ نازل کیا ہے اگر تمہیں اس سلسلے میں کوئی شک و شبہ ہے تو تم اس طرح کی ایک سورہ ہی لے آؤ۔ اور اپنے غیر خدا شریکوں اور ساتھیوں کو بھی بلالو اگر تم سچ بولنے والے ہو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکے، جب کہ ایسا ہرگز نہ کر سکو گے، تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

ب۔ شیوۂ تبلیغ:- تبلیغ کو موثر اور کار آمد بنانے میں شیوۂ تبلیغ کا اہم رول ہوتا ہے۔ تبلیغ کی کارسازی کا اہم ترین راز اس کا مخصوص و پسندیدہ طریقہ ہے۔ یہی وجہ ہے تبلیغی ادارے تبلیغ کی عمدہ اور موثر راہ و روش کے انتخاب کے سلسلے میں کافی سرمایہ لگاتے ہیں۔

مذہبی تبلیغ کا بہترین طریقہ و شیوہ در حقیقت پیغمبر اکرم کا شیوۂ تبلیغ ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں پیغمبر کے شیوۂ تبلیغ کے سلسلے میں متعدد باتیں بیان فرمائی ہیں جن میں سے بعض چیزیں بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

تبلیغ میں پختگی:- امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ "فبالغ فی ...... الحسنة "۔ یعنی پیغمبرؐ نے نصیحت و تبلیغ کے دوران پختگی اور کمال کی بھرپور پیروی کی، راہ راست پر گامزن رہے اور حکمت و نیک نصیحتوں کی طرف لوگوں کو مدعو کرتے رہے۔[۷]

شیوۂ تبلیغ میں پختگی و کمال کا مطلب ہے کہ جس شخص کو خطاب کیا گیا ہے اس کے سن و سال، ماحول کی موزونیت اور اس کی زمانی و مکانی صورتحال پر پوری نگاہ رکھی جائے۔ پیغمبر اپنی تبلیغ کے دوران

ان خصوصیات کا پورا خیال رکھتے تھے اور ایسی کسی چیز کو نظرانداز نہیں ہونے دیتے تھے جو اس کی تاثیر و پختگی میں کام آنے والی ہوتی تھی۔

تبلیغ کے ابتدائی مرحلہ میں پیغمبر اکرمؐ نے سب سے پہلے اپنے عزیزوں اور گھر والوں کے درمیان تبلیغ شروع کی۔ جب قرآن مجید کی یہ آیۂ مبارکہ نازل ہوئی۔ "وانذر عشیر تک الاقربین"۔ ۸ یعنی اور اپنے قریبی عزیزوں و رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ پیغمبر نے قریش کو عمومی اور خصوصی دونوں طریقوں سے خداوندعالم کی طرف دعوت دی۔ پیغمبر نے ارشاد فرمایا "اے قریش والو! خود کو آگ سے بچاؤ کیونکہ تمہارا کوئی بھی فائدہ یا نقصان میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اے کعب بن لوی کی اولاد! خود کو آگ سے نجات دو کیونکہ تمہارا کوئی بھی فائدہ و نقصان، میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اے اولاد عبد المطلب! خود کو آگ سے محفوظ رکھو۔ تمہارا کوئی بھی فائدہ و نقصان میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہؑ! خود کو آگ سے دور رکھو۔ تمہارا کوئی فائدہ و نقصان میرے اختیار میں نہیں ہے۔ ۹

براء بن عازب کہتا ہے کہ جب پیغمبر پر یہ آیۂ مبارکہ نازل ہوئی تو آپ نے عبدالمطلب کی اولاد کو، جن کی تعداد ۴۰ افراد پر مشتمل تھی، ایک دعوت پر مدعو کیا اور حضرت علی علیہ السلام سے فرمائش کی کہ مہمانوں کے کھانے کے لئے دنبہ کی ران اور کاسۂ شیر کا اہتمام کریں۔ اس طرح پیغمبرؐ نے تمام لوگوں کی میزبانی کے فرائض انجام دیئے اور ان لوگوں نے شکم سیر ہو کر کھایا۔

ابولہب نے کہا کہ "یہ اس شخص کا جادو ہے:

پیغمبر نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے دن پھر ان لوگوں کو مدعو کیا اور پہلے کی طرح دوبارہ ان لوگوں کی میزبانی و پذیرائی کی۔ اس کے بعد ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ اے اولاد عبد المطلب! میں خداوندعالم کی طرف سے آیا ہوں تاکہ تم لوگوں کو ان مہلک خطروں سے ڈراؤں اور آگاہ کروں جن سے تم روبرو ہونے والے ہو۔ اسلام قبول کرتے ہوئے میری اطاعت و فرمانبرداری کرو تاکہ تمہیں ہدایت حاصل ہو جائے۔ اس کے بعد فرمایا۔ "تم لوگوں میں سے کوئی میرا بھائی، وزیر، ولی، وصی، جانشین اور میرے دین کو ادا کرنے والا ہو گا۔"؟ حضرت علی بن ابیطالبؑ کے علاوہ تمام لوگ خاموش رہے۔ پیغمبر نے اپنا یہ مطالبہ تین مرتبہ دہرایا۔ اور ہر بار حضرت علیؑ نے کھڑے ہو کر پیغمبر کی

آواز پر لبیک کہا۔ تیسری بار پیغمبر اکرمؐ نے ان سے کہا کہ یا علی! یقیناً تم ہو۔"

پس باقی تمام لوگ چلے گئے۔ جاتے وقت وہ لوگ ابو طالب سے یہ کہتے جا رہے تھے۔"اب تم اپنے بیٹے کی اطاعت کرو جس کو امیر بنا دیا گیا"۔[11]

حکمت و پند نیک کی دعوت:

حکمت اور نیک نصیحت کی طرف دعوت دینا پیغمبر کی تبلیغی راہ و روش کا اٹوٹ حصہ رہا ہے جس کی طرف نہج البلاغہ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ آنحضرت کو اس کام کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید پیغمبر کو حکم دیتے ہوئے کہتا ہے۔ أدع الی سبیل ربك بالحكمة وَالموْعظةِ الحسنة وجادلهم بالّتی هی احسن۔" یعنی مدعو کرو لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت اور پند نیک کے ساتھ اور بہترین چیز سے ان لوگوں کے ساتھ جدال کرو۔"

راغب اصفہانی کا بیان ہے کہ کائنات اور اس کی آفرینش کی مکمل اور باوقت شناخت ہی حکمت خداوندی ہے اور انسان کی حکمت کا مطلب ہے مخلوقات کی شناخت اور نیک کام انجام دینا۔[12]

علامہ طباطبائی کہتے ہیں کہ حکمت کے معنی و مفہوم کے سلسلے میں یہ تعریف پیش کی گئی ہے کہ ایسی دلیل جو حق کی رہنمائی کر دے۔ وہ حق جس میں کوئی کمی نہ ہو اور جس کی تردید بھی ناممکن ہو۔ موعظہ اس کلام کو کہتے ہیں جو دل کو نرم ور قیق بنا دیتا ہے۔ یہ مخاطب کے موقف و مصالح کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے۔ اس کے ذیل میں نیک افراد اور پسندیدہ اعمال و افعال کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ اپنی تبلیغ میں ہر طرح کی حکمت کا استعمال کیا کرتے تھے تاکہ لوگوں کو خداوند عالم کی طرف دعوت دے سکیں۔ وہ کبھی موعظہ حسنہ کے ذریعہ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیا کرتے تھے اور کبھی بحث و مباحثہ کے ذریعہ لوگوں کو دعوت الٰہی کی طرف متوجہ کیا کرتے تھے۔ لیکن وہ کس جگہ پر کونسی راہ و روش اختیار کرتے تھے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ تبلیغ دین کے لئے ہر ممکن راہ و روش کے انتخاب میں ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتے تھے اور بوقت ضرورت وہ ہر ممکن ترکیب و حکمت کا استعمال کیا کرتے تھے۔[13]

نہج البلاغہ میں منقول حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے قول سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ تبلیغ اسی وقت اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتی ہے جب اس کا سر چشمہ علم ہو۔ اس کے علاوہ زمان ومکان اور مخاطب کے حالات وغیرہ تبلیغ کی تاثیر میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں تبلیغ کا تبلیغاتی آلات ووسائل سے ہم آہنگ ہونا بھی بہت موثر ہوا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ تبلیغ کا حکمت اور موعظۂ حسنہ کی بنیاد پر قائم ہونا لازمی ہے اور اس میں جھوٹ و تہمت ہرگز نہ ہونی چاہئے۔ قرآنی مکتب فکر کے بموجب جھوٹ، مکروفریب اور دوگلے پن کا تبلیغ میں قطعی گزر نہیں ہے چاہے اس میں جھوٹی اور ظاہری کامیابی ہی کیوں نہ دکھائی دیتی ہو۔ قرآن جس تبلیغ کی سفارش وہدایت کرتا ہے اس میں جھوٹ اور مکروفریب کا قطعی کوئی گزر نہیں ہے اور ان چیزوں سے قطعی دوری وعلحدگی اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے چاہے اس علیحدگی کی وجہ سے شکست ہی کیوں نہ حاصل ہو جائے۔

پیغمبر اکرمؐ نے اپنی تبلیغی راہ وروش میں جھوٹ اور مکروفریب سے پرہیز کیا۔ بعثت کے ابتدائی دور میں انھیں لوگوں کی حمایت کی سخت ضرورت تھی۔ قبیلۂ بنی عامر کا سردار پیغمبر اکرمؐ کی گفتگو سے غیر معمولی طور پر متاثر تھا۔ چنانچہ ایک روز وہ پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اگر آپ یہ قبول کرلیں کہ آپ کے بعد آپ کی خلافت وجانشینی قبیلہ بنی عامر کے حوالے ہوگی تو ہم لوگ اسلام قبول کرنے کے لیے آمادہ ہیں ہمارے قبیلے میں ہزار بہادر جوان اور مختلف النوع جنگی سازوسامان موجود ہے جو ہم لوگ آپ کے حوالے کردیں گے۔ پیغمبر اکرمؐ نے قبیلہ بنی عامر کے سردار کی یہ تجویز قبول نہیں۔ [۴]

(باقی آئندہ)

حوالے :

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱، ۴۴

۲۔ بہج الصباغۃ، ج ۲، ۱۳۶

۳۔ طبرسی، احتجاج طبرسی، ۲۲

۴۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۲، ۴۶

۵۔ سورہ بقرہ۔ ۲۵۶
۶۔ سورہ بقرہ۔ ۲۳و ۲۴
۷۔ نہج البلاغہ، خطبہ، ۹۵، ۱۴۰
۸۔ شعراء، ۲۱۴۔ طباطبائی۔
۹۔ تفسیر المیزان، ج۱۵، ۳۳۳
۱۰۔ طباطبائی، تفسیر المیزان، ج۱۵، ۳۳۵
۱۱۔ سورہ نحل۔ ۱۲۵
۱۲۔ راغب، مفردات، واژہ حکم
۱۳۔ طباطبائی، تفسیر المیزان، ج۱۵، ۳۷۲
۱۴۔ طبری، تاریخ طبری، ج۳، ۲۱۵

❀❀❀

محترمہ ڈاکٹر صاعقہ مہدی

وحدت اسلامی

عید میلاد باسعادت پیغمبر عظیم الشان کے موقع پر ہندوستان کے مختلف شہروں میں منعقد دینی اجتماعات اور جلسوں وافادیت جیسے اہم اور بنیادی مسائل کے بارے میں تفصیلی تذکرہ کیا گیا۔ برادران اہل سنت کے مطابق ۱۲ ربیع الاوّل اور برادران اہل تشیع کے مطابق ۱۷ ربیع الاوّل حضرت محمد مصطفےٰ کا یوم ولادت ہے۔ امت اسلامیہ عالم کے درمیان وحدت واتحاد کی ضرورت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اسلامی جمہوریہ ایران نے دونوں روایات کے درمیان موجود فاصلے کو ہفتۂ وحدت کے نام سے موسوم کردیا ہے تاکہ اس ہفتہ کے دوران اسلامی معاشرہ کے مختلف شعبوں کے درمیان اتحاد وہم آہنگی کا شاندار مظاہرہ ہوسکے۔ درحقیقت ہفتہ وحدت امت اسلامیہ عالم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا بہترین موقع ہے تاکہ وہ اپنے عدیم الشال اتحاد اوراپنی مثالی وحدت وہم آہنگی کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے جانی اور خونخوار دشمنوں کو لرزہ براندام کرسکیں۔ خداوند عالم نے توحید پرستوں اور ایمان والے لوگوں کو آپس میں تفرقہ وجدائی سے پرہیز اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور ان سے یہ مطالبہ کیا کہ تمام لوگ حکم الٰہی کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے واحد ور ناقابلِ شکست پیکر کی شکل میں برقرار رہیں۔ "واعتصموا بحبل الله جميعاً ولاتفرّقوا۔" اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مومنین پرچم توحید کے سایہ میں باہم متحد رہیں تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت انھیں کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتی۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ امت اسلامیہ اپنے اتحاد کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی عزت وسربلندی کی مخالفت کرنے والی طاقتوں کے ناپاک ارادوں کو ناکام بناسکتی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ " الجماعة خيرو والفرقة عذاب ۱" یعنی اجتماع وہم آہنگی خیر وبرکت اور نیکی کا سرمایہ ہے اور تفرقہ وعلیحدگی مصائب وعذاب کا باعث۔ مسلمانوں کے درمیان اتحاد واتفاق نہ صرف اس دنیا میں ان کی عظمت وطاقت کا باعث ہے بلکہ اس کی وجہ سے انھیں

آخرت میں بھی سعادت وسربلندی حاصل ہوگی جیسا کہ رسول مقبول کاارشاد گرامی ہے" من سرہ ان لیکن بحبوبة الجنة فليلزم الجماعة" جو شخص دوست رکھتا ہے اس کا محل سکونت قلب بہشت ہے۔

جی ہاں !اگر مومنین باہمی اختلافات وتفرقہ سے علیحدگی اور کنارہ کشی اختیار کرلیں اور خوشنودی پروردگار کی خاطر باہم متحد ہوجائیں اور ناقابل شکست صف واحد کی شکل اختیار کرلیں تو انھیں کفروالحاد اور ظلم وستم کے امنڈتے ہوئے سیلاب وطوفان پر غلبہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی اور دنیا کا بڑے سے بڑا طوفان بھی ان کی وحدت کے شجر طیبہ کو اکھاڑ نہ سکے گا کیونکہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ و اختلاف پیدا کرنا اسلام دشمن طاقتوں کی سازشانہ روش کا ایک اہم جز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے اقتدار کی نابودی کے لئے وہ اس امت واحد کو چھوٹے چھوٹے گروہوں اور ٹکڑوں میں تبدیل کردینا چاہتی ہیں کیونکہ انھیں اپنے ناجائز مقاصد میں کامیابی اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب یہ مسلمان بھائیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ اور لاپرواہ کردیں اور امت اسلامیہ کے درمیان روشن چراغ وحدت وہم آہنگی کو بجھادیں۔ آج اسلامی جمہوریہ ایران ان معدودے چند ملکوں میں سے ایک ہے جو اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد سے داخلی اور خارجی سطح پر مسلمانوں کے درمیان وحدت واتحاد پیدا کرنے کی کوشش میں سرگرم ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اسی وحدت واتحاد کے سایہ میں اسلامی انقلاب نے عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے۔ عوام اور ان کے مقاصد کے درمیان اتحاد اور وحدت قیادت ورہبری انقلاب اسلامی ایران کو دنیا کے دیگر انقلابات کے درمیان نمایاں اور امتیازی حیثیت عطا کرتی ہے۔

انقلاب اسلامی ایران کے قائد وبانی حضرت امام خمینیؒ نے ہمیشہ صرف ایرانی عوام کو ہی نہیں بلکہ پوری امت اسلامیہ کو باہمی اتحاد اور ہم آہنگی کی طرف دعوت دی تھی۔ جب عوام کی مذہبی سوجھ بوجھ میں کچھ اضافہ ہوتا ہے تو وہ خود ایسے امور سے پرہیز کرنے لگتے ہیں جو آپسی اختلاف کا باعث بن سکتے ہیں۔ چنانچہ آج حکومت ایران کے تمام افسران منادی وحدت واتحاد حضرت رسول اکرمؐ کے ارشادات کی پیروی کرتے ہوئے عوام کے درمیان وحدت واتحاد کی حفاظت میں ہمہ تن سرگرم ہیں

اور ہمہ وقت اتحاد بین المسلمین کی مخالفت کرنے والی طاقتوں کو بے نقاب کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔اسلامی انقلاب اور جمہوری اسلامی ایران کے قائد عظیم الشان آیت اللہ العظمٰی سید علی خامنہ ای نے اپنی تقریر میں تفرقہ انگیز اسلام دشمن طاقتوں کے منہ پر بھرپور طمانچہ رسید کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ "یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام اور توحید کے نام پر اسلامی معاشرہ کو ایک دوسرے سے الگ کر رہے ہیں۔ان حالات میں پوری امت اسلامیہ عالم کو اپنے فریضے پر عمل کرنا چاہئے ورنہ تفرقہ انگیز عناصر اسلامی معاشرہ کے وجود کو زبردست خطرے سے دوچار کر دیں گے۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر واحسان کہ اسلامی جمہوریہ ایران کلام الٰہی پر ایمان واعتقاد کے سہارے اور الٰہی احکام وارشادات رسول مقبولؐ کی پیروی کرتے ہوئے امام خمینیؒ جیسے باشعور قائد کی قیادت میں وحدت واتحاد دشمن طاقتوں کے خلاف ایک مظبوط پہاڑ کی طرح اپنے موقف پر ثابت قدم ہے اور امت اسلامیہ والم کو وحدت واتحاد کی طرف دعوت دے رہا ہے اور اسلام دشمن تفرقہ انگیز بناز شوں کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔

اسلامی انقلاب کی عظیم الشان کامیابی کے بعد ابتدائی آٹھ برس کے دوران ایران ایسے خطرناک مسائل وحوادث کا شکار رہا ہے کہ ان میں سے ہر حادثہ ایک حکومت کی نابودی کے لیے کافی تھا۔فوجی بغاوت،انقلاب دشمن جماعتوں کی مسلحانہ سرگرمیاں، مہلک بم کے دھماکے، مشرقی ومغربی ذرائع ابلاغ کے بے بنیاد پروپگنڈے، عراق کی جانب سے مسلط کردہ تباہ کن جنگ کا بوجھ اور خلیج فارس میں ایران پر امریکہ اور اس کے ساتھیوں کی جانب سے کئے جانے والے اقتصادی اور فوجی حملے وغیرہ ایسے حوادث ہیں جن کو برداشت کرنا آسان نہیں تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک متحد اور اسلامی اخوت سے مالا مال قوم کو اتنی آسانی سے نابود کیا جاسکتا ہے؟ایرانی عوام کے درمیان مثالی اتحاد اور اسلامی احکام کی پیروی کرنے والے باشعور قائد کی قیادت میں دشمنان دین کے خلاف جنگ ونبرد آزمائی کا حوصلہ ایرانی عوام کو دشمن کے خوف سے لاپرواہ بنائے ہوئے ہے اور وہ اسلامی عزم وحوصلے کے ساتھ دشمن کا بھرپور مقابلہ کرتے چلے آرہے ہیں:

دنیا کی بڑی طاقتوں کی یہ خواہش رہی ہے کہ اسلامی ممالک کے درمیان اختلاف پیدا کردیں

اور ان کے درمیان لڑائی کا تماشہ دیکھتی رہیں لیکن اسلامی جمہوریہ ایران نے ان کی پرانی سیاست " اختلاف پیدا کرو اور حکومت کرو" کی بساط الٹ دی ہے اور جنگ کے بھاری بھرکم بوجھ کے باوجود بھی ان کے سامنے دست سوال نہیں دراز کیا ہے۔ ایران کا اعتقاد ہے کہ اگر ہمارے درمیان کوئی اختلاف بھی ہے تو ان اختلافات کو دور کرنے کے لیے خود مسلمانوں کو کوشش کرنی چاہئے اس سلسلے میں بیرونی ممالک سے مدد و حمایت کے مطالبے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ بیرونی ممالک ہمارے علاقے پر ہمیشہ سے اپنی لالچ بھری نگاہیں لگائے ہوئے ہیں۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے فوراً بعد ایران پر ایک تباہ کن اور طویل المدت جنگ کے مسلط کرنے کا بنیادی مقصد عرب و عجم کے دیرینہ اختلافات سے ناجائز فائدہ حاصل کرنا تھا۔

پہلے مرحلے میں امریکہ کو یہ امید تھی کہ وہ اپنے سیاسی ہتھکنڈوں کے ذریعہ اسلامی جمہوری ایران کو وہائٹ ہاؤس کے سامنے سر تسلیم خم کردینے کے لیے مجبور کردے گا لیکن امریکی حکمت عملی کے مقابلے میں اسلامی جمہوریۂ ایران کی سیاسی سرگرمی کو کامیابی حاصل ہوگئی اور وہائٹ ہاؤس کے ماہرین سیاست حیران رہ گئے اور ان کی مسلسل کوشش کا کوئی فائدہ نہ نکل سکا۔ اسلحوں کی سپلائی کے ذریعہ ایران اور امریکہ کے درمیان خوشگوار دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس سلسلے میں امریکہ اپنی شرمناک سیاست سے باز نہیں آیا اور اسلحہ فروشی کی سازشی پیش کشی میں خفیہ طور پر اسرائیل کو بھی شامل کئے رہا تاکہ وہ اسلامہ جمہوریۂ ایران کے دامن کو داغدار بنا سکے لیکن توفیق خداوندی شامل حال رہی اور مناسب موقع ہاتھ آتے ہی حجۃ الاسلام رفسنجانی نے اس امریکی سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ (ان کیدالشیطان کان ضعیفا)

دوسرے مرحلے میں امریکہ کا منصوبہ یہ تھا کہ سلامتی کاؤنسل کے ذریعہ ایران کی بین الاقوامی اقتصادی اور فوجی ناکہ بندی کی جائے لیکن اس سلسلے میں اسلامی جمہوریہ ایران کی سیاسی سرگرمی اور اقوام متحدہ میں صدر جمہوریہ ایران کی تقریر نے امریکی پلاننگ کی راہ میں بڑی رکاوٹ کھڑی کردی لہذا مسلط کردہ جنگ کے سلسلے میں وہ اپنے دوسرے مرحلے کی پلاننگ کو کامیاب نہ بنا سکا یہ امریکی حکمراں یہ سمجھتے تھے کہ خلیج فارس میں امریکی فوجی نقل و حرکت کی وجہ سے اسلامی جمہوریۂ ایران

خوفزدہ ہو کر اپنے موقف کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ لیکن اسلامی جمہوریہ ایران نے حکم الٰہی وہدایت قرآنی "اعتدوا بمثل مااعتدی علیکم" کے بموجب امریکہ کے خلاف مقابلہ بمثل کی سیاست اختیار کرلی اور امریکی حملوں کا منہ توڑ جواب دینا شروع کردیا اور یہ طے کرلیا کہ امریکہ کے ہر حملے کا منہ توڑ جواب دینا لازمی ہے۔ اور ایران آج بھی اپنی اس سیاست پر پوری طرح کاربند ہے۔

۱۱ ستمبر کو امریکہ میں رونما ہونے والے المناک حوادث کے بعد امریکی حکمرانوں نے کسی ثبوت اور دلیل کے بغیر اسامہ بن لادن کو اس جرم کا مجرم اعلان کردیا اور اسامہ کی تلاش کے بہانے سرزمین افغانستان پر ایسی خوفناک بمباری شروع کردی جس کی مثال تاریخ کے صفحات میں بھی نظر نہیں آتی۔ دنیا میں عدل وانصاف کی حفاظت کا دم بھرنے والے کتنے بڑے بڑے ادارے موجود ہیں لیکن کسی ادارے سے یہ آواز بلند نہ ہوئی کہ آخر اس وحشیانہ بمباری کے دوران ہلاک ہونے والے بے گناہ افغانی مسلمانوں نے کیا جرم کیا ہے کہ ان کو خاک وخون میں غلطاں کیا جارہا ہے۔ بہر حال نہایت ظالمانہ اور بے شرمانہ انداز میں افغانی مسلمانوں پر بمباری کا سلسلہ جاری رہا اور پوری دنیا خاموش تماشائی بنی رہی۔ افغانستان کے ساتھ ہی ساتھ عراقی علاقوں پر بھی امریکی بمباری کا سلسلہ چلتا رہا لیکن عالمی فضا میں کہیں سے بھی احتجاج کی کوئی آواز سنائی نہ دی۔ درحقیقت اس بمباری کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی نابودی مقصود تھی۔ اپنے اس شرمناک مقصد میں کامیابی کی خاطر اس نے ملت اسلامیہ عالم کو مرعوب کرنے کے لئے طرح طرح کی دھمکیاں دینا شروع کردیا۔

عالمی سطح پر یہ ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کی گئی کہ اسلام تو دہشت گردی کا مذہب ہے اور دنیا کے سارے مسلمان دہشت گرد ہیں کہیں اور نہیں بلکہ افغانستان کے مرکزی شہر کابل کے چوراہے پر مسلمانوں کی ریش تراشی اور برقعے سوزی کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا۔ تاکہ دنیا والوں کو یہ باور کراسکیں کہ اسلام خدانخواستہ ایسا خراب مذہب ہے کہ خود اس کی پیروی کرنے والے اس سے بیزار ہیں۔

جی ہاں! ذرا غور فکر سے کام لیجئے اور دشمن کی اس فریب کاری کا بغور مطالعہ کیجئے۔ اگر دنیا کے تمام مسلمانوں اور اسلامی ملکوں کے درمیان وحدت واتحاد کی نعمت موجود ہوتی تو آج عراق وافغانستان کے بے گناہوں کو بمباری کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ یہ باہمی تفرقہ واختلاف کا نتیجہ ہے کہ آج امت اسلامیہ

عالمی سطح پر مصائب و آلام کا شکار ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی پیروی کرتے ہوئے مسلمانوں کے درمیان اسلامی وحدت کی تشکیل کی بھرپور کوشش کی جائے۔ اور اپنے اعمال و افعال سے پوری دنیا پر یہ واضح کردیا جائے کہ اسلام دہشت گردی کا نہیں بلکہ امن و سلامتی کا مذہب ہے جو کسی پر حملہ و تجاوز کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے سر جھکانے سے روکتا ہے لیکن اللہ کی خوشنودی کی خاطر مٹی پر سر رکھدینے کو انسانیت کی معراج قرار دیتا ہے۔ غیر اسلامی دنیا اگر مسلمان رہنماؤں کے ارشادات کی طرف توجہ نہ کرے تو یہ فطری امر ہے لیکن مسلمانوں کو تو بہر حال اپنے رہنماؤں کے زرین اقوال وارشادات یاد رکھنا چاہئے۔ کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ اسلامی انقلاب کے قائد عظیم الشان آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے صدر جمہوریہ ایران کی حیثیت سے اقوام متحدہ جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کیا خوب ارشاد فرمایا تھا کہ "اس میں شک نہیں کہ صلح ایک خوبصورت اور دلکش کلمہ ہے لیکن عدالت وانصاف صلح سے زیادہ اہم اور بلند ہے اور ایسا کلمہ ہے جس سے دنیا کے طاقتور ظالم و حملہ آور طبقے کے لوگ ہمیشہ سے کتراتے چلے آرہے ہیں۔ بہر حال ایران صلح و سلامتی اور انسانی دوستی کا خواہاں اور طرفدار ہے لیکن صلح کی آڑ میں کسی مکر و فریب کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ اگر مسلمانوں کے درمیان حقیقی اسلامی اتحاد قائم ہو جائے تو یہ ثابت کرنا قطعی دشوار نہ ہوگا کہ اسلام دہشت گردی کا سخت مخالف رہا ہے اس نے دہشت گردی کے ہاتھوں بھاری نقصانات اٹھائے ہیں لیکن دہشت گردی کی حمایت نہیں کی اور آج بھی اگر دہشت گردی کا مقابلہ کرنا ہے تو بہر حال اسلام اور اسلامی تعلیمات کے ذریعہ اس کا بھرپور مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

حوالے:

۱۔ نہج البلاغہ حدیث۔ ۱۲۰۲

۲۔ نہج الفصاحہ حدیث۔ ۲۸۲۶